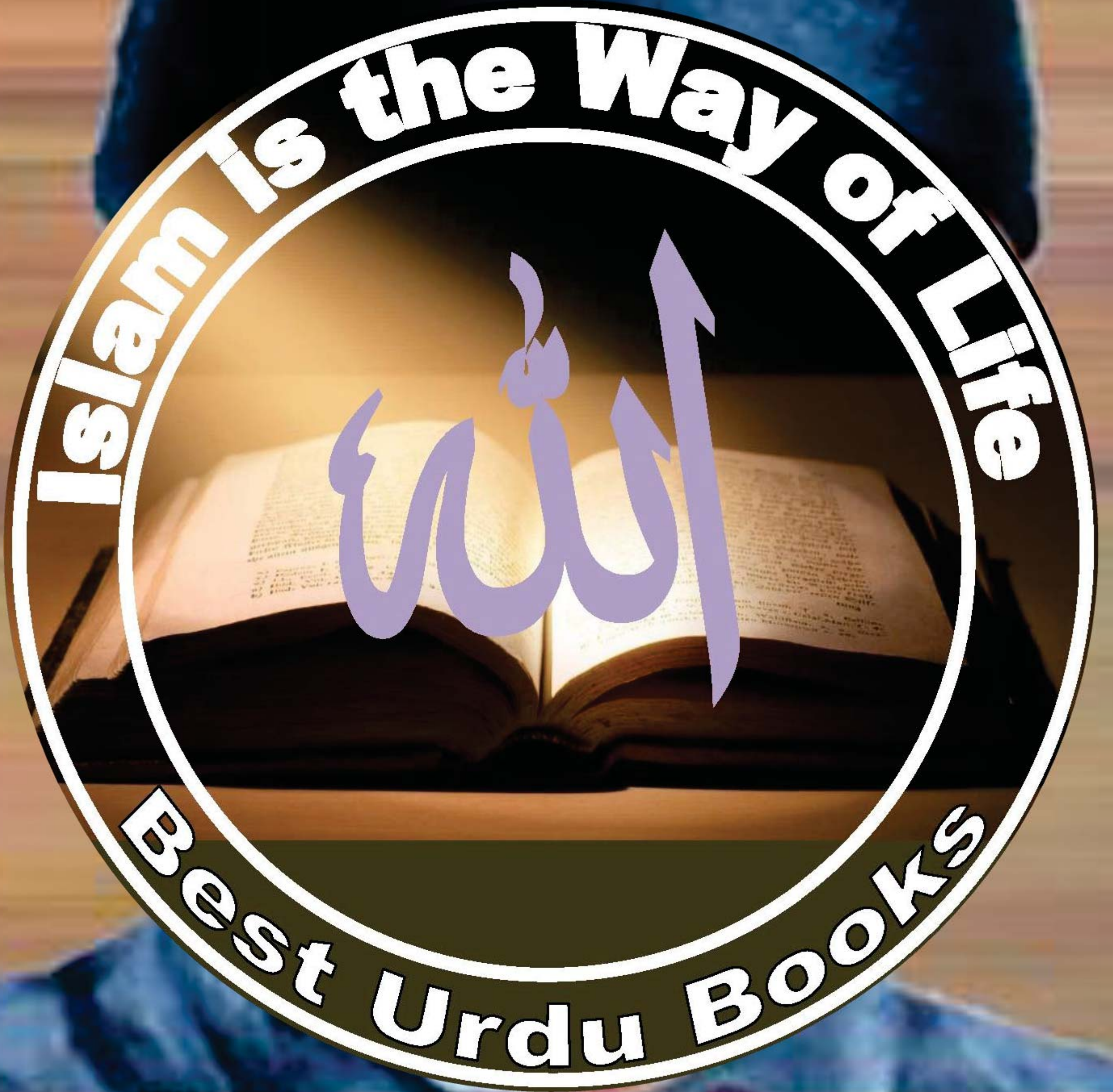
خطباتِ آزاد



مولانا ابوالکلام آزاد

خطباتِ آزاد

مولانا ابوالکلام آزاد

ارشد بُک سیلرز

علّامہ اقبال روڈ : میرپور آزاد کشمیر

خطبات آزاد

مولانا ابوالکلام آزاد

دیگر کتب:

آزادی ہند — تحریک آزادی — تذکرہ — غبار خاطر

اُم الکتاب — مسلمان عورت — خطوط ابوالکلام آزاد

خطبات ابوالکلام آزاد — خودنوشت ابوالکلام آزاد

انسانیت موت کے دروازے پر — اسلام اور جمہوریت

ناشر ——— ارشد محمود

اہتمام ——— ارشد الاسلام

مطبع ——— زاہد بشیر پرنٹرز، لاہور

قیمت ——— -/400 روپے

ارشد بک سیلرز

علامہ اقبال روڈ، میرپور، آزاد کشمیر۔

فون: 4267 - 2327

فہرست

حرف اول

گردوپیش کا مشاہدہ اور مطالعہ کرنے کے بعد برآمد شدہ نتائج سے دوسروں کو آگاہ کرنا ابتدا میں ایک لاشعوری عمل تھا جس کا سفر ایک حیرت سے شروع ہو کر دوسری پر ختم ہو جاتا تھا۔ لیکن بعد ازاں جب انسان نے جملہ خارجی مظاہر سے اپنے تعلق اور اس تعلق کے تقاضوں کے مطابق اپنے اعمال و افعال کی نوعیت اور ان کے وقوع پذیر ہونے کو سمجھنے کے لئے منطقی انداز فکر اختیار کیا تو اس پر بخوبی واضح ہو گیا کہ اس کے کون سے افعال حالات سے تطابق رکھتے ہیں اور کون سے متضاد۔ اب خارجی ماحول سے متصادم انسانی رویوں کا تحسینی اظہار مکمل طور پر شعوری عمل کے سانچے میں ڈھل گیا جس کے نتیجے میں مختلف انسانی طبقات پر یہ عقدہ کھلا کہ کون سا عمل ان کے بقا کے لئے مضرت رساں ہے اور کون سا فعل ان کے داخل اور خارج میں مطابقت پیدا کر کے ماحول میں ان کی طویل المدت بقاء کا ضامن بن سکتا ہے۔

یہ سب کچھ عمیق مشاہدہ کرنے کی اہل آنکھوں نے دیکھا' جھنجوڑنے کی قوت سے معمور ہاتھوں نے ٹٹولا' مطالعاتی قوت سے سرفراز طبائع نے سمجھا' تجزیاتی میلان کی حامل ہستیوں نے پرکھا اور تدبر و تفکر کی غیر معمولی صلاحیت رکھنے والے اذہان نے سوچا۔ انسانیت کے ان محسنوں نے افراد کو درست لائحہ عمل کے تعین کے مواقع فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ نافع اور مضر انسانی رویوں کے تحسینی اور مذمتی اظہار کی بطور فن تشکیل میں بھی نمایاں کردار ادا کیا۔

بلاشبہ ہندوستان کے نامور مفکر' عالم' ادیب اور مقرر مولانا ابوالکلام آزاد بھی ان

ہستیوں میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے انسان کو عمل کی درست راہ گزر سے آشنا کیا۔ ان کی شخصیت اس قدر پہلودار ہے کہ مذہب سے طب' فلسفہ سے ادب اور سیاست سے صحافت تک ہر شعبہ میں نمایاں نظر آتی ہے۔ مولانا تحریر میں بے مثل ہونے کے ساتھ ساتھ تقریر میں بھی لاثانی تھے۔ ان کے خطبات روانی' ادائے مفہوم' ابلاغ' استدلال' اور مثبت طرز فکر کی خصوصیات کے حامل ہیں۔ زیر نظر کتاب "خطبات آزاد" مولانا ابوالکلام آزاد کے ان خطبات پر مشتمل ہے جو 1914ء سے 1948ء تک کے عرصہ میں انہوں نے مختلف اجتماعات میں دیئے۔ فی البدیہہ تقریر کو تحریر کا جامہ پہنایا جائے تو عموماً" زبان و بیان کی پابندیوں سے تجاوز کر جاتی ہے لیکن اس امر کا سہرا مولانا آزاد کی علمی استعداد اور اخاذ طبع کے سر ہے کہ ان کی زبان سے بے ساختہ ادا ہونے والے لفاظ صفحات کے سینے پر اتر کر زیادہ مفید اور بامعنی ہوگئے ہیں۔ اس کتاب کی اشاعت مولانا کے سیاسی' مذہبی اور سماجی نقطہ نظر کے علام تک ابلاغ کا ذریعہ ثابت ہونے کے ساتھ ساتھ امت مسلمہ کے بنیادی تشخص کی بحالی میں ان کے فعال کردار کو بھی واضح کرے گی۔

نعیم احسن

اپریل 99ء

مقدمہ

خطابت دنیا کا سب سے قدیم ذریعہ ابلاغ ہے۔ ظاہر ہے کہ لکھنے کا فن ابھی ایجاد ہی نہیں ہوا تھا۔ لہٰذا اگر کبھی قبیلوں کے درمیان لڑائی کی صورت پیدا ہو جاتی' تو لازما ایک قبیلے کے سردار یا شیخ کو اپنے خاندان کے افراد یا اور لوگوں کو دوسرے قبیلے کے خلاف ابھارنے اور جنگ پر آمادہ کرنے کے لیے' ان سے خطاب کی ضرورت پیش آئی ہوگی۔ اسلامی عقیدہ ہے کہ دنیا میں ایک لاکھ چوبیس ہزار نبی مبعوث ہوئے۔ تمام قوموں میں بزرگان دین کے نام بھی ملتے ہیں۔ ان قابل احترام ہستیوں کا مقصد حیات اس کے سوائے کچھ اور نہیں تھا کہ وہ گم کردہ راہ بنی نوع انسان کو صراط مستقیم کی طرف بلائیں۔ یقینا انہوں نے بھی رشد و ہدایت کی تلقین خطاب ہی کے ذریعے سے کی ہوگی۔ غرض قبیلے کا سردار رہا ہو یا کوئی رشی' منی اور نبی' اس کی کامیابی اس پر منحصر تھی کہ وہ کس حد تک اپنے سامعین یا مخاطبوں کو اپنے نقطہ نظر کے صحیح ہونے کا یقین دلا سکتا ہے' اور انہیں امن اور ہدایت کی راہ پر لگا سکتا ہے۔ اس طرف بہت کم لوگوں کا خیال گیا ہوگا کہ تمام مذاہب کی الہامی کتابیں خطبات سے بھری ہوئی ہیں لیکن اس پر کسی کو تعجب نہیں ہونا چاہیے۔ ان کتابوں کے اولین مخاطبوں میں تعلیم یافتہ آدمی بہت کم تھے' صرف گنتی کے چند لوگ پڑھ لکھ سکتے تھے۔ لازماً نبی کو اپنا پیغام لوگوں تک زبانی گفتگو سے پہنچانا پڑا۔ جب افہام و تفہیم کا موضوع مشکل یا وضاحت طلب رہا ہوگا' یا اس سے متعلق ان کی قوم میں پہلے سے مخالفت اور مقابلے کا جذبہ موجود تھا' انہیں دلائل سے کام لینا پڑا اور مناظرانہ رویہ اختیار کر کے ان کے معتقدات کی تردید اور تغلیط کرنا پڑی۔ یہی باعث ہے کہ ان بنیادی کتابوں میں خطبات کی بھرمار

ہے۔ ان سے جہاں صاحب کتاب کی فصاحت و بلاغت کا ثبوت ملتا ہے' وہیں ہمیں اس زمانے کی خطابت کے نمونے بھی مہیا ہو گئے ہیں۔

اس سے معلوم ہو گا کہ خطیب کا اولین مقصد یہ ہے کہ وہ سامعین کو اپنا ہم خیال بنائے' یا انہیں کسی رائے یا تجویز پر متفق کرے۔ یہ کام آسان نہیں ہے۔ اس میں کامیابی کے لیے کئی چیزوں کی ضرورت ہے۔ موضوع ایسا ہونا چاہیے کہ لوگ اس کی اہمیت کے قائل ہوں اور کسی نہ کسی درجے میں اسے اپنی زندگی یا مقاصد کے لیے ضروری خیال کریں۔ خطیب کے لیے ضروری ہے کہ وہ خود موضوع کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہو۔ اس کے مُوافق آراء پیش کر سکے اور مخالف دلائل کو رد کر سکے۔ اس کے اپنے خیالات میں کسی قسم کی پراگندگی یا تذبذب نہیں ہونا چاہیے۔ بیشک' بعض اوقات طول کلامی ناگزیر ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر وہ اس سے اجتناب کر سکے اور اپنے مافی الضمیر کو نپے تلے الفاظ میں' لگی لپٹی رکھے بغیر' مدلل طریقے پر' سامعین کے سامنے رکھ سکے' تو اس کا اثر کہیں زیادہ ہو گا' بہ نسبت اس کے کہ وہ غیرواضح طور پر اکتا دینے کی حد تک بولتا چلاجائے۔ اگر اسے اپنے موضوع کی صداقت پر یقین ہے' اگر اسے اس کے لیے موزوں الفاظ کے انتخاب میں' اور برجستہ اور موثر طریقے سے پیش کرنے میں' مہارت حاصل ہے' اگر وہ اپنی تقریر کو اس حد تک اصلیت کا رنگ دے سکتا ہے کہ سامع اسے سن کر ایسا محسوس کرنے لگے کہ گویا وہ خود اس کے دل کی بات کہہ رہا ہے' تو اس کی تقریر کی کامیابی میں کوئی چیز حائل نہیں ہو سکتی۔

مولانا ابوالکلام آزاد کو قدرت کی طرف سے وہ تمام صفات اور صلاحتیں وافر مقدار میں ملی تھیں' جو کامیاب خطیب بننے کے لیے درکار ہیں' عالی نسبتی ایسی کہ صدیوں سے ان کا خاندان زہد و ورع اور رشد و ہدایت کا مرکز رہا تھا' ان کے والد مولانا خیرالدین مشائخ کے حلقوں میں معروف اور ممتاز تھے' مولانا آزاد خود ذاتی وجاہت اور مردانہ حسن کا نمونہ تھے' ان کے علم و فضل اور عربی و فارسی پر قدرت کے سب معترف ہیں' طلاقت زبان اور قوت بیان کے ساتھ انہیں بے مثال حافظہ کی نعمت بھی حاصل تھی اور یہی چیزیں کامیاب اور موثر خطابت کے اجزائے ترکیبی ہیں۔

مولانا خیرالدین کے مریدوں کا حلقہ خاصا وسیع تھا' جن کی تعلیم و تربیت کے لیے انہیں اکثر ان سے خطاب کرنا پڑتا تھا' نیز وہ کلکتے کی جامع مسجد (مسجد ناخدا) میں بھی اکثر جمعے کی نماز سے پہلے حاضرین کے سامنے وعظ کہا کرتے تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے سامنے یہ مثالیں ان کی کم سنی کے زمانے سے آتی رہیں۔ ممکن نہیں تھا کہ ان پر اس صورت حال کا اثر نہ ہوتا' اور ان کی افتاد طبیعت اس کے تتبع کی کوشش نہ کرتی۔ چنانچہ ہمارے پاس اس کی شہادت موجود ہے کہ وہ بچپن ہی سے تقریر کرنے اور مقرر بننے کے خواب دیکھنے لگے تھے۔ ان کی بڑی بہن فاطمہ بیگم فرماتی ہیں:

> بچپن میں بھائی کو ان کھیلوں کا شوق نہیں تھا جو اکثر بچے کھیلا کرتے ہیں۔ ان کے کھیل سات آٹھ سال کی عمر میں عجیب انداز کے ہوا کرتے تھے۔ مثلاً کبھی وہ گھر کے تمام صندوقوں اور بکسوں کو ایک لائن میں رکھ کر کہتے تھے کہ یہ ریل گاڑی ہے۔ پھر والد کی پگڑی سر پر باندھ کر بیٹھ جاتے تھے اور ہم بہنوں سے کہتے تھے کہ تم لوگ چلا چلا کر کہو: ہٹو' ہٹو' راستہ دو' دلی کے مولانا آرہے ہیں۔ ہم لوگ اس پر کہتے تھے کہ بھائی' یہاں تو کوئی آدمی نہیں ہے' ہم کس کو دھکا دیں اور کہیں کہ راستہ دو۔ اس پر وہ کہتے تھے کہ یہ تو کھیل ہے' تم سمجھو کہ بہت لوگ مجھ کو لینے اسٹیشن پر آئے ہیں۔
>
> پھر بھائی صندوقوں پر سے اترتے تھے اور بہت آہستہ آہستہ قدم اٹھا کر چلتے تھے' جیسے کہ بڑی عمر کے لوگ چلتے ہیں۔ کبھی وہ گھر میں کسی اونچی چیز پر کھڑے ہو جاتے تھے اور سب بہنوں کو آس پاس کھڑا کر کے کہتے تھے کہ تم لوگ تالیاں بجاؤ اور سمجھو کہ ہزاروں آدمی میرے چاروں طرف کھڑے ہیں اور میں تقریر کر رہا ہوں اور لوگ میری تقریر سن کر تالیاں بجا رہے ہیں۔ میں کہتی تھی کہ بھائی' سوائے ہم دو چار کے یہاں اور کوئی نہیں ہے' ہم

کیسے سمجھیں کہ ہزاروں آدمی یہاں کھڑے ہیں۔ اس پر وہ کہتے تھے کہ یہ تو کھیل ہے' کھیل میں ایسا ہی ہوتا ہے۔

(آجکل (ستمبر 1959ء) : 14-15)

پنجابی زبان کی مثل ہے: پوت' کپوت کے پاؤں پالنے ہی سے معلوم ہونے لگتے ہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اس کے بچپن ہی میں معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ آگے چل کر کیا بننے والا ہے۔ مولانا آزاد اپنے ماحول سے متاثر ہو کر کمسنی ہی سے تحریر و تقریر پر توجہ کرنے لگے تھے۔ وہ دس برس کی عمر سے نظم و نثر لکھنے لگے اور ان کی تحریریں کلکتے اور دوسری جگہوں کے رسائل و جرائد میں چھپنے لگی تھیں لیکن وہ اس سے مطمئن نہیں تھے' وہ اپنا ذاتی ذریعہ اشاعت چاہتے تھے۔ چنانچہ ان کی عمر بمشکل 11' 12 برس کی ہوگی کہ 1899ء میں انھوں نے "نیرنگ عالم" کے نام سے ایک گلدستہ شائع کرنا شروع کیا۔ اس کے غالباً آٹھ شمارے نکلے۔ بہرحال سال کے اندر اندر یہ بند ہوگیا۔ اس کے چار پانچ برس بعد 1903ء میں انھوں نے مشہور ماہنامہ "لسان الصدق" جاری کیا۔ اس کی شہرت دور دور تک پہنچی اور اس کے مضامین کی سنجیدگی اور بلند پایگی کے پیش نظر بیشتر لوگوں نے خیال کیا کہ رسالے کا ایڈیٹر کوئی بزرگ اور معمر عالم ہے۔ انجمن حمایت اسلام' لاہور اپنے سالانہ اجلاس میں ملک کے مختلف حصوں سے اہل علم و فضل کو تقریر کرنے کی دعوت دیا کرتی تھی۔ "لسان الصدق" کی تحریروں کے بلند معیار اور خطیبانہ انداز کو دیکھ کر انجمن کے اصحاب مجاز نے رسالے کے ایڈیٹر مولانا ابوالکلام آزاد کو اپنے اجلاس اپریل 1904ء کو خطاب کرنے کی دعوت دی۔ اس وقت ان کی عمر یہی 15' 16 کی رہی ہوگی۔ ممکن ہے' داعی حضرات کو انہیں دیکھ کر ان کی کم عمری سے کچھ مایوسی ہوئی ہو' لیکن ان کی تقریر سے یقیناً وہ مایوس نہیں ہوئے کیونکہ اس سے اگلے دن ان سے پھر تقریر کرنے کی درخواست کی گئی تھی۔

یہ وہ دور ہے' جب ہندوستان نے بعض مشہور خطیب و مقرر پیدا کیے۔ ان میں سے بیشتر انگریزی میں بولنے والے تھے اور مولانا ابوالکلام آزاد انگریزی سے نابلد تھے۔ بعد کے زمانے میں انھوں نے اس زبان سے کام کاج اور مطالعے کی حد تک کے لیے

خاصی واقفیت پیدا کرلی تھی، لیکن انھیں اس میں بات چیت کرنے میں ہمیشہ تکلف رہا کیونکہ وہ اپنے تلفظ سے مطمئن نہیں تھے۔ بہرحال ان کا انگریزی میں تقریر نہ کرنا کسی طرح ان کے لیے نقصان کا باعث نہیں ہوا، نہ کسی کو اس سے انھیں کامیاب اور عظیم مقرر تسلیم کرنے میں تامل ہوا۔

ان کے خطبات کی اس پہلی جلد میں آپ کو ان کی بعض مشہور اور نمائندہ تقریریں ملیں گی۔ ان سے جہاں ان کے مطالعے اور نظر کی وسعت، اپنے مفہوم کو موزوں ترین الفاظ میں بیان کرنے کی قدرت، مفکرانہ طریقہ استدلال اور اپنے موقف کی صداقت اور صحت پر اعتماد کامل سطر سطر سے ظاہر ہے، وہیں آپ دیکھیں گے کہ وہ اپنے سامعین کے مطابق زبان بھی بدل لیتے ہیں۔ مثلاً جمعیتہ العلماء ہند اور خلافت کانفرنس کے خطبات کے مقابلے میں آپ کانگریس کا خطبہ دیکھیے یا تعلیمی کانفرنس کا خطبہ ملاحظہ کیجئے چونکہ پہلے دونوں خطبوں کے مخاطب اہل علم مسلمان حضرات تھے، اس لیے ان کی زبان اور مسائل کی تفہیم کے لیے دلائل بھی انھیں کے معیار اور مذاق کے مطابق ہیں، زبان بھی نسبتاً مشکل ہے۔ دوسرے خطبوں کے مخاطب، ظاہر ہے کہ مخلوط رہے ہونگے، یہاں زبان بہت آسان ہے، جس کے سمجھنے میں کسی کو مشکل پیش نہیں آسکتی، لیکن ایک بات سب میں قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہے: یہ ہے ان کا مصلحانہ اور معلمانہ انداز خطاب۔ ان کا مقصود یہ معلوم ہوتا ہے کہ سامع ان کی بات سمجھ جائے، پوری پوری سمجھ جائے اور اسے اس پر عمل کرنے میں کوئی تامل یا جھجک محسوس نہ ہو۔ اسی لیے وہ ایک ہی بات کو مختلف طریقوں سے بار بار کہنے یا دہرانے سے دریغ نہیں کرتے۔

دیکھا گیا ہے کہ بعض حضرات کی وہ تقریریں جنھوں نے سامعین پر فوری اثر کیا تھا جب بعد کو کاغذ پر منتقل ہوئیں، اور لوگوں نے انھیں اپنے کانوں سنا نہیں، بلکہ آنکھوں سے پڑھا، تو ان پر کچھ اثر نہیں ہوا۔ بعض وقتی مسائل کی تقریروں سے قطع نظر، مولانا آزاد کی بیشتر تقریروں کی یہ بھی نمایاں خصوصیت ہے کہ وہ اتنے لمبے عرصے کے بعد چھاپے میں بھی اتنی ہی موثر اور کامیاب ہیں، جتنی وہ اس وقت تھیں، جب وہ

اپنے سامنے بیٹھے سامعین کو خطاب کر رہے تھے' یہ معمولی بات نہیں ہے۔

نئی دلی

مالک رام

یکم فروری 1974ء

1

اتحاد اسلامی

کلکتہ' 27 اکتوبر 1914ء

ترجمہ: یا اللہ' اے سلطنت کے مالک! تو سلطنت دیتا ہے' جسے چاہتا ہے' اور سلطنت چھین لیتا ہے' جس سے چاہتا ہے۔ اور عزت بخشتا ہے' جسے چاہتا ہے' اور ذلیل بنا دیتا ہے' جسے چاہتا ہے' تیرے ہی ہاتھ میں سب خوبی ہے' بیشک تو ہر چیز پر قادر ہے۔ (1)میں مردود شیطان سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں۔ (2) اے لوگو! تم اللہ کے محتاج ہو اور وہ سب تعریفوں کے لائق بے نیاز ہے۔ اگر وہ چاہے' تو تمہیں مٹا دے اور (تمہاری جگہ) ایک نئی خلقت لے آئے' اور یہ بات اللہ کے لئے کچھ مشکل نہیں۔ (3)

تحقیق حال ما ز نگہ میستوان نمود
لخت بحال خویش بسیا نوشتہ ایم (4)

آپ میں سے اکثر حضرات کو معلوم ہے کہ بعض اسباب خاص سے اس عاجز نے عام مجالس کی شرکت قطعاً" بند کردی تھی اور گزشتہ (خضرپور) کی مجلس میں التجا کی تھی کہ آئندہ اس خدمت سے معاف رکھا جاؤں۔ ارکان انجمن نے اس کی نسبت ایک خط لکھا' تو پہلے تو جی میں آیا کہ معذرت کے ساتھ انکار کروں' لیکن اس کے بعد سوچا کہ وقت تو وہ آگیا ہے' جب گونگے بولنے لگیں' اندھے دیکھنے لگیں' لنگڑے چلنے لگیں

اور بہرے سننے لگیں' (5) کیونکہ اسلام اپنے ہر پیرو سے اس کے آخری فرض کا طالب اور اس شے کا خواستگار ہے' جس کے بعد اس کے ذمے اور کچھ باقی نہ رہے گا' اور وہ توحید الٰہی کے حق سے سبکدوش ہو جائے گا۔ پس جو زبان نہیں بول سکتی' اسکو بھی بولنے کی سعی کرنی چاہیے اور جو قدم نہیں اٹھ سکتا' اس کو بھی چلنے کے لیے اٹھنا چاہیے۔

توحید: اخوت اسلامی و عموم رشتہ دینی

قرآن حکیم نے توحید الٰہی کے داعی کریم علیہ الصلوۃ والسلام کو سراج منیر سے ملقب کیا اور ان کے خصائص کریمہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: اے پیغمبرا جیسا' ہم نے تم کو شہادت دینے والا' بشارت پہنچانے والا' ضلالت و خباثت سے خوف دلانے والا راہ الٰہی کی طرف داعی اور ایک نورانی مشعل بنا کر بھیجا(6)

لیکن ایک دوسرے موقع پر آفتاب کو بھی سراج کے لقب سے یاد کیا ہے: اور آسمان میں خدا نے چاند کو بھی بنایا جو ایک نور ہے اور سورج کو بھی بنایا کہ وہ ایک روشن مشعل ہے۔ اس مماثلت اور اشتراک تشبیہ سے مقصود یہ تھا کہ اسلام کی دعوت بھی اس آفتاب مادی کی طرح ایک آفتاب روحانی ہے۔ جب آفتاب نکلتا ہے' تو اس کی روشنی اور حرارت میں کوئی تمیز نزدیک و دور' اعلیٰ و ادنیٰ' سیاہ و سفید' باغ و دشت کی نہیں ہوتی۔ اس کی روشنی بلاتمیز مکان و مقام ہر شے پر چمکتی اور حرارت پذیر وجود کو گرم کرتی ہے۔ بعینہ یہی حال اس آفتاب دعوت الٰہی اور نیر درخشاں سمائے رسالت کی عموم فیضان بخشی کا تھا جو گو سعیر سے چلا' مگر فاران کی چوٹیوں پر نمودار ہوا' جس کی کرنوں میں داہنی جانب شریعت الٰہی کا نور و کتاب مبین تھی مگر بائیں جانب قیام عدل میزان کی شمشیر آبدار چمک رہی تھی۔ جس کا طلوع کائنات میں ظلمت کی شکست اور روشنی کی دائمی فیروز مندی تھا کیونکہ آسمان ہدایت پر شریعت الٰہی کے گو سینکڑوں ستارے نمودار ہوئے تھے' لیکن تاریکی کی آخری شکست کے لیے دنیا کو آفتاب ہی کے طلوع کا انتظار ہوتا ہے:

"رات کی قسم جب کہ اس کی تاریکی کائنات کی تمام اشیاء کو چھپا دیتی ہے' اور روز روشن کی قسم جبکہ آفتاب کی تجلی تمام کائنات کو روشن کر دیتی ہے اور دراصل اس خالق کی قسم جس نے تخلیق عالم کے لیے نر اور مادہ کا وسیلہ پیدا کیا"

اس آفتاب توحید نے طلوع ہوتے ہی تفریق و اشتقاق کی تمام تاریکیوں کو مٹا دیا۔ اس کی روشنی کی فیضان بخشی نے اسود و ابیض اور عرب و عجم کی کوئی تمیز نہ رکھی۔ خدا کی ربوبیت کی طرح اس کی رحمت بھی عام تھی۔ وہ رب العالمین تھا' پس ضروری تھا کہ اس کی راہ کی طرف دعوت دینے والا بھی رحمتہ للعالمین ہو۔ "اے پیغمبر! ہم نے آپ کو نہیں بھیجا' مگر تمام عالموں کے لیے رحمت قرار دے کر"

انسان کی یہ سب سے بڑی ضلالت اور خدا فراموشی تھی کہ اس نے رشتہ خلقت کی وحدت کو بھلا کر زمین کے ٹکڑوں اور خاندان کی تفریقوں پر رشتے قائم کر لیے تھے۔ خدا کی زمین کو جو محبت اور باہمی اتحاد کے لیے تھی' قوموں کے باہمی اختلافات و نزاعات کا گھر بنا دیا تھا' لیکن اسلام دنیا میں پہلی آواز ہے جس نے انسان کی بنائی ہوئی تفریقات پر نہیں' بلکہ الٰہی تعبد کی وحدت پر ایک عالمگیر اخوت و اتحاد کی دعوت دی اور کہا کہ "اے لوگو ہم نے دنیا میں تمہاری خلقت کا وسیلہ مرد اور عورت کا اتحاد رکھا اور نسلوں اور قبیلوں میں تقسیم کر دیا۔ اس لیے کہ باہم پہچانے جاؤ' ورنہ دراصل یہ تفریق اور اشعاب کوئی ذریعہ امتیاز نہیں اور امتیاز اور شرف اسی کے لیۓ ہے' جو اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ متقی ہے" (8)

پس درحقیقت اسلام کے نزدیک وطن و مقام اور رنگ و زبان کی تفریق کوئی چیز نہیں۔ رنگ اور زبان کی تفریق کو وہ ایک الٰہی نشان ضرور تسلیم کرتا ہے: (9)

اس کو وہ کسی انسانی تفریق و تقسیم کی حد نہیں قرار دیتا اور انسان کے تمام دنیوی رشتے خود انسان کے بنائے ہوئے ہیں۔ اصلی رشتہ صرف ایک ہے اور وہ وہی ہے جو انسان کو اس کے خالق اور پروردگار سے متصل کرتا ہے۔ وہ ایک ہے پس اس کے ماننے والوں کو بھی ایک ہی ہونا چاہیے۔ اگرچہ سمندروں کے طوفانوں' پہاڑوں کی مرتفع چوٹیوں' زمین کے دور دراز گوشوں اور جنس و نسل کی تفریقوں نے ان کو باہم ایک دوسرے

سے جدا کر دیا ہو۔ "بیشک تمہاری جماعت ایک ہی امت ہے اور ہم ایک ہی تمہارے پروردگار ہیں" (10)

اے برادران ملت! یہی اسلام کی وہ عالمگیر اخوت اور دعوت اسلام کی وحدت تھی' جس نے زمین کے دور دراز گوشوں کو ایک کردیا تھا۔ اسلام نے ریگستان حجاز میں ظہور کیا' مگر صحرائے افریقہ میں اس کی پکار بلند ہوئی۔ اس کی دعوت کی صدا جبل بو قیس (11) کی گھاٹیوں سے اٹھی مگر دیوار چین سے صدائے اشہد ان لا الہ الا اللہ کی بازگشت گونجی۔ تاریخ کی نظریں جس وقت دجلہ و فرات کے کنارے پیروان اسلام کے نقش قدم گن رہی تھیں' عین اسی وقت گنگا اور جمنا کے کنارے سیکڑوں ہاتھ تھے جو خدائے واحد کے آگے سربسجود ہونے کے لیے وضو کر رہے تھے۔ یہ تمام دنیا کی مختلف قومیں زمین کے دور دراز گوشوں پر بسنے والی آبادیاں گویا ایک ہی گھر کے عزیز تھے' جن کو شیطان رجیم کی تفرقہ اندازیوں نے ایک دوسرے سے الگ کردیا تھا' لیکن خدائے رحیم نے ان صدیوں کے بچھڑے ہوئے دلوں کو ایک دائمی صلح کے ذریعہ پھر ایک جگہ جمع کر دیا۔ اور ان کے روٹھے ہوئے دلوں کو اس طرح ایک دوسرے سے منا دیا کہ تمام پچھلے شکوے اور شکایتیں بھول کر ایک دوسرے کے بھائی اور شریک رنج و راحت ہوگئے۔ "اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو جو تم پر نازل کی گئی' جب کہ تم اسلام سے پہلے ایک دوسرے کے دشمن تھے مگر اسلام نے تمہارے دلوں میں محبت و الفت پیدا کردی اور تم دشمن کی جگہ ایک دوسرے کے بھائی بھائی ہوگئے۔" (12)

یہ برادری خدا کی قائم کی ہوئی برادری ہے۔ ہر انسان جس نے کلمہ لا الہ الا اللہ کا اقرار کیا' ۔بجرد اقرار کے اس برادری میں شامل ہوگیا' خواہ مصری ہو' خواہ نائجیریہ کا وحشی ہو' خواہ قسطنطنیہ کا تعلیم یافتہ ترک۔ لیکن اگر وہ مسلم ہے تو اس ایک خاندان توحید کا عضو ہے' جس کا گھرانا کسی خاص وطن اور مقام سے تعلق نہیں رکھتا' بلکہ تمام دنیا اس کا وطن اور تمام قومیں اس کی عزیز ہیں۔

دنیا کے تمام رشتے ٹوٹ سکتے ہیں' مگر یہ رشتہ کبھی نہیں ٹوٹ سکتا۔ ممکن ہے کہ ایک باپ اپنے لڑکے سے روٹھ جائے' بعید نہیں کہ ایک ماں اپنی گود سے بچے کو الگ

کر دے' ہو سکتا ہے کہ ایک بھائی دوسرے بھائی کا دشمن ہو جائے' اور یہ بھی ممکن ہے کہ دنیا کے تمام عہد مودت' خون اور نسل کے باندھے ہوئے پیمان وفا و محبت ٹوٹ جائیں۔ مگر جو رشتہ ایک چین کے مسلمان کو افریقہ کے مسلمان سے' ایک عرب کے بدو کو تاتار کے چرواہے سے اور ایک ہندوستان کے نومسلم کو مکہ معظمہ کے صحیح نسب قریشی سے پیوست و یک جان کرتا ہے' دنیا میں کوئی طاقت نہیں ہے جو اسے توڑ سکے اور اس زنجیر کو کاٹ سکے' جس میں خدا کے ہاتھوں نے انسانوں کے دلوں کو ہمیشہ کے لیے جکڑ دیا ہے۔

پس اے عزیزان ملت! اور اے بقیہ ماتم زدگان قافلہ اسلام! اگر یہ سچ ہے کہ دنیا کے کسی گوشے میں پیروان اسلام کے سروں پر تلوار چمک رہی ہو' تو تعجب ہے' اگر اس کا زخم ہم اپنے دلوں میں نہ دیکھیں۔ اگر اس آسمان کے نیچے کہیں بھی ایک مسلم پیرو توحید کی لاش تڑپ رہی ہے' تو لعنت ہے ان سات کروڑ زندگیوں پر جن کے دلوں میں اس کی تڑپ نہ ہو۔ اگر مراکش میں ایک حامی وطن کے حلق بریدہ سے ایک خون کا فوارہ چھوٹ رہا ہے' تو ہم کو کیا ہو گیا ہے کہ ہمارے منہ سے دل و جگر کے ٹکڑے نہیں گرتے؟ ایران میں اگر وہ گردنیں پھانسی کی رسیوں میں لٹک رہی ہیں جن سے آخری ساعت نزع میں اشہدان لا الہ الا اللہ کی آواز نکل رہی تھی' تو ہم پر اللہ اور اس کے ملائکہ کی پھٹکار ہو' اگر اپنی گردنوں پر اس کے نشان محسوس نہ کریں۔ اگر آج بلقان کے میدانوں میں حافظین کلمہ توحید کے سر اور سینے صلیب پرستوں کی گولیوں سے چھد رہے ہیں' تو ہم اللہ اور اس کے ملائکہ اور اس کے رسولؐ کے آگے ملعون ہوں اگر اپنے پہلوؤں کے اندر ایک لمحہ کے لیے بھی راحت اور سکون محسوس کریں۔ میں کہہ رہا ہوں' حالانکہ اسلام کی روح کا ایک ذرہ بھی اس کے پیروؤں میں باقی ہے' تو مجھ کو کہنا چاہیے کہ اگر میدان جنگ میں کسی ترک کے تلوے میں ایک کانٹا چبھ جائے' تو قسم ہے خدائے اسلام کی کہ کوئی ہندوستان کا مسلمان' مسلمان نہیں ہو سکتا' جب تک وہ اس کی چبھن کو تلوے کی جگہ اپنے دل میں محسوس نہ کرے' کیونکہ ملت اسلام ایک جسم واحد ہے اور مسلمان خواہ کہیں ہوں' اس کے اعضاء و

جوارح ہیں۔ اگر ہاتھ کی انگلی میں کانٹا چبھے' تو جب تک باقی اعضاء کٹ کر الگ نہ ہوگئے ہوں' ممکن نہیں کہ اس صدمے سے بے خبر رہیں۔ اور یہ جو کچھ کہہ رہا ہوں' محض اظہار مطلب کا زور بیان ہی نہیں ہے' بلکہ عین ترجمہ ہے۔ اس حدیث مشہور کا جس کو امام احمد مسلم نے نعمان بن بشیر سے روایت کیا ہے کہ جناب رسول کریم علیہ صلوٰۃ و تسلیم نے فرمایا ہے: (13) "مسلمانوں کی مثال باہمی مودت و مرحمت اور محبت و ہمدردی میں ایسی ہے جیسے ایک جسم واحد کی' اگر اس کے ایک عضو میں کوئی شکایت پیدا ہوتی ہے' تو سارا جسم اس تکلیف میں شریک ہو جاتا ہے" اور اسی کے ہم معنی صحیحین کی وہ حدیث ہے جس کو ابوموسیٰ اشعری نے روایت کیا ہے: (14) "ایک مومن دوسرے مومن کے لیے ایسا ہے جیسے کسی دیوار کی ایک اینٹ دوسری اینٹ کو سہارا دیتی ہے" اور فی الحقیقت یہ خصائص مسلم میں سے ایک اولین اور اشرف ترین خصوصیت ہے جس کی طرف قرآن شریف نے اپنے جامع اور بلیغ الفاظ میں اشارہ کیا ہے: "کافروں کے لیے نہایت سخت مگر آپس میں نہایت رحیم اور ہمدرد" (15) ان میں جس قدر سختی ہے باطل اور کفر کے لیے اور ان کی جس قدر محبت و الفت ہے حق و صدق اور اسلام و توحید کے لیے: (16)

جامعہ اسلامیہ یا پان اسلام ازم

جب سے اسلام دنیا میں موجود ہے' یہ اخوت و وحدت بھی موجود ہے۔ مگر یورپ کا جدید وسیسہ شیطانی اس کو کسی مجہول الحال اور حدیث العہد اسلامی اتحاد سیاسی سے تعبیر کرتا ہے اور اس اضغاث احلام کی تعبیر اس کو ایک خونفشاں ہلال کی صورت میں نظر آتی ہے۔ وہ کسی ایسے وقت کے تصور سے اپنے تئیں لرزاں و ترساں ظاہر کرتا ہے۔ جب کہ تمام عالم میں چالیس کروڑ مسلمانوں کی تلواریں یکایک چمک اٹھیں گی۔ عیسائیوں سے ان کے گزشتہ چار سو سال کی مسیحی خونریزی کا حساب لیا جائے گا اور خذوہ فغلوہ ثم الجحیم صلوہ (17) کے نعروں کے ساتھ تمام دنیا کے درختوں پر صلیب پرستوں کی معلق اور مصلوب لاشیں' ان کے خدائے مصلوب کی لاش کی طرح

لگنے لگیں گی۔ مگر یہ یورپ کے چہرۂ خونیں کا عکس ہے جو اس کو عالم اسلامی کے آئینہ میں نظر آتا ہے۔

میں نے جب کبھی اس قسم کی تحریریں پڑھی ہیں' تو لکھنے والوں کے تعصب پر اس قدر متعجب نہیں ہوا ہوں' جس قدر اس کے جواب دینے والے مسلمانوں کی جہالت' بلکہ اسلام فروشی پر۔ جب کبھی یورپ کے شیاطین سیاست نے "پان اسلام ازم" کی صدا بلند کی ہے' تو معاً" مسلمانوں نے ڈر ڈر کر' اور کسی خونی مجرم کی طرح سہم سہم کر' اپنی بریت کے لیے بے اثر دلائل کی وظیفہ خوانی شروع کردی ہے اور پھر اکثر اوقات غیروں کے خوش کرنے کے لیے اس میں اس درجہ غلو کیا ہے کہ خود اپنے تئیں بھول گئے ہیں۔

مسئلہ مشرق اور پان اسلام ازم

لیکن حضرات! یقین کیجئے کہ پان اسلام ازم' کا فرضی خطرہ جس غرض تخفی سے دنیا کے سامنے لایا جاتا ہے' بہت کم مسلمان ہیں جن کی نظر اس کی حقیقی علت پر ہوگی۔ اس خطرہ کے اعلان پر بریت اور احتیاط کی کوشش بالکل بے فائدہ ہے' کیونکہ اس کی بنیاد جہل نہیں' بلکہ ایک نہایت سخت ابلیسانہ حکمت عملی ہے۔ قبل اس کے کہ مسلمان پان اسلام ازم' کے جرم سے کانوں پر ہاتھ دھریں' ان کو خود یورپ سے پوچھنا چاہیے کہ مسئلہ مشرق کی حقیقت کیا ہے؟ (18)

کوئی شخص اس سے انکار نہیں کرسکتا کہ آج نصف صدی سے یورپ کی تمام مسیحی طاقتوں نے ایک خاص متفقہ حکمت عملی وضع کی ہے اور اس کا نام مشرقی مسئلہ یا مشرق کا فیصلہ آخری رکھا ہے۔ مشرقی مسئلہ کی حقیقی غایت اسکے سوا کچھ نہیں ہے کہ اسلام کے بقیہ قوائے سیاسیہ کا بتدریج خاتمہ کر دیا جائے اور بالفاظ صاف تر یہ کہ دنیا کے جتنے حصے اسلام کے زیراثر باقی رہ گئے ہیں' ان کو بھی یورپ کی مسیحی حکومتیں کسی ایسی تقسیم مساوی کے ساتھ جو توازن دولی پر موثر نہ ہو' آپس میں بانٹ لیں۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ اظہر من الشمس فی نصف النہار ہے اور جس شخص نے کم از کم

گزشتہ دس برسوں کے اندر کے واقعات سے آنکھیں بند نہیں کرلی ہیں' وہ بغیر کسی بصیرت مزید کے اسے دیکھ سکتا ہے۔ پھر اگر یہ سچ ہے کہ ایک خنجر اسلام کے قلب میں پیوست کردینے کے لیے تیز کیا جارہا ہے' تو کیا مضائقہ اگر ہم کسی ڈھال کی تیاری میں مصروف ہوں! اگر خدا پرستی سے مسیح پرستی کی دشمنی قدیمی ہے اور یہ کوئی نئی مسیحی سازش نہیں' تو پیروان توحید کا حملہ مشرکین سے بچنے کے لیے اتحاد اخوت بھی کوئی نیا حربہ نہیں ہے۔ یورپ جانتا ہے کہ مشرقی مسئلہ کی حکمت عملی کے لیے کوئی پہلو اگر اسلام کے پاس ہے تو صرف اسکا حقیقی اتحاد اسلامی ہے' اور تمام دنیا کے مسلمانوں کا اس پر متفق ہو جانا ہے کہ اپنی قدیمی سیادت اور شرف کو محفوظ رکھیں۔ اسلامی زندگی کی آخری انسانی تلوار صرف ترکوں کے ہاتھ میں ہے۔ لیکن ایک ترکی حکومت جس کے کئی قیمتی اجزاء پر مسئلہ مشرقی کی قینچی چل چکی ہے' مسیحی اتحاد کا کیا مقابلہ کرسکتی ہے؟ البتہ اگر چالیس کروڑ قلوب اسلامیہ ہلال کے نیچے جمع ہو جائیں' تو پھر وہ ایک ایسی قوت ہے جس کو سینکڑوں سکندر (19) اور ہنی بال (20) بھی مل کر فنا نہیں کرسکتے۔ یورپ چونکہ یہ جانتا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی جانتا ہے کہ غفلت اور اغراض پرستی نے مقامی و وطنی سرشاریوں میں مسلمانوں کو مبتلا کردیا ہے اور ان کے باہمی بین الملی اتحاد کے جسم میں مغربی الحاد کے جراثیم پیدا ہو چکے ہیں' اس لیے گو فی الحقیقت کسی ایسے اسلامی اتحاد کا وجود نہیں ہے' لیکن وہ وقت سے پہلے پیدا ہونے والی مقاومت کا استیصال کرنا چاہتا ہے' اور اس مشہور قاعدہ کی رو سے کہ اتقاء عن المرض خير من معالجة بعد وقوعه (21) اسلام کے فنا کرنے سے پہلے اس کے بچاؤ کی ڈھال کو فنا کر دینے کی تدبیروں میں مصروف ہے۔

پھر کیا ہوگیا ہے ان ملاحدہ مسلمین اور متفرنجین مارفین کو جو پان اسلام ازم کا نام سنتے ہی صیانتا! صیانتا! کا نعرہ لگانا شروع کر دیتے ہیں۔ اور قسمیں کھا کھا کر کانوں پر ہاتھ دھرتے ہیں کہ ہماری یورپ پرستی اور اسلام دشمنی کی پرامن وفاداری میں کوئی اسلامی اتحاد خلل انداز نہیں ہو سکتا! کیا وہ اس انکار و تبری سے ٹھیک اس غرض و غایت کو پورا نہیں کرتے جو اس عمل شیطانی کے تعلق سے خود یورپ کے پیش نظر ہے۔

پروفیسر ویمبری (22) جس نے اٹھارہ برس کی عمر سے تیس برس تک ترکوں کا نمک کھایا اور اس کے بعد ہمیشہ بحیثیت ایک اسلام پرست اور عثمانی بہی خواہ دوست کے سرائے یلدیز کی شاہانہ مہمان نوازیوں سے متمتع ہوتا رہا ہے۔ کل کی بات ہے کہ بوڈاپیسٹ ہیرلڈ میں اس تمہید کے علاوہ کے بعد کہ وہ مسلمانوں کا دوست ہے' لکھ رہا تھا:

"اسلام کی حمایت سے اب کوئی فائدہ نہیں۔ وہ عنقریب فنا ہو جائے گا اور اس کو فنا ہی ہو جانا چاہیے۔ مسلمان ایک ایسی وحشی قوم ہے جس میں نہ تو طبیعت کا وجود ہے اور نہ طبیعت کو وہ محسوس کر سکتے ہیں۔ ان کو صرف خدا کی عبادت گزاری آتی ہے' مگر دنیا میں کام کرنا نہیں آتا۔ تمام انسانی حس و شعور ان سے سلب ہو گئے ہیں' صرف ایک دینی جذبہ ان میں باقی ہے' نہ ان کا کوئی مسلک' اور نہ کائنات میں مقصد۔ پس اب یورپ کے لیے یہی باقی رہ گیا ہے کہ وہ اسلامی حکومتوں کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے آپس میں بانٹ لے۔"

یہ مسلمانوں کے سب سے بڑے دوست کی آواز ہے۔ لیکن اب دشمنوں کو کہاں ڈھونڈیں۔ پروفیسر مسکین ہارڈن جو آسٹریا کے سب سے بڑے اخبار (زر تکفت) کا مالک اور چیف ایڈیٹر ہے' چند سال ہوئے ہیں کہ اس نے مسئلہ مشرقی پر لیکچر دیا تھا' اور اس کا خلاصہ (لندن ٹائمز) نے چھاپا تھا۔ مجھ کو یاد ہے کہ اس کی آواز ان جملوں پر آکر رکی تھی:

"اب اور کب تک اسلام کو آزاد چھوڑ دیا جائے گا کہ وہ اپنی ہزار سالہ وحشت اور خونخواری کے واقعات بیسویں صدی میں دہراتا رہے! کب تک یورپ اپنی باہمی رقابت کے ہاتھوں عالم انسانیت کی مظلومی کا تماشا دیکھتا رہے گا! اسلام ایک خطرہ ہے اور اسکا بقا تمامتر خطرہ۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ یورپ اسلام سے جو زمین کا ٹکڑا لے لیتا ہے' وہ اس کا قدرتی حق ہے اور دول

یورپ کے لیے مال غنیمت ہے' جس کی واپسی کا خیال بھی جنون ہے۔

یورپ اسلام کے نام لیوا چالیس کروڑ نفوس انسانی کو تہذیب اور تمدن کے نام سے فنا کر دینا بیسویں صدی کی سب سے بڑی تمدنی خدمت سمجھتا ہے۔ روس میں آج کئی ملین عیسائی موجود ہیں' جو عثمانیوں سے ہزار درجہ یورپین تمدن سے ابعد ہیں۔ سب سے پہلے اس خنجر تہذیب کی دھار کی مستحق ان کی گردنیں کیوں نہیں سمجھی جاتیں؟ اور جس تہذیب کے نام پر یہ صلیبی جنگ جاری کی گئی ہے' اگر یہ وہی تہذیب ہے جس کی ٹریجڈی 16 اکتوبر 1911ء کو اٹالین تمثال تمدن نے طرابلس میں دکھائی تھی' تو ہزار سلامتی ہو تجھ پر' اے وحشت و خونخواری' اور ہزار ہزار برکت و رحمت نازل ہو تجھ پر' اے افریقہ اور نائیجیریا کی بربری و درماندگی! اور کبھی تیرے سایہ برکت سے ہمارے سر جدا نہ ہوں۔"

وجود کہ ذنب لایقاس بہ ذنب (23)

حضرات! یورپ کے نزدیک "مسئلہ مشرقی" کا حل بالکل ایک قدرتی انصاف و عدل ہے۔ چالیس کروڑ نفوس اسلام کو مٹا دینے کا عملی تہیہ کوئی تشویش انگیز بات نہیں۔ یہ اس پرانی مسیحی وصیت کی تبلیغ و تکمیل ہے' جس کو سینٹ لوقا نے شہزادہ امن (مسیح کی زبانی دنیا کو سنایا تھا کہ وہ دشمن جو نہیں چاہتے کہ میں ان پر حکمرانی کروں' ان کو یہاں لاؤ اور میرے قدموں کے آگے ذبح کر دو۔ (24)

پس اس میں کوئی انسانی ظلم نہیں۔ قوموں کے قدرتی قوانین کا احترام اس بارے میں بالکل بے معنی ہے۔ اور کوئی شے قابل توجہ ہے تو صرف یہ ہے کہ یورپ کی رقیب حکومتیں ایک دوسرے پر بازی نہ لے جائیں۔ جسم اسلام کی اس طرح بوٹیاں نوچی جائیں کہ ہر بھیڑیے کے منہ میں مساوی تقسیم کے ساتھ ایک ایک لقمہ آجائے۔ لیکن جامعہ اسلامیہ' اسلام کی قدرتی اخوت' اس کا روز اول سے قائم کردہ رشتہ اتحاد ـــــ تو یہ ایک سخت سے سخت معصیت اور جرم ہے' جس کا کوئی ذی روح مخلوق مجرم ہو سکتا ہے۔ یہ ایک کھلا عدوان اور فساد ہے۔ یہ وحشیانہ تعصب اور بربرانہ خونخواری

کی سازش ہے۔ یہ ایک ایسا گناہ ہے جس کے لیے نفرین اور عذاب کے سوا اور کچھ نہیں ہونا چاہیے۔ یہ ایک ایسی تاریک زندگی ہے جو صرف اس لیے ہے کہ اسے مٹا دیا جائے۔ (25)

لیکن اے اقوام یورپ! اے وزوان قافلہ انسانیت! اے مثال درندگی و سبعیت! اے مجمع وحوش وکلاب! ظلم و عدوان تا کجے؟ اور خون و خون ریزی تا چند؟ کب تک خدا کی سرزمین کو اپنے حیوانی غرور سے ناپاک رکھو گے؟ کب تک انصاف ظلم سے اور روشنی تاریکی سے مغلوب رہے گی؟ تبریز میں تمہارے ہاتھوں انسانوں کی گردنیں سولی پر لٹک رہی ہیں۔ طرابلس کی ریت پر اب تک اس جمے ہوئے خون کے ٹکڑے باقی ہیں، جو تمہاری آنکھوں کے سامنے تمہارے ایک پیشرو نے بہایا۔ مراکش میں ان لاشوں کا شمار کوئی انسان نہیں کرسکتا، جن میں سے سینکڑوں کو مٹی کے بوجھ کی جگہ تمہارے گھوڑوں کے سموں کی پامالیاں اور تمہارے جنگی بوٹوں کی ٹھوکریں نصیب ہوئی ہیں۔

یہ تمہارے تمام خبائث شیطانی دنیا کے لیے تہذیب و تمدن کی رحمت اور امن و صلح کی برکت ہیں، لیکن اس کے مقابلے میں آٹھ سو انتالیس قیدی (عزیزیہ) اور (طبروق) کے صحرائی قبائل کی قید میں دن میں پانچ مرتبہ اس غذا سے بہتر غذا کھاتے ہیں، جو فوج طرابلس کے افسر عام کو نصیب ہوتی ہے، اور عین اس وقت جب کہ نخلستان طرابلس میں مسلمانوں کے شیر خوار بچوں اور خانہ نشین عورتوں کا قتل عام کیا جاتا ہے، ڈیڑھ سو سے زیادہ بیالیس قیدیوں کو ...... نشاط ہے ...... خاص اپنا خیمہ دیتا ہے کیونکہ وہ ریگستان کی گرد اور تپش کے عادی نہ ہونے کی شکایت کرتے ہیں، لیکن پھر بھی اسلام اور اسلام کے محافظ ترک وحشت و بربریت کا پیکر ہیں، اور لہٰذا تہذیب و شائستگی کی تکمیل کے لیے ان کو مٹا دینا چاہیے!

پس اے برادران ملت! جس پان اسلام ازم کو یورپ پیش کررہا ہے، اگرچہ اس کے وساوس آفرین دماغ سے باہر اس کا کوئی وجود نہیں، مگر اس سے برات کی بے فائدہ کوشش نہ کیجئے۔ جس چیز کو آپ اپنی برائت میں پیش کریں گے، اس سے وہ بے خبر

نہیں ہے۔ آپ اپنی برءت کے اظہار میں آج کل کے ملاحدہ مسلمین کی طرح خواہ اپنی جنس اسلامی کو جنس مغربی سے کیوں نہ بدل لیں، لیکن وہ کبھی پان اسلام ازم سے اپنے تیئں بے خطر نہ دکھلائیں گے کیونکہ وہ دانستہ آپ کی ایک اصلی مدافعانہ قوت اتحادی کو اس طرح فنا کر دینا چاہتا ہے۔ آپ انکار کریں خواہ اقرار، دونوں حالتوں میں اس کا سلوک یکساں ہو گا۔

"اس کی مثال کتے کی سی ہے۔ اگر اس کو دھتکار دو، جب بھی زبان باہر لٹکائے رہے گا، اگر اس کو چھوڑ دو، جب بھی زبان ہلاتا رہے گا" (26)

کاش مسلمانوں میں پان اسلام ازم ہوتا

مسلمان "پان اسلام ازم" کے نام پر استغفار پڑھ رہے ہیں، لیکن میں کہتا ہوں کہ اے کاش، آج مسلمانوں میں پان اسلام ازم کا وجود ہوتا۔ وہ پان اسلام ازم جس کو ترکی یا انگلستان کے مسلمانوں کی کسی خفیہ کمیٹی کے پیدا کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ روز اول سے ہم کو جس کی دعوت دی گئی ہے۔

واعتصموا بحبل الله جميعا ولا تفرقوا (27) (ایک دین الٰہی کی رسی سب مل کر پکڑ لو اور آپس میں متفرق نہ ہو۔)

اگر پان اسلام ازم کا اصلی وجود ہوتا، تو کیا ممکن تھا کہ ہمارے سامنے ایران پر قیامت گزر جاتی، مراکش کا خاتمہ ہو جاتا، طرابلس میں مسلمانوں کی لاشیں تڑپتیں اور ہمارے قلوب میں کوئی حقیقی حرکت پیدا نہ ہوتی۔ روضہ مبارک حضرت امام رضا علیہ السلام کی دیواریں ملاعنہ روسیہ کی گولہ باری سے گر گئیں۔ برقہ کی مسجدوں کے میناروں پر اٹلی کے مشرکین و مریم پرست چڑھ گئے، تاکہ عین اس مقام پر جہاں سے خدائے واحد کی تقدیس و تسبیح کی صدائیں بلند کی جاتی ہیں، رومن کیتھولک بت پرستی کا علم نصب کریں۔ لیکن مجھ کو بتلاؤ کہ کتنے ہندوستان میں مسلمان ہیں جن کے دلوں میں زخم آئے اور کتنے ہیں جن کے جگر میں ٹیس اٹھی؟

كمثل هذا يذوب القلب من كمد

ان کان فی قلب الاسلام و ایمان (28)

سچ یہ ہے کہ ہم اپنے اصلی پان اسلام ازم کو کھو چکے ہیں اور یہی علت اسلام کے اصلی ضعف اور انحطاط کی ہے' مگر چونکہ اس کا بیج اب بھی ہم میں موجود ہے گو برگ و بار نہیں' اس لیے یورپ چاہتا ہے کہ اس طرح کے انتشارات سے سہا اور ڈرا کر ہمکو آئندہ کی ہوشیاری اور بیداری سے بھی باز رکھے اور رہی سہی قوت کا بھی نشوونما سے پہلے خاتمہ کر دے۔

مسئلہ مسلم یونیورسٹی اور مسئلہ بقائے اسلام

اے حضرات! یاد رکھئے' آج اسلام کے لیے' مسلمانوں کے لیے' کوئی وطنی اور مقامی تحریک سود مند نہیں ہو سکتی اور اس کشتی کے تیرنے کے لیے اصلی نہ کہ یورپ کے اختراعی پان اسلام ازم کے سوا اور کوئی بادبان نہیں ہے۔ ایک قوم جو ریگستان عرب سے دیوار چین تک آباد ہے' اس کو زمین کے کسی خاص ٹکڑے کا تغیر کیا فائدہ پہنچا سکتا ہے!

جس قدر مقامی کوششیں آج عمل میں آ رہی ہیں' خواہ وہ مصر میں ہوں یا ترکی میں' الجزائر میں ہوں یا اس تیرہ زار ہند میں' میرے عقیدہ میں یہ سب کچھ کاہن شیطان کا ایک عمل السحر ہے' جو اس لیے سلاتا ہے کہ سونے والوں کا اٹھنا اسے پسند نہیں۔ میں نے کہا کہ ہم میں سچا پان اسلام ازم یا بالفاظ اصلی رشتہ اخوت دینی باقی نہیں رہا۔ اور کیونکر باقی رہے' جب کہ ہندوستان میں ایسے عظیم الشان اشغال ہمارے لیے موجود ہیں' جو نفس اسلام کے بقا سے بھی زیادہ اہم ہیں۔ ان کو چھوڑ کر ہم غریب ترکوں یا ایرانیوں کی کیونکر خبر لیں۔ سب سے مقدم امر یہ ہے کہ ہمیں علی گڑھ میں ایک یونیورسٹی بنانی ہے' اس کے لیے تیس لاکھ روپیہ جمع کرنا ہے۔ یہ مانا کہ دنیا کی کوئی سرزمین ہے' جہاں خود اسلام کے بقا و فنا کا سوال درپیش ہے۔ مگر اس کو کیا کیجئے کہ "مسلم یونیورسٹی" ہمارے قومی مقاصد کا اصلی نصب العین' کعبہ علی گڑھ کے شب زندہ داران عبادت کی چہل سالہ تہجد گزاری کی مراد' آرزو اور ہمارے رہنمائے اول کی دی

ہوگی شریعت تعلیم کا یوم تکمیل ہے' جس دن یونیورسٹی بن جائے گی' اس دن الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا (29) کی وحی اسٹریچی ہال کی چھت پر نازل ہوگی۔ ترکوں کی ہمدردی اور ایرانیوں کے مصیبت پر ادائے فریضہ تشکر کے بعد ایک ریزولیوشن پاس کردیا جائے گا' مگر اس افسوس پر ملامت نہ کیجئے کہ کیفیت طرابلس کے جھگڑے سے یونیورسٹی کے چندے میں فرق آگیا! (30) اے عزیزان ملت! قوموں اور ملکوں کی زندگی کا نہیں' بلکہ اسلام کی زندگی کا سوال ہے۔ فرض کیجئے کہ ہندوستان کے مسلمانوں نے اپنی ترقی کے تمام منصوبے پورے کرلیے اور ان کا ہر فرد تعلیم اور دولت کا ایک مرتب طلائی بت بن گیا؟ لیکن اگر سرے سے خود اسلام کی سیاسی طاقت پر چھری چل گئی' تو پھر علی گڑھ میں یونیورسٹی ہی نہیں' بلکہ چاندی اور سونے کی بہشت شداد بھی بن جائے' مگر اس کے حور و غلمان کس کا ترانہ گائیں گے؟

السیف صدق انباء من الکتب (31)

اے اخوان عزیز! یاد رکھئے کہ دنیا میں امن' صلح اور ترک قتل و غارت کا تصور کتنا ہی خوشنما ہو' مگر دنیا کی بدقسمتی سے اب تک اصلی قوت تلوار کی قوت اور زندگی کا سرچشمہ آب حیات خون کی ندیوں اور فواروں ہی میں ہے۔ دنیا پر اب تک کوئی زمانہ ایسا نہیں گزرا ہے کہ تلواروں کی صداقت ضعیف ہوئی ہو' اور امید نہیں کہ آئندہ بھی ایسا زمانہ نصیب ہو۔ غریب اخلاق نے ہمیشہ اپنے تنگنائے بے کسی میں چھپ کر کسی ایسی دنیا کی منتیں مانی ہیں' جب کہ تمام کائنات انسانوں کی ملائکہ معصومین کی بہشت زار بن جائے گی اور قتل و خونریزی کو لوگ اسی طرح بھول جائیں گے' جس طرح موجودہ عالم نے امن اور صلح کو فراموش کردیا ہے۔ اس آرزو کے حسن و جمال پر کون دل ہے جو فریفتہ نہیں ہوگا۔ لیکن کیا کیجئے کہ دنیا امید اور آرزو ہی نہیں بلکہ حقائق و نتائج کی جگہ ہے' اور انسان جب تک فرشتہ نہیں بلکہ انسان ہے' اس وقت تک ایسی امیدوں کا اخلاق کے صفحوں سے باہر پتہ لگنا ممکن نہیں۔ آج اگر پوچھا جائے کہ قوموں کی زندگی اور زندگی کے مظاہر کہاں تلاش کئے جائیں' تو اس کا جواب علم و

فن کی بڑی بڑی درسگاہوں اور علوم الاولین والاخرین کے کتب خانوں سے نہیں ملے گا' بلکہ ان آہن پوش جہازوں کے مہیب طول و عرض سے جن کی قطاریں ساحل کے طول میں پھیلی ہوئی ہیں اور جن کے روزنوں سے آہن پوش توپوں کے دہانے نکلے ہوئے ہیں۔

پس حضرات! وہ ہاتھ نہایت مقدس ہے جس میں صلح کا سفید جھنڈا لہرا رہا ہو۔ مگر زندہ وہی ہاتھ رہ سکتا ہے جس میں خونچکاں تلوار کا قبضہ ہو۔ یہی اقوام کی زندگی کا منبع' قیام عدل و میزان کا وسیلہ' انسانی بہیمیت و درندگی کا بچاؤ اور مظلوم کے ہاتھ میں اس کی حفاظت کی ایک ہی ڈھال ہے۔ "ہم نے اپنے رسولوں کو کھلی کھلی نشانیوں کے ساتھ بھیجا اور ان کو کتاب اور میزان دی' تاکہ لوگ عدل اور انصاف پر قائم ہوں' اور نیز لوہا پیدا کیا جو ہتھیاروں کی صورت میں سخت خطرناک بھی ہے اور نفع رساں بھی۔"

(32)

اسلام کی پولٹیکل طاقت کا مرکز وحید

مسلمان یاد رکھیں کہ آج صرف ایک ہی تلوار ہے' جو دین الٰہی کی حمایت میں بلند ہو سکتی ہے اور وہ آل عثمان کی مقدس شمشیر خلافت ہے۔ یہ اسلام کے گزشتہ قافلہ جہانبانی کا آخری نقش قدم اور ہمارے آفتاب اقبال کی آخری شعاع امید ہے۔ یہی سبب ہے کہ ہمارا ترکوں سے رشتہ محض دینی اخوت ہی کا نہیں ہے' بلکہ اس سے بھی مقدم تر رشتہ خلافت اسلامیہ کے دینی احترام کا ہے' کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ کوئی قوم بغیر کسی سیاسی مرکز کے زندہ نہیں رہ سکتی اور اسلام کا کوئی مرکز سیاسی اگر ہے' تو صرف خلافت آل عثمان ہے۔ ہر مسلمان خواہ وہ دنیا کے کسی حصے میں ہو' اگر اس کا فرض دینی ہے کہ اسلام کی بقا کا خواستگار ہو' تو یہ بھی فرض دینی ہے کہ خلافت آل عثمان کے تعلق کو ایک خالص دینی رشتہ کی طرح اپنے دل میں محفوظ رکھے اور دنیا کی جو حکومت اس کی دشمن ہو' اس کو اسلام کا دشمن اور جو اس کی دوست ہو' اس کو اسلام کا دوست یقین کرے' کیونکہ مسلمانوں کی دوستی اور دشمنی انسانی اغراض کے لیے نہیں' بلکہ

صرف دین الٰہی کے لیے ہے۔

مسلمانانِ ہند کی نسبت بار بار سیاسی حلقوں میں یہ سوال اٹھایا گیا ہے کہ وہ دنیا کے کسی اسلامی حصے کے واقعات سے اس درجہ متاثر نہیں ہوتے جس قدر ترکی کے حوادث و حالات سے۔ اگر محض رشتہ اخوت و اشتراک مذہب ہی اس اثر پذیری کی علت ہے' تو اس میں ترکوں کی خصوصیت کیا ہے؟ بہت سے لوگ ہیں جو اس واقعی ضروری سوال کے جواب میں یا تو نفاق سے کام لینا چاہتے ہیں یا کفر سے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں کے لیے بہتر راہ اسلام کی ہے۔ مسلمانوں کو بغیر ادنیٰ تامل کے صاف صاف اس سچے سوال کا جواب دینا چاہیے۔

تمام دنیا کے مسلمانوں سے ہمارا صرف ایک ہی رشتہ ہے: دینی اخوت اور پان اسلام ازم کا مگر ترکوں سے ہمارے دو رشتے ہیں: پہلا اخوت دینی کا کہ وہ بھی مسلمان ہیں' اس لیے خدا نے ہم کو ہمیشہ کے لیے ان کے رنج و راحت کا شریک بنا دیا ہے' دوسرا اس سے بھی قوی تر رشتہ خلافت دینی اور اسلام کے آخری سیاسی مرکز ہونے کا کہ آج کلمہ اسلام کی حفاظت کی آخری تلوار صرف ان کے ہاتھ میں ہے۔ اگر کسی اور خطہ سے اسلام کی حکومت مٹتی ہے' تو ہم سوچتے ہیں کہ ہمارا ایک عضو کٹ گیا۔ لیکن ترکوں پر جب کوئی آفت لائی جاتی ہے' تو تڑپ جاتے ہیں کہ ہمارا دل دو نیم ہو گیا۔ جب ترکوں کے لیے مضطرب ہوتے ہیں' تو ہمارا اضطراب مسلمانوں کے لیے نہیں ہوتا بلکہ اسلام کے لیے ہوتا ہے۔

وما کان قیسا ھلکہ ھلک واحدا

ولکنہ بنیان قوما تہدما (33)

حضرات! وہ قوم جس کا ظہور تیرہ سو برس ہوئے کہ مکہ نامی ایک جزیرہ نما سے ہوا تھا اور جو مسلم کے لقب سے پکاری جاتی ہے' اس کا عقیدہ تو یہی ہے جس کو میں نے بیان کیا۔ لیکن بدقسمتی سے ایک دوسری قوم بھی ہم میں موجود ہے' جو اس حقیقت کو تسلیم نہیں کرتی۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنی دنیوی عزت و شوکت کا جوا کھیلا ہے اور اس کے لیے ملت مظلومہ کو ایک بازیچہ بنا لیا ہے۔ ہوائے نفس جن کا آلہ ہے'

حکام و امراء جن کے معبود ہیں' درہم و دینار جن کا قبلہ ہے' غلامی و تعبد جن کی شریعت ہے' جو قریش مکہ کے صامت و ساکن بتوں کی جگہ سمندر پار سے آئے ہوئے متحرک بتوں کو پوجتے ہیں۔ جو وحی الٰہی کی جگہ سمائے شملہ سے اترے ہوئے احکام و فرمان کو اپنی کتاب و سنت پر یقین کرتے ہیں اور جن کے قلوب' اصابع الرحمٰن کی جگہ اصابع الشیطان میں ہیں یقلبها کیف یشاء (34) فرشکہ الذین یستحبون الحیاۃ الدنیا علی الاخرۃ ویصدون عن سبیل اللہ و یبغونها عوجا اولئک فی ضلال بعید (35)

تو اے حضرات! اس وقت کے عقیدہ میں' پان اسلام ازم' یا اسلام کا بین الملی اتحاد ایک کفر صریح ہے۔ خلافت اسلامی کوئی شے نہیں۔ مسلمانان ہند کو ترکوں سے کوئی تعلق نہیں۔ ان کو اپنی خلافت راشدہ کے سوا اور کسی طرف گوشہ چشم سے بھی نہیں دیکھنا چاہیے۔ اگر ایسا کریں تو فرض اطاعت اولی الامر کی خلاف ورزی کے مجرم' ترکی فتح پر تبریک و تہنیت کا تار دینا داخل تخفیف الحرکتی' اور بغیر ان کے معبودان کونین کی اجازت قطعاً" حرام و معصیت! یہ لوگ یورپ کے ان شیاطین سیاست کے ہاتھ میں جو خلافت اسلامیہ کے بین الملی اثر کے مٹانے کے لیے تیس برس سے اپنا مشن پھیلا رہے ہیں' ایک آلہ عمل رہے ہیں اور ہمیشہ دنیا کو اس کا یقین دلایا ہے کہ مسلمانان ہند کو خلافت اسلامی اور ترکوں کے بقا و فنا سے کوئی تعلق نہیں۔ حال آنکہ جس وقت اپنے معبودان باطل کے آگے ان لوگوں کی زبان اور قلم سے یہ جملے نکل رہے تھے' یقین کیجئے کہ اس وقت اللہ اور ملائکہ کی لعنت اور پھٹکار ان پر نازل ہو رہی تھی کیونکہ اس طرح بے تعلقی ظاہر کرکے یہ اس رشتے کو کاٹ رہے تھے' جس کو خدائے ابراہیم و محمد علیہ الصلوۃ والسلام نے تمام دنیا کے مسلمانوں میں قائم کردیا ہے اور گویا اس پر اپنی رضا و مسرت ظاہر کرتے تھے کہ وہ لاکھوں مسلمان جو اس آخری وقت میں کلمہ توحید کی حفاظت کر رہے ہیں' صلیب پرستوں کی تلواروں سے فنا کر دیئے جائیں۔ یہ اللہ اور اس کے رسول کو اذیت دیتے تھے' کیونکہ مسلمانوں کی اذیت پر خوش تھے' اور مسلمانوں کی اذیت پر خوش ہونا ہمیں اللہ اور اس کے رسول کی اذیت پر خوش ہونا ہے۔ "جو

لوگ اللہ اور اسکے رسول کو اذیت دیتے ہیں' دنیا اور آخرت میں اللہ نے ان پر لعنت کی اور ان کے لیے ایک ذلت بخش عذاب تیار کیا گیا ہے" (36)

اب زمانے نے پلٹا کھایا ہے زمین اور آسمان دونوں طرف سے تازیانہ ہائے عذاب ان پر پڑ رہے ہیں۔ اس لیے گو دل نہ ہلے ہوں' مگر زبانیں کچھ کچھ ہلنے لگی ہیں۔ اب ترکوں سے اس قدر بے مہری ظاہر نہیں کی جاتی۔ خلافت اسلامیہ کا نام آتے ہی اس سے انکار و تبری کے تار پانیر میں نہیں بھیجے جاتے۔ مدت سے کوئی پمفلٹ بھی مسئلہ خلافت پر شائع نہیں کیا گیا ہے' ریزولیشن کے پاس کرنے سے بھی چنداں انکار نہیں ہے۔ بعض اصحاب کی تو بظاہر اس درجہ قلب ماہیت ہو گئی ہے کہ علانیہ ترک مجروحین کے لیے چندے میں بھی شرکت کر رہے ہیں۔ تاہم ہم کو معلوم ہے کہ اس انقلاب کی اصلی علت کیا ہے' اور ان کے ظاہر و باطن میں باہم کیا ربط ہے۔ "یہ منافق جب مسلمانوں سے ملتے ہیں' تو کہتے ہیں ہم مسلمان ہیں' لیکن اپنے شیطانوں کے پاس تنہائی میں جاتے ہیں' تو کہتے ہیں' دل سے تو ہم تمہارے ہی ساتھ ہیں' ظاہری کارروائیاں جس قدر جاری ہیں' وہ ایک تمسخر و دل لگی سے زیادہ نہیں" (37-38)

اے اخوان ملت! آج وہ وقت آگیا ہے کہ دلوں پر سے پردے اٹھ جائیں اور کفر و ایمان میں تمیز ہو جائے۔ یقین کیجئے کہ یہ ایک سب سے بڑی اور شاید آخری ابتلائے عظیم ہے' جو صرف اس لیے ہے کہ اللہ مدعیان ایمان کو آزمانا چاہتا ہے۔ "اور اللہ تم کو آزمائے گا۔ یہاں تک کہ سچے مجاہد اور صابر جھوٹوں سے الگ ہو جائیں" (39)

آج وہ دن آگیا ہے جب مسلمانوں کے دل پہلوؤں کی جگہ ان کے چہروں آجائیں گے جب کہ یا تو دلوں کی سیاہی سے ان کی پیشانیاں بھی تاریک ہو جائیں یا دل کے ایمان کی روشنی ان کی پیشانی پر چمکنے لگے گی۔ "وہ دن جب کہ یا تو چہرے چمک اٹھیں گے یا سیاہ پڑ جائیں گے' وہ وہ لوگ ہوں گے' جنہوں نے ایمان لانے کے بعد انکار کیا اور ان کے لیے وہی عذاب ہوگا' جس سے وہ انکار کیا کرتے تھے' اور جن لوگوں کے چہرے چمکنے لگیں گے' ان کے لیے اللہ کی رحمت کا آشیانہ ہوگا' جس میں ہمیشہ کے لیے ان کو جگہ مل جائے گی۔" (40)

یاد رکھیے کہ خدا تعالیٰ اپنے کلمہ توحید کی حفاظت کے لیے ہم مسلمانوں کی اعانت کا محتاج نہیں ہے' بلکہ ہم اس کے فضل کے محتاج ہیں۔ اس تیرہ سو برس کے اندر اسلام میں کتنی قومیں آئیں اور اپنی اپنی باری سے اسلام کی حفاظت کا فرض ادا کر گئیں۔ اگر اس آخری آزمائش میں بھی ہم پورے نہ اترے' تو کیا عجب ہے کہ قدرت الٰہی اپنے دین مبین کی حفاظت کے لیے دوسروں کو چن لے اور ہم کو اسی طرح اپنے دروازے سے مطرود و مردود کر دے' جس طرح ہم سے پہلے بہت سی قومیں ہو چکی ہیں۔ "اے لوگو! تم اللہ کے دروازہ کے فقیر و سائل ہو۔ اللہ تو تمہاری مدد سے بے نیاز ہے۔ اگر وہ چاہے تو تم سے اپنا رشتہ کاٹ لے اور ایک دوسری مخلوق کو پیدا کر دے۔ اور اس کے لیے یہ کچھ مشکل نہیں ہے" (41) اللہ کے عجائب کاروبار قدرت کے یہ تماشے پہلے ہی دن سے ہیں۔ کیا نہیں دیکھتے کہ اس نے مکہ کی سرزمین کو محبوب ہونے کا شرف عطا فرمایا اور قریش مکہ کو اپنے نور رسالت کا حامل بنایا۔ لیکن جب انہوں نے اس احسان الٰہی کی قدر نہ کی' تو غیرت الٰہی نے کہا کہ وہ اپنے کاموں کی تکمیل کے لیے کچھ سرزمین مکہ ہی کا محتاج نہیں ہے' دین حق کی اعانت کے لیے مدینہ والوں کو بھیج دیا۔ "اے مسلمانو! اگر تم میں سے کوئی دین الٰہی سے منہ موڑے گا' تو اللہ کو اس کی کچھ پروا نہیں' وہ ایسے لوگوں کو موجود کر دے گا' جن کو وہ دوست رکھے گا' اور وہ اس کو دوست رکھیں گے۔" (42)

الی الجہاد فی سبیل اللہ

اے اخوان عزیز! میں جس چیز کے اعلان سے نہیں ڈرتا' تعجب ہے اگر آپ اس کی سماعت سے خوفزدہ ہوں۔ میں کہتا ہوں کہ ہر اس مومن پر جو اللہ اور اس کے رسول اور اس کی کتاب پر ایمان رکھتا ہے' فرض ہے کہ آج جہاد فی سبیل اللہ کے لیے اٹھ کھڑا ہو۔ سب سے پہلا جہاد اس کے لیے جہاد مال ہے' اور اس کے بعد اگر ضرورت ہو تو جہاد نفس و جان۔ مال و متاع کو بھیج دو اور اپنی جانوں کو ہتھیلیوں پر تیار

رکھو۔ آج اگر ضرورت پیش نہ آئی تو کیا مضائقہ ہے' کل کوئی نہ کوئی صورت نکل آئے گی۔ یہ متاع ایسی نہیں' جسکی قربانی بیکار جائے۔

بطاعت کوش اگر عشق بلا انگیز میخواہی

متاعے جمع کن' شاید کہ غارتگر شود پیدا

مسلمانو! یاد رکھو کہ اوروں کی جانیں ان کے قبضوں میں ہونگی' مگر ہم مسلمانوں کی جانیں ہمارے اختیار میں نہیں ہیں۔ اسلام ایک خرید و فروخت ہے' جو ناقص کو لیتا ہے اور کامل کو دیتا ہے' فنا کو خریدتا ہے اور بقا اس کی قیمت میں دیتا ہے۔ ہم نے جس وقت اقرار کیا کہ ہم مسلم ہیں' اسی دن اس کا بھی اقرار کرلیا کہ ہماری جانیں اسلام کے ہاتھ بک گئیں۔ اسلام کے معنی ہی یہ ہیں کہ خدائے واحد کے آگے اپنی گردن کو جھکا دینا۔ پھر خواہ وہ اسے دوستوں کی گود میں ڈال دے' یا دشمنوں کی تیغ کے سپرد کرے۔ کیا نہیں دیکھتے کہ جب حضرت ابراہیم نے حکم الٰہی کے آگے سر جھکا دیا اور حضرت اسماعیل کی گردن قربان ہونے کے لیے مستعد ہوگئی' تو اس وقت فرمایا:

"پس جب وہ دونوں مسلم ہوئے اور ابراہیم نے اسماعیل کو پیشانی کے بل زمین پر گرا دیا (تاکہ ذبح کرے) تو ہم نے پکارا کہ اے ابراہیم! (بس کرو) تم نے اپنا خواب پورا کر دکھایا۔" (43)

2

افتتاح مدرسہ اسلامیہ

کلکتہ' 13 دسمبر 1920ء

مہاتما جی!

آپ نے ہندوستان کے مختلف مقامات میں ترک موالات کا جوش دیکھا ہے۔ بہت سے کالجوں اور سکولوں سے طلبہ کا مقاطعہ ملاحظہ کیا ہے اور پھر بہت سی افسوسناک عہد شکنیاں بھی دیکھی ہیں۔ میں ان رنجدہ واقعات کا ذکر نہ کروں گا' جو جھانسی اور علی گڑھ میں ہو چکے ہیں' تاہم اتنا ضرور کہوں گا کہ اس وقت طلبہ کی جو جماعت آپ کے سامنے ہے اور جس کی آنکھیں آپ کے چہرے پر گڑی ہوئی ہیں' یہ وہ جماعت ہے جس نے جو عہد اول دن کیا تھا' اب تک اس پر پوری طرح قائم ہے۔ یہ وہ جماعت ہے' جس نے دین کو دنیا پر ترجیح دی ہے۔ یہ وہ جماعت ہے جس نے مدرسہ عالیہ کلکتہ کی شاندار عمارت اور اس کے عالیشان ہوسٹل کو' جس میں بہترین سامان آرائش و آسائش مہیا تھا' محض احکام الٰہی کی پابندی اور سچے ہندوستانی کی حیثیت سے چھوڑ دیا' اور اس طرح وہاں سے نکلی ہے کہ اسے یہ بھی خبر نہ تھی کہ کہاں جا رہی ہے اور کہاں رہے گی' یہ وہ جماعت ہے جس نے ترک موالات کی راہ میں ہر طرح کی تکالیف برداشت کی ہیں۔ بھوک پیاس کی سختی جھیلی ہے اور جاڑے کی طویل راتیں ٹھنڈی زمین پر گزاری ہیں' اور اب تک گزار رہی ہے کیونکہ سونے کے لیے اب تک اس کے پاس چارپائیاں نہیں ہیں۔

اس سلسلے میں یہ بھی بتا دینا ضروری ہے کہ جس مدرسے میں آپ اس وقت موجود ہیں' اس کی تاسیس بالفعل ترک موالات کے سلسلے میں ہوئی ہے' مگر اس کا خیال عرصے سے میرے ذہن میں تھا اور میں مدت سے خیال کررہا تھا کہ عربی تعلیم کو جو صرف صوبہ بنگال ہی میں سرکاری غلامی میں ہے' آزاد کراؤں۔ چنانچہ اس کے متعلق اس کے متولیوں سے بارہا گفتگو ہوئی۔ یہاں تک کہ بالآخر یکم ربیع الاول کو اس کی تجدید ہوگئی۔ میں نے تجدید کا لفظ اس لیے استعمال کیا ہے کہ یہ مدرسہ اس وقت سے قائم ہے' جب سے جامع مسجد بنی ہے۔ البتہ اپنی اس نئی زندگی میں اسے مکتب کے درجے سے ہٹا کر اعلیٰ تعلیم گاہ کی حیثیت میں کر دیا گیا ہے۔

میں چاہتا ہوں کہ اس موقع پر آپ کو اس جماعت کی ایک ممتاز خصوصیت کی طرف توجہ دلاؤں۔ ہندوستان میں سرکاری تعلیم نے جو نقصانات ہمارے قومی خصائل و اعمال کو پہنچائے ہیں' ان میں سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ تحصیل علم کا مقصد اعلیٰ ہماری نظروں سے محجوب ہوگیا ہے۔ علم خدا کی ایک پاک امانت ہے اور اس کو صرف اس لیے ڈھونڈھنا چاہیے کہ وہ علم ہے' لیکن سرکاری یونیورسٹیوں نے ہم کو ایک دوسری راہ بتلائی ہے۔ وہ علم کا اس لیے شوق دلاتی ہے کہ بلا اس کے سرکاری نوکری نہیں مل سکتی۔ پس اب ہندوستان میں علم کو' علم کے لیے نہیں' بلکہ معیشت کے لیے حاصل کیا جاتا ہے۔ یہ بڑی بڑی تعلیمی عمارتیں' جو انگریزی تعلیم کی نوآبادیاں ہیں' کس مخلوق سے بھری ہوئی ہیں؟ مشتاقان علم اور شیفتگان حقیقت سے؟ نہیں' ایک مٹھی گیہوں اور ایک پیالا چاول کے پرستاروں سے' جن کو یقین دلایا گیا ہے کہ بلا حصول تعلیم کے وہ اپنی غذا حاصل نہیں کرسکتے۔

لیکن میں آپ کے علم میں یہ حقیقت لانی چاہتا ہوں کہ علم کی اس عام توہین و تذلیل کی تاریکی میں بچی علم پرستی کی ایک روشنی برابر چمکتی رہی ہے۔ یہ ہندوستان کے طالبین علم کی وہ جماعتیں ہیں' جو اسلام کے قدیم مذہبی علوم اور مذہبی زبان کے فنون' مختلف عربی مدرسوں میں حاصل کررہی ہیں۔ آپ یقین کیجئے کہ بجا طور پر آج صرف یہی ایک جماعت علم کی سچی پرستار کہی جاسکتی ہے۔ ان لوگوں کو معلوم ہے کہ انگریزی

تعلیم وسیلہ رزق ہے۔ یہ جانتے ہیں کہ انگریزی تعلیم کی ڈگریاں لے کر بڑے بڑے عہدوں اور نوکریوں کے دروازوں میں قدم رکھ سکتے ہیں' اور ایک کلرک سے لے کر لارڈ سنہا کی نوکری تک صرف انگریزی تعلیم ہی سے مل سکتی ہے۔ ان کو پوری طرح یقین ہے کہ عربی تعلیم کو آج کوئی نہیں پوچھتا' حتیٰ کہ روٹی بھی اسکے ذریعہ نہیں مل سکتی۔ پھر بھی ان کے دلوں میں ایک مخفی مگر طاقتور جذبہ موجود ہے' جو انگریزی تعلیم کی طرف جانے نہیں دیتا' اور اس کسمپرسی میں بھی عربی تعلیم ہی کے لیے اپنی پوری زندگی وقف کر دیتے ہیں۔

یہ جذبہ بجز علم پرستی اور رضائے الٰہی کے اور کوئی دنیوی غرض نہیں رکھتا' اور اس لیے ہندوستان بھر میں' علم کو علم کے لیے' اگر کوئی پڑھنے والی جماعت ہے' تو وہ عربی مدارس ہی کی جماعت ہو سکتی ہے۔ علی گڑھ کے کسی طالب علم نے کالج نہیں چھوڑا۔ جب تک دو دو گھنٹے تک مجھ سے رد و کد کر کے اطمینان نہیں کرا لیا کہ سرکاری تعلیم چھوڑنے کے بعد بھی وہ روپیہ کما سکیں گے' حتیٰ کہ بعضوں نے مجھ سے اس کی ذمہ داری بھی طلب کی۔ لیکن میں آپ کو بتلاتا ہوں کہ ان طلبہ میں ایک بھی ایسا نہیں ہے جس نے یہ سوال کیا ہو' بلکہ جس وقت ان کو احکام شرع بتلا دیے گئے' فوراً اطاعت کا سر جھکا دیا اور سب کچھ چھوڑ دینے کے لیے تیار ہو گئے۔

میں نے اس چیز کی طرف آپ کو اس لیے توجہ دلائی ہے کہ جوہر شناس' صرف جوہری ہی ہو سکتا ہے' اور میں جانتا ہوں کہ آپ اخلاص اور ایثار کے جوہر شناس ہیں۔

3

خطبہ صدارت

مجلس خلافت

آگرہ' 25 اگست 1921ء

حضرات!

آپ کے صوبہ کی غالباً یہ تیسری مجلس خلافت ہے' جس کی صدارت کی خدمت کے لیے آپ نے ازراہ لطف و نوازش مجھ کو منتخب فرمایا ہے۔ میں اس لطف و عنایت کے لیے آپ تمام بزرگوں اور عزیزوں کا تہہ دل سے شکرگزار ہوں۔ اور امید کرتا ہوں کہ اس خدمت کے انجام دینے میں آپ تمام عزیزوں کی مساعدت میری مدد کرے گی اور اللہ تعالیٰ توفیق دے گا کہ اس کو بہتر امیدوں کے ساتھ ختم کروں۔

اس مجلس کا افتتاح کرتے ہوئے جن بیانات کی ضرورت تھی' میں سمجھتا ہوں کہ وہ کئی مرتبہ بیان میں آ چکے ہیں۔ بار بار ان کا تذکرہ کیا جا چکا ہے۔ بار بار مجلسوں میں وہ پیش ہو چکے ہیں۔ زبانوں پر بھی بار بار ان کا اعادہ ہو چکا ہے۔ قلم نے بھی بار بار ان کی تکرار کی ہے۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ ان مسائل کی نسبت اس وقت اور زیادہ تفصیل سے کام لینا بالکل غیر ضروری ہے۔ لیکن اگر اس امر کی ضرورت ہوتی کہ میں وقت کے مسئلوں کی نسبت' تحریک خلافت کی نسبت' آزادی ہند کی نسبت' آپ کی

خدمت میں گزارشات کرنا ضروری محسوس کرتا؟ جب بھی میں ایک ایسے شہر میں جیسا کہ یہ شہر ہے اور جیسی کہ اس شہر کی تاریخ ہے' میں سمجھتا ہوں کہ ان تمام بیانات کی جو انسان کی گویائی کر سکتی ہے' کچھ ضرورت نہ تھی' آپ سمجھتے ہیں کہ اس دنیا میں جس طرح خدا کی سچائی کے مختلف بھیس ہیں' خدا کی سچائی کے لیے مختلف نقاب ہیں۔ اگرچہ بھیس مختلف ہوتے ہیں' لیکن صورت مختلف نہیں ہوتی۔ اسی طرح سچائی کی بھی مختلف زبانیں ہیں اور سچائی ہمیشہ ان مختلف زبانوں سے اپنی فصاحت و بلاغت آپ کے کانوں تک پہنچاتی ہے۔

میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ سچائی کی زبان ایک تو وہ ہے' جس کا تعلق ہماری' آپ کی خدا کی دی ہوئی گویائی سے ہے' جو زبان سے تعلق رکھتی ہے' وہ آواز جو حلق سے نکلتی ہے' تو ایک گویائی تو وہ ہے' جو زبان سے تعلق رکھتی ہے' جس کے لیے زبان کو گویائی اور تکلم کی ضرورت ہے۔ لیکن اس دنیا میں ایک دوسری خاموش بلاغت اور گویائی بھی ہے' وہ گویائی کہ جس کے لیے کانوں کی ضرورت نہیں ہے کہ کان سنیں بلکہ اس گویائی کو آنکھوں کی ضرورت ہے' تاکہ وہ آنکھیں اس کا مطالعہ کریں۔

میں آپ کو یاد دلاتا ہوں کہ حقیقتاً یہ اس اٹھارہ مہینے کے گزرنے کے بعد' جو آپ کی اس تحریک کے بعد گزر چکے ہیں یعنی تحریک خلافت اور آزادی ہند کی تحریک پر گزر چکے ہیں' اگر ایک ایسی مجلس میں جو میرے چاروں طرف فراہم ہے' اس امر کی ضرورت ہے کہ اس کے آگے ماتم اور فریاد کی جائے' التجاؤں کا ہاتھ پھیلایا جائے' تمام حقائق و معارف کا دفتر کھولا جائے' تو میرے عزیزو! خاص کر وہ' جو شہر آگرہ کے باشندے ہیں' بلکہ جو ہندوستان کی گزشتہ تاریخ کے مدفن کے باشندے ہیں' اگر اب بھی ان کو ضرورت ہے خطبوں کی' تقریروں کی' تو وہ ان تقریروں کے لیے میری گویائی کا انتظار نہ کریں۔

آیئے' ہم اور آپ چشم تصور سے کام لیں' اور چند منٹوں کے لیے اس جمنا کے کنارے پہنچیں' جس کو آج ہی میں نے علی گڑھ سے آتے ہوئے دیکھا ہے۔ میں نے

اس جمنا میں اتنا پانی بھی نہ پایا۔ جتنا خون ان پانچ سالوں میں مسلمانوں کا ہو چکا ہے۔ اگر آپ وہاں میری ہمراہی کریں گے' تو میں آپ کے لیے ایک بہترین آواز کی زبان کو' ایک بہترین دفتر عبرت کو وہاں مہیا پاتا ہوں۔ وہاں زبان نہیں ہے' وہاں ایک مجسم فصاحت موجود ہے' وہاں ایک مجسم خطبہ موجود ہے۔ وہ جملہ عمارت موجود ہے جو ہندوستان کی گزشتہ عظمت پر ماتم کر رہی ہے۔ وہاں شاہجہاں کا مدفن اور آرام گاہ موجود ہے۔ اس سے بڑھ کر بھی کوئی زبان ہو سکتی ہے جو تمہارے کانوں کو مخاطب کر سکتی ہے؟ میں نہیں سمجھتا کہ اس آبادی میں' اس تہذیب کے مدفن میں' اس عالم کی قربان گاہ میں' میں کونسی چیز پیش کروں؟ اس زمین کے ایک ایک چپے کی خاموشی میں آواز موجود ہے۔ اس کے ایک ایک ٹوٹے ہوئے کھنڈر میں' ان ٹوٹی ہوئی اینٹوں میں' جن کا غبار ہوا میں اڑ رہا ہے' نصیحت موجود ہے۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ اس موقع پر میرا فرض ایک خطیب کا فرض نہیں ہے' ایک مقرر کا فرض نہیں ہے' البتہ میرا فرض ایک فریادی اور ماتمی کا فرض ہے' جو آپ کے آگے اس لیے نہیں آیا ہے کہ آپ کو کچھ سنائے' بلکہ ماتم کرے' اور آپ سے امید کرے کہ اگر آپ کی زندگی کے چند لمحے' آپ کے معاملات دنیا اجازت دیں' تو آپ بھی اس کے ماتم میں شریک ہوں۔

اٹھارہ مہینے کا زمانہ گزر چکا ہے کہ ہم نے اس سفر کا اعلان کیا تھا۔ اس اٹھارہ مہینے کے اندر تحریک خلافت کی کتنی منزلیں ہیں' جو ہمارے سامنے آئیں اور ہم طے کر چکے ہیں۔ میں اس وقت مسئلہ خلافت پر' مقامات مقدسہ پر' ہندوستان کی آزادی پر' جو مسلمانوں کے لیے ویسا ہی فرض شرعی ہے جیسے تحفظ و دفاع خلافت' میں مناسب نہیں سمجھتا کہ ان مسائل پر کچھ عرض کروں۔ اس کے لیے آپ کے پاس خاموش گویائی موجود ہے' جو آپ کے دلوں کو متنبہ کر سکتی ہے۔

اس وقت اس جلسے کا افتتاح کرتے ہوئے سب سے پہلے جو چیز ہمارے سامنے آتی ہے' وہ یہ ہے کہ آپ احتساب کی نظر ڈالیں اور اندازہ کریں کہ اس اٹھارہ مہینے کے اندر جو سفر پیش آیا تھا' اس میں ہم نے کونسی منزلیں طے کیں اور آگے کونسی منزلیں باقی ہیں!

اس بارے میں آپ کے صوبے کو علاوہ تاریخی خصوصیت کے ایک اور خصوصیت بھی حاصل ہے۔ وہ یہ ہے کہ اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کرتا' تو آپ ہی کا یہ صوبہ ہے جس کی کانفرنس میں سب سے پہلے اس عمل عظیم کا اعلان کیا گیا ہے جس کو آپ "نان کواپریشن" کے نام سے سن چکے ہیں۔ میرٹھ میں جو خلافت کا جلسہ ہوا' اس میں مہاتما گاندھی جی بھی شریک تھے۔ اس میرٹھ کے جلسہ میں سب سے پہلے ترک موالات کا' خلافت کمیٹی کی جانب سے بطور ایک عمل دفاع کے' بطور ایک عمل احتجاج کے اعلان کیا گیا۔ آپ ہی کا صوبہ ہے جس میں سب سے پہلے ہم نے اس سفر کے کوچ کا اعلان کیا۔ اٹھارہ مہینے گزر چکے' اٹھارہ مہینے کی مایوسیاں' کامیابیاں یہ سب گزر چکیں۔ اب ہمارا اولین فرض یہ ہے کہ ہم' اپنے سفر کو آگے بڑھاتے ہوئے' ایک نظر ڈالیں کہ ہم نے اب تک کتنا سفر طے کیا ہے! عجب نہیں کہ ہمارے سفر کے متعلق بہت سی کمزوریاں' شکوک و شبہات جو ہم میں سے بعض کے دلوں کے لیے موجب خلش ہوا کرتے ہیں' دور ہو جائیں۔ عجب نہیں کہ نظر ڈالنے کے بعد خودبخود ان کا ازالہ ہو جائے۔

اس پر نظر ڈالتے ہوئے سب سے پہلے آپ کو یہ حقیقت اپنے سامنے لانی چاہیے کہ اس سفر سے آپ کا مقصد کیا تھا' اور سعی و قربانی کا جو میدان آپ کے سامنے پیش آیا تھا' کیا تھا! اس میں ایک بڑی عالمگیر غلطی ہے۔ یہ میں نے اس لیے کہا ہے کہ وہ محض چند قوموں سے تعلق نہیں رکھتی' بلکہ نوع انسان کی غلطی ہے۔ انسان جب کسی کام کے لیے قدم اٹھاتا ہے' تو وہ اس میدان کو ڈھونڈتا ہے' جو اس کے وجود سے باہر ہو' اور جو سب سے پہلا میدان اس کے سامنے ہے' اس کو نظرانداز کر دیتا ہے' اس لیے ہم کو چاہیے کہ ہم متعین کریں کہ مقصد خلافت کے لیے مدافعت کا جو میدان تھا' وہ کون سا تھا! کیا وہ میدان وہ تھا' جو ہندوستان کے رقبے سے باہر ہے' یا اس کے علاوہ دوسرا میدان بھی تھا۔

اس بارے میں فی الحقیقت دو میدان تھے' جو آپ کو پیش آئے تھے۔ پہلا میدان' جو آپ کی کامیابی کے لیے اولین قیام گاہ تھا' وہ میدان ہندوستان سے باہر کا میدان ۔

تھا۔ وہ عراق و شام کا' ایشیائے کوچک اور سمرنا کا میدان نہ تھا' جہاں مسلمانوں کا خون بہہ چکا تھا۔ وہ میدان آپ کے ایمان کا' عزم کا' عمل کا میدان تھا۔ اور ان تمام لفظوں کی جگہ ایک لفظ بول دوں: وہ میدان آپ کے ملک کا تھا۔ جب تک آپ اسے فتح نہ کرتے' دنیا کی کامیابی آپ کا استقبال نہ کرسکتی۔ آپ کی کامیابی اس پر موقوف تھی کہ سب سے پہلے آپ اپنے پہلے میدان کو استوار کرتے۔ اپنے پہلے میدان کا ہتھیار اور سازوسامان سنوارا ہوتا۔ جب تک اسے فتح نہ کرتے' دوسرے میدان میں قدم نہ رکھ سکتے۔

تحریک خلافت کے لیے سب سے پہلے خود ہندوستان کا میدان تھا' خود مسلمانوں کا میدان تھا' ہندوستان میں بسنے والی قوموں کا میدان تھا۔ سب سے پہلی منزل جو آپ کو پیش آئی' وہ تھی جس میں آپ کی تحریک محض اپنی زندگی کی ابتدائی گھڑیاں کاٹ رہی تھی جس وقت بے چارگی کا یہ حال تھا کہ ہزاروں زبانیں موجود تھیں' جن پر خلافت کا نعرہ تھا' لیکن کوئی متفقہ میدان عمل آپ کے سامنے نہ تھا۔ مجالس کے مقصد سے یہ معاملہ آگے نہیں گزرا تھا۔ وہ ابتدائی گھڑیاں آج تحریک خلافت پر گزر چکی ہیں' جب یہ معاملہ محض دلوں میں تھا۔ اس سے زیادہ اور کوئی قوت اس کو حاصل نہیں ہوئی تھی۔ اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ ہم کو اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم و توفیق فرمائی کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ باوجود ہماری درماندگی کے' ہمارے ترک عمل کے' عدم استحقاق کے' اللہ کے فضل و رحمت نے اپنا دروازہ کھول دیا اور ہم کو کامیابی عطا کی' اور نتیجہ یہ نکلا کہ چند مہینوں کے اندر ہم نے یہ پہلا میدان فتح کرلیا۔ جب دنیا کی آنکھ کھلی' تو اس نے محسوس کیا کہ یہ کسی محدود جماعت کی تحریک نہیں ہے' بلکہ ہندوستان کا متفقہ مسئلہ ہے۔ یہ پہلا میدان تھا' جو تحریک کو پیش آیا اور اس کو کامیابی کے ساتھ اس تحریک نے فتح کرلیا۔

اس کے بعد دوسری منزل ہے' جو اس تحریک کو پیش آئی۔ اس تحریک کی فتح مندی کے لیے اس امر کی ضرورت تھی کہ یہ تحریک کسی خاص جماعت کی تحریک نہ ہو' بلکہ یہ اس ملک کے لیے ملکی تحریک بن جائے۔ یہ دوسری منزل تھی' جو تحریک خلافت

کو پیش آئی۔ ضرورت تھی کہ یہ سات کروڑ دلوں کو گھر نہ بنائے' بلکہ بتیس کروڑ کے دلوں میں اپنا گھر بناتی۔ یہ ہندو بھائی ہمارے کندھے سے کندھا جوڑ کر کھڑے ہو جاتے اور ان کی ہمدردی بھی اس تحریک میں شامل ہو جاتی۔ اس لیے نہیں کہ فی الحقیقت مسلمانوں کے مطالبات کی کامیابی اس چیز پر موقوف تھی کہ ہم اپنے بھائیوں کو اس مدد کی زحمت دیتے۔ ہم میں سے ہر شخص جس کے دل میں ایمان موجود ہے' اس کو یقین ہونا چاہیے کہ اس دنیا میں کسی مقصد کی کامیابی محض انسانوں کی تعداد پر موقوف نہیں ہے' بلکہ ہر تحریک کی کامیابی' ایمان اور عمل کی طاقت پر موقوف ہے۔

اس سے پہلے بار بار میں اعلان کر چکا ہوں اور آج بھی اعلان کرتا ہوں کہ درحقیقت اس مقصد کی کامیابی کے لیے ہندوستان کے کسی رقبے میں سے' کسی ایک بھائی کو بھی' اس امر کی زحمت دینے کے لیے ہم مجبور نہ تھے کہ وہ ہم کو مدد دیتا۔ اگر مسلمان کامیابی حاصل کرسکتے تھے تو اللہ پر اعتماد کرکے' اللہ کی نصرت پر' اپنے ایمان پر اعتماد کرکے۔ لیکن بلاشبہ جب کہ مسئلے کی صورت کا یہ حال تھا تو اس کے ساتھ ہی اس امر کی ضرورت تھی کہ تحریک خلافت کے ضمن میں خود ہندوستان کا مسئلہ حل نہیں ہو سکتا تھا' جس وقت تک ملک میں کوئی عام تحریک پیدا نہ ہوتی' اور فی الحقیقت تحریک خلافت کی کامیابی میں ایک خوبی یہ ہے کہ اس نے ایسے طاقتور ہنگامے کے ساتھ کل ہندوستان کے مسئلے کو زندہ کردیا' جو چالیس سال کی کوشش سے ہندوستان کو نہ ملا تھا۔

اس کامیابی کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوستان میں صرف تحریک خلافت ہی موجود نہیں ہے' بلکہ ہندوستان کا مسئلہ بھی پوری طاقت کے ساتھ زندہ ہوگیا ہے۔ اس مسئلے کی کامیابی کے لیے اس امر کی ضرورت تھی کہ یہ تحریک صرف سات کروڑ کی تحریک نہ ہوتی بلکہ اس کے ضمن میں عام ہندوستان کی سوئی ہوئی قسمت جاگ اٹھتی اور عام مسئلہ پیدا ہو جاتا۔ اگر آپ کے دل مایوسی میں ڈوبے ہوئے ہیں تو میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ امید دلاؤں کہ یہ مسئلہ خلافت کی دوسری منزل ہے' جس میں آپ نے کامیابی حاصل کی ہے۔

میں اس منظر رفاقت کو ایک منٹ کے لیے فراموش نہیں کرسکتا کہ جوں ہی مسئلہ

خلافت ہندوستان میں چھیڑا گیا۔ ہندوستان کے تمام گوشوں سے ہمارے ہندو بھائیوں نے کامل صداقت کے ساتھ تحریک خلافت کا استقبال کیا اور اپنی تمام تر ہمدردیاں اس کے لیے وقف کردیں۔

لیکن جہاں تک اس کا تعلق ایک ملکی مسئلے سے ہے' وہاں تک کہا جا سکتا ہے کہ اس مسئلہ کے محرک چند رفقاء تھے۔ میں نام لوں گا مہاتما گاندھی جی کا کہ وہ اس تحریک کے اولین اور سب سے بڑے قابل عزت رفیق تھے کہ جنھوں نے اس تحریک کا ساتھ دیا۔ اس وقت تک اس مسئلے نے تمام ہندوستان کے قومی مسئلے کی صورت اختیار نہیں کی تھی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے یہ سامان کر دیا کہ تحریک خلافت کی روشنی نے ہندوستان کے چراغ کو روشن کردیا۔ یہ مسئلہ خلافت کی تیسری فتح مندی تھی۔ جو اس کو ہندوستان کے میدان میں حاصل ہوئی۔

ہندوستان کے لیے' ہندوستان کی آزادی کے لیے صداقت و حق پرستی کے بہترین اور اعلیٰ فرض ادا کرنے کے لیے ہندوستان کے ہندو مسلمانوں کا اتفاق اور ان کی یکجہتی ضروری ہے۔ میرا قصد نہ تھا کہ مستقل طور پر اس مسئلے کے متعلق کچھ کہوں' کیونکہ الحمدللہ یہ مسئلہ عمل تک پہنچ چکا ہے۔ اب اس امر کی ضرورت نہیں ہے کہ اس پر بحث کی جائے۔ لیکن چونکہ تحریک خلافت کی تیسری منزل کے ضمن میں یہ مسئلہ چھڑ گیا ہے' لہٰذا آپ اجازت دیں گے کہ میں کچھ اس کے متعلق کہہ دوں۔

ہندو مسلمانوں کے اتحاد کا مسئلہ اگرچہ اپنے سیاسی مسئلہ ہونے کے لحاظ سے ہندوستان کی نجات کے لیے ایک ضروری مسئلہ رہا ہے' لیکن یہ مسئلہ آج تحریک خلافت کی بدولت ہی ہمارے سامنے نہیں آیا ہے۔ ہندوستان میں ایسے لوگ موجود تھے جنھوں نے تحریک خلافت کی بنا پر نہیں' بلکہ چونکہ انھوں نے اپنی ہدایت کے لیے' اپنی ہر فکر اور ہر کام کے لیے صرف ایک ہی راستہ ہدایت کا اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا تھا' اس لیے کہ اسلام کے اصولوں نے' اسلام کی تعلیم نے' ان کو مجبور کیا تھا کہ اس کا ہندوستان میں اعلان کریں۔

تحریک خلافت سے تقریباً دس سال پہلے میں نے اس حقیقت کو محسوس کیا کہ اگر

ہندوستان کے مسلمان اپنے بہترین شرعی اور اسلامی فرائض انجام دینا چاہتے ہیں تو بحیثیت ہندوستانی ہونے کے انہیں انجام دینا چاہیے۔ یہ بھی ایک سچی حیثیت ہے۔ مگر سب سے پہلی حیثیت یہ ہے کہ بحیثیت مسلمان ہونے کے مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اپنے ہندو بھائیوں کے ساتھ ہو جائیں۔ میں اپنے سینے میں وہ دل رکھتا ہوں جس کے لیے ہدایت کی کوئی شعاعیں نہیں ہو سکتیں جو فاطرالسموات نے نہ بھیجی ہوں۔ میرا عقیدہ ہے کہ ہندوستان میں ہندوستان کے مسلمان اپنے بہترین فرائض انجام نہیں دے سکتے۔ جب تک وہ احکام اسلامیہ کے ماتحت ہندوستان کے ہندوؤں سے پوری سچائی کے ساتھ اتحاد و اتفاق نہ کرلیں۔ یہ اعتقاد قرآن مجید کی نص قطعی پر مبنی تھا۔ فی الحقیقت یہ وہ چیز ہے' جو اگر ایک طرف ترک موالات کے اصول کو ہمارے سامنے نمایاں کرتی ہے' تو دوسری طرف ہندو مسلمانوں کے مسئلہ کو واضح کرتی ہے۔

ترک موالات کے ضمن میں قرآن مجید کے احکام کیا ہیں؟ موالات' ولایت سے ہے۔ ولایت کے معنی ہیں محبت اور اعانت اور نصرت کے۔ تو ترک موالات کے معنی ہوئے مددگاری کے ہر طرح کے تعلقات کو منقطع کرلینا' جب تک وہ جماعت اپنے ظلم سے باز نہ آئے۔ قرآن مجید نے دنیا کی تمام غیر مسلم قوموں کی دو قسمیں قرار دی ہیں۔ یہ تقسیم سورۂ ممتحنہ میں موجود ہے۔ قرآن مجید نے بتایا ہے کہ دو قسم کی قومیں دنیا میں پیش ہو سکتی ہیں : ایک تو وہ غیر مسلمان قومیں' جو مسلمانوں پر حملہ نہیں کرتیں' مسلمانوں کی حکومت اور خلافت پر حملہ نہیں کرتیں۔ ایسی غیر مسلم قومیں جنہوں نے نہ تو حملہ کیا ہے اور نہ مسلمانوں کی آبادیوں اور بستیوں پر حملہ کرنا چاہتی ہیں' ایسی قوموں کے لیے قرآن ایک لحہ کے لیے بھی مسلمانوں کو نہیں روکتا کہ ان کے ساتھ مصالحت کریں اور بہتر سے بہتر اور اچھے سے اچھا سلوک کریں۔ لیکن جن غیر مسلمان قوموں کا یہ حال ہے کہ وہ مسلمان قوموں کے ساتھ قتل کریں' مسلمانوں کو ان کی بستیوں سے نکالیں' ایسی غیر مسلمان قوموں کی نسبت بلاشبہ قرآن مجید کی تعلیم یہ ہے کہ ان کے ساتھ تعلقات منقطع کرلیے جائیں۔ اور قرآن مجید کا یہ قانون کامل انصاف اور عدالت پر مبنی ہے۔ جس کو خود خدا کی فطرت نے قائم کیا ہے۔ اس عالمگیر اور ہمہ گیر عدالت

کی بنا پر قرآن مجید کا یہ اعلان ہے کہ ایسی غیر مسلمان قوموں کے ساتھ مسلمان کوئی ایسا تعلق نہ رکھیں' جو محبت' دوستی' صلح و وفاداری اور کسی طرح کی اعانت و نصرت کا ہو۔ یہ حکم قطعی متعدد آیات قرآنی میں موجود ہے۔ سورۂ ممتحنہ میں جو کچھ ارشاد فرمایا ہے' اس کا ترجمہ یہ ہے کہ "اللہ تعالیٰ اس بات سے نہیں روکتا کہ جن نامسلمانوں نے تم سے نہ لڑائی لڑی ہے' نہ قتل کیا ہے' نہ مسلمانوں کو ان کی آبادیوں سے نکالا ہے' اگر مسلمان ایسے نامسلمانوں کے ساتھ اتحاد کریں' ہر طرح کی نیکی کا بہتر سے بہتر سلوک جو وہ کر سکتے ہیں کریں۔" (۱) ایک منٹ کے لیے قرآن انہیں اس سے نہیں روکتا۔ قرآن دنیا میں دشمنی کا پیام نہیں لایا ہے' وہ تو محبت کا پیام لایا ہے۔ اس لیے محبت کے قائم رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ ٹھیک اسی قانون کے مطابق' جس کی رو سے عدالت مجرم کو پھانسی کے تختہ پر کھڑا کرتی ہے' مسلمان بھی ایسی غیر مسلمان قوموں کے ساتھ کوئی تعلق محبت' اعانت اور نصرت کا نہیں رکھ سکتے۔ جو ان کی دشمن ہوں ... اس تقسیم کی رو سے آپ کے سامنے ترک موالات کا مسئلہ واضح طور پر آگیا۔

گزشتہ پانچ سال کے اندر دنیا میں وہ واقعات ظہور پذیر ہوئے ہیں' جن کے بعد برٹش گورنمنٹ مسلمانوں کے مقابلہ میں "فریق محارب" ہوگئی ہے' یعنی لڑنے والی فریق ہے۔ میں نے فریق محارب پر زور دیا ہے۔ بہت سے لوگ یہاں محارب اور غیر محارب پر زور نہیں دیتے' میں نے غیر محارب اور محارب پر زور دیا ہے۔ برٹش گورنمنٹ' اسلام اور مسلمانوں کے مقابلے میں ازروئے شریعت فریق محارب ہوگئی ہے۔ اس لیے بموجب اسی نص قطعی اور بموجب گیارہ سے زیادہ آیتوں اور اسلام کے قانون کے' مسلمانوں کے لیے حرام اور ناجائز ہوگیا' فسق ہوگیا اور نفاق ہوگیا' مسلمانوں کے لیے یہ قریب قریب کفر ہوگیا کہ وہ برٹش گورنمنٹ سے اپنی استطاعت کے اندر محبت و اعانت' وفاداری اور اطاعت کا کوئی تعلق رکھیں' اگر وہ کوئی تعلق اس طرح کا رکھیں گے' تو ایک منٹ کے لیے ان کو یہ حق نہ ہوگا کہ وہ اپنے آپ کو مسلمانوں کی صف میں جگہ دیں۔ قرآن نے کہا ہے کہ جو مسلمان ایسے وقتوں میں' ایسی حالتوں میں اس محارب قوم کے ساتھ اور اس کے شرکاء کے ساتھ رشتہ موالات رکھتا ہے' اگرچہ

وہ زمین میں اپنے آپ کو مسلمان کہے، لیکن اللہ کے نزدیک اس کا شمار مومنوں میں نہ ہوگا، کفار میں ہوگا۔

آج بھی میں یہی اعلان کرتا ہوں، اس لیے کہ صلح کی خبریں اڑ رہی ہیں۔ ہر مسلمان کے قلب پر یہ حقیقت نقش ہے اور ہونا چاہیے کہ جب تک انگریزی حکومت اپنے اس ابلیسانہ گھمنڈ سے باز نہ آجائے، مسلمانوں کے مطالبات شرعی کو پورا نہ کردے، عراق کی سرزمین اس کی مداخلت سے پاک نہ ہو جائے، ایشیائے کوچک میں اس کی کوئی طاقت مخالفت نہ کرے، قسطنطنیہ سے تمام شرائط اور پابندیاں اٹھالی نہ جائیں، ہندوستان کو آزادی نہ دی جائے، اس وقت تک انگریزی گورنمنٹ مسلمانوں کے مقابلے میں فریق محارب ہے۔ اگر مسلمانوں کے دل میں ایک آخری چنگاری بھی ایمان کی باقی ہے، تو کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ صلح یا صفائی کا ہاتھ انگریزوں کی طرف بڑھا سکے۔ وہ مسلمان اپنے ان آباد شہروں کو چھوڑ دے، جنگلوں میں چلا جائے، وہاں سانپ اور بچھوؤں کے ساتھ صلح کرے، مگر انگریزی گورنمنٹ کے ساتھ صلح نہیں کرسکتا۔

لیکن ہاں، جس آن اور جس لمحہ حالات میں تبدیلی ہو جائے، حالات پلٹ جائیں، جو فریق محارب ہے، وہ فریق محارب نہ رہے، بلکہ اس حکم میں آجائے جس کو تم سن چکے ہو، یعنی جن لوگوں نے مسلمانوں سے قتال نہیں کیا ہے، ان کی آبادیوں پر قبضہ نہیں کیا ہے، ان کو دیس نکالا نہیں دیا ہے، اور یہی نہیں کہ خود ظلم نہ کیا ہو، بلکہ دوسروں کو بھی ظلم پر نہ ابھارا ہو، جس آن برٹش گورنمنٹ میں یہ حقیقی تبدیلی ہو جائے گی، حقیقی تبدیلی دھوکے کی نہیں، جس میں چالیس سال سے ہندوستان الجھا ہوا ہے، بمجرد حالات کی تبدیلی کے حکم بدل جائے گا اور مسلمانوں میں سے ہر فرد تیار ہوگا کہ صلح و اتفاق کا ہاتھ بڑھائے، لیکن جب تک برٹش گورنمنٹ فریق محارب ہے، وہ خلافت کے مطالبات پورے نہیں کرتی۔ جب تک ہندوستان کو سچے اور حقیقی معنوں میں سوراج نہیں دیتی، یعنی کوئی نئی اور کسی قدر ترقی یافتہ ریفارم کی اسکیم نہیں بلکہ سوراج، جس وقت تک انگریزی گورنمنٹ ان تمام امور کو پورا نہیں کرتی، اس وقت

تک مسلمانوں کے لیے اس کا وجود' اس کے گورنروں کا وجود' اس کی عدالتوں کا وجود' ظالم و ستم کی کارروائیاں ہیں۔ ان کا وجود لڑنے والوں کا وجود ہے۔ مسلمان کے لیے ممکن ہے کہ بچھوؤں کو ہتھیلی پر لے کر دودھ پلائے' مگر یہ ممکن نہیں ہے کہ انگریزوں کے ساتھ صلح کرلے۔

لیکن جیساکہ میں نے عرض کیا' یہ ایک ضمنی حقیقت تھی۔ اصل مسئلہ' جس پر میں گام فرسائی کررہا تھا' یہ تھا کہ ہندوستان کی نجات کے لیے' ہندوستان میں مسلمانوں کے بہترین فرائض کے انجام دینے کے لیے ہندو مسلم اتحاد ضروری ہے۔ یہ میرا عقیدہ ہے' جس کا اعلان میں 1912ء میں' الہلال کے پہلے ہی نمبر میں' (2) کرچکا ہوں۔ میں امید کرتا ہوں کہ ایسے لوگ موجود ہوں گے' جنھوں نے الہلال کو فراموش نہ کیا ہوگا۔

الہلال کے پہلے نمبر میں جس بڑے نمایاں مقصد کا اعلان کیا گیا تھا؟ میں فخر کے ساتھ اظہار کرنا چاہتا ہوں کہ وہ ہندو مسلمانوں کا اتفاق تھا۔ میں نے مسلمانوں کو دعوت دی تھی کہ احکام شرع کی رو سے مسلمانوں کے لیے اگر کوئی فریق ہوسکتا ہے' جو نہ صرف ایشیا کو' مشرق کو' بلکہ اس تمام کرۂ ارض کی سچائی کو آج چیلنج دے رہا ہے' اس کو مٹا رہا ہے' جس کے غرور سے اللہ کی عالمگیر صداقت کو سب سے بڑا خطرہ ہے' وہ برٹش گورنمنٹ کے سوا کوئی دوسری طاقت نہیں ہے۔ اس لیے ہندوستان کے مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ احکام شرع کو سامنے رکھ کر' حضور پیغمبر اسلام ﷺ کے اس اسوۂ حسنہ کو پیش نظر رکھ کر' جو انھوں نے اہل مدینہ اور بت پرست لوگوں سے مصالحت کرتے ہوئے دکھایا' وہ نمونہ جو خود جناب سرور کائنات نے عملاً" پیش کیا ہے اور عملاً و حکماً" جو تعلیم قرآن نے دی ہے' ہندوستان کے مسلمانوں کا فرض شرعی ہے کہ وہ ہندوستان کے ہندوؤں سے کامل سچائی کے ساتھ عہد و محبت کا پیمان باندھ لیں اور ان کے ساتھ مل کر ایک نیشن ہو جائیں۔ میرے الفاظ یہ تھے کہ ہندوستان کے سات کروڑ مسلمان' ہندوستان کے بائیس کروڑ ہندو بھائیوں کے ساتھ مل کر ایسے ہو جائیں کہ دونوں ملکر ہندوستان کی ایک قوم اور نیشن بن جائیں۔ اب میں مسلمان بھائیوں کو سنانا چاہتا ہوں کہ خدا کی آواز کے بعد سب سے بڑی آواز جو ہو سکتی ہے' وہ

محمد ﷺ کی آواز تھی' اس وجود مقدس نے عہد نامہ لکھا۔ جس پہ اس کے الفاظ ہیں۔ انہ امۃ واحدۃ (1) ہم ان تمام قبیلوں سے جو مدینہ کے اطراف میں بستے ہیں' صلح کرتے ہیں' اتفاق کرتے ہیں اور ہم سب مل کر ایک امتہ واحدۃ بننا چاہتے ہیں۔ امتہ کے معنی ہیں قوم اور نیشن' اور واحدہ کے معنی ہیں ایک۔

اگر میں نے اپنی اپیل میں کہہ دیا کہ ہندوستان کے مسلمان اپنا بہترین فرض اسی وقت انجام دیں گے جب وہ ہندوؤں کے ساتھ ایک ہو جائیں گے۔ تو یہی وہ لفظ ہے' جو اللہ کے رسول نے بھی اس وقت لکھوایا تھا کہ ہم سب مل کر قریش کے مقابلے میں ایک نیشن ہو جائیں گے۔ جن مقاصد کی بنا پر جناب سرور کائنات نے یہ عہد کیا تھا' اس سے زیادہ وجوہ آج آپ کے لیے موجود ہیں۔ اگر اس وقت صرف قریش مکہ کی ایک جماعت تھی' جو اسلام کو غربت میں دھمکی دے رہی تھی' تو آج اس غربت ثانیہ میں صرف مٹھی بھر قریش نہیں' بلکہ کرۂ ارض کی وہ تمام بسنے والی قومیں' اسلام کو مٹانا چاہتی ہیں۔ اگر رسول خدا مٹھی بھر قریش مکہ کے مقابلے میں' ابوسفیان کے مقابلے میں' اطراف مدینہ کے تمام قبائل سے اتفاق کر سکتے تھے' تو آج اس عظیم الشان قوت کے غرور' گھمنڈ' خونخواری کے مقابلے میں جو تمام مشرق کی آزادی کو پامال کرنا چاہتی ہے' کیا ہندوستان کے مسلمانوں کا یہ فرض ہے کہ اپنے بائیس کروڑ ہندوؤں کے ساتھ مل کر ایک ہو جائیں۔

میں یہ سب کچھ کہنے پر مجبور ہوں' کیونکہ یہ ایک نہایت ضروری پہلو ہے اور میں آپ سے معافی کا خواستگار ہوں' اگر ایک دو منٹ ان بحثوں کے الجھاؤ میں صرف ہو جائیں۔ میں اس موقع پر' اس جلسہ میں' جس میں خوش قسمتی سے صاحب علم بھی تشریف فرما ہیں اور جن کی موجودگی میرے لیے موجب تقویت ہے' میں ان اہل علم کو توجہ دلاؤں گا کہ اگر کسی بزرگ کے دل میں یہ خدشہ پیدا ہو جائے کہ سورۂ ممتحنہ کی تقسیم منسوخ ہے' ان کے دل میں یہ شبہ پیدا ہو جائے کہ یہ آیت منجملہ ان آیات کے شمار کی جاتی ہے' جن کو آیت سیف نے منسوخ کر دیا۔ ممکن ہے' ان کے دل میں یہ خلش پیدا ہو کہ یہ آیت منسوخ ہو چکی ہے' تو پھر اس سے استدلال کیونکر درست

ہوسکتا ہے۔ میں بلا اس طرف اشارہ کیے ہوئے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ معاملہ نازک ہے' ضرورت ہے چشم بصیرت کی' محض اوراق گردانی کافی نہ ہوگی۔ میں سب سے پہلے ان کو یاد دلاؤں گا کہ ایک نسخ اصولیوں کا ہے اور ایک نسخ قدماء کا ہے۔ اصولیوں نے جو محدود تعریف کردی ہے نسخ کی' وہ نسخ کے اسلاف ان صورتوں میں نہیں کرتے۔ ہر وہ حکم جس کا صرف تعلق اور عموم پر کوئی اثر پڑے' قدماء اور مختلف صدر اول کی اصطلاح میں استدلال نسخ کہا جاتا تھا۔

بلاشبہ اس آیت کا حکم منسوخ ہوا' مگر کن معنوں میں ہوا؟ یہ حکم منسوخ ہوگیا' صرف جزیرۃ العرب کے لیے' مشرکین عرب کے لیے' یہ ان احکام کے لیے نہیں جو تمام دنیا کی مشرک اقوام کے لیے ہیں۔ بلکہ یہ ان مخصوص احکام میں سے ہے جو مخصوص ہوگیا ہے عرب کے لیے۔ امام شافعی اس طرف گئے کہ جزیرۃ العرب کے علاوہ اور تمام دنیا میں جتنی قومیں موجود ہیں' ان سے جزیہ نہیں لیا جا سکتا۔ مگر جمہور اس طرف گئے ہیں کہ یہ حکم صرف جزیرۃ العرب کے لیے ہے اور دنیا کی اور تمام قوموں کے ساتھ مسلمان صلح کرسکتے ہیں' اگر وہ اس کے مستحق ہیں۔ جن مفسرین نے محض لفظ نسخ دیکھ کر اس کو منسوخات میں شمار کیا ہے۔ اگر اس کے وہ معنی پیش کرلیے جائیں گے' تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ پانچ سو سے زیادہ آیات' ہیں' جو آیہ منسوخہ سے منسوخ کی گئیں۔ مقصد یہ تھا کہ ایک لمحہ کے لیے یہ سمجھنا کہ یہ حکم آئندہ کے لیے منسوخ ہو چکا ہے' یہ ایسا کلمہ ہے کہ اس سے بڑھ کر احکام شرع کے جہل کا اور کوئی کلمہ نہیں ہوسکتا۔ یہ وہ حقیقت شرعی ہے' جس نے یہ حقیقت ہمارے آگے بے نقاب کی تھی۔ اگر اس میں ایک طرف اسلام کے فریق محارب کے مقابلے میں ترک سوالات بتایا گیا' تو دوسری طرف یہ حقیقت کھولدی کہ جن قوموں نے مسلمانوں پر حملہ نہیں کیا ہے' پیکار نہیں کیا ہے' ان کی آبادیوں پر قبضہ نہیں کیا ہے' ان کے لیے اللہ کی وہ شریعت جو دنیا میں ایک عالمگیر برادری' کا اور محبت کا سبق دے اور اس تمام کرۂ ارضی کو خدا کی محبت کا ایک گھرانہ بنانے کے لیے آئی ہے' محال قطعی ہے کہ وہ ایک منٹ کے لیے حکم دے کہ مسلمان دنیا کی کسی قوم کے ساتھ محبت اور عہد اتفاق نہ کریں۔

یہ جزیرۃ العرب کے لیے تھا۔ وہاں کے متعلق خدا کی مصلحتیں تھیں کہ اس ٹکڑے کو مسلمانوں کا مرکز بنانے کے لیے خاص کردیا جائے اور وہ مسلمانوں کے لیے ایسا گھر ہو کہ اگر دنیا کے تمام حصوں میں ان کی جڑ ٹوٹ جائے' تو یہ جڑ باقی رہے کہ ہمیشہ ابھر سکے۔ اس لیے ضرورت تھی کہ جزیرۃ العرب کو مسلمانوں کے لیے خاص کردیا جاتا۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ یہ آیت تمام دنیا کے لیے اور دنیا کی تمام قوموں کے لیے منسوخ ہو چکی ہے۔

بہرحال ہندو مسلمانوں کے اتفاق کے سلسلے میں آپ کے سامنے میں یہ حقیقت لانا چاہتا تھا کہ اگر مسلمانوں نے محبت کا ہاتھ' یکجہتی کا ہاتھ' رفاقت کا ہاتھ' اپنے ہمسایوں کی طرف بڑھایا ہے' تو ان کا یہ عمل محض کوئی وقتی اور دفاعی نہیں ہے' پولٹیکل چال نہیں ہے' بلکہ ان کو یقین کرنا چاہیے کہ مسلمانوں نے محبت کا آغوش خود نہیں کھولا ہے' بلکہ ان کے خدا نے' ان کے قوانین شریعت نے کھلوایا ہے' چونکہ اس کی بنیاد شریعت پر ہے۔ اس لیے عزیزان من' یہ سب کچھ آج ترک موالات کے سلسلے میں نہیں' بلکہ بیس سال پیشتر بھی میرا یہی اعتقاد تھا۔

دوستو! میں اپنی زندگی کا اگر کوئی کام سمجھتا ہوں' تو وہ یہی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میں ہندوستان کے ان انسانوں میں ہوں' جن کو خدا نے کتاب اللہ کی طرف بلایا ہے۔ میں اپنے لئے کوئی خدمت سمجھتا ہوں تو وہ صرف یہی ہے کہ کتاب اللہ کی طرف لوگوں کو بلاؤں۔ مسلمان اپنے ہندو بھائیوں سے تمام کاموں میں الگ تھلگ تھے۔ علی گڑھ کی پالیسی' مسلمہ قومی پالیسی سمجھی جاتی تھی کہ وہ ہندوؤں سے علیحدہ رہیں۔ میں نے دعوت دی کہ اگر مسلمان ہندوستان کی زندگی میں بحیثیت مسلمان ہونے کے اپنے عظیم الشان فرائض انجام دینا چاہتے ہیں' تو ان کا فرض ہونا چاہیے کہ اتفاق کا قدم بڑھائیں' اور بائیس کروڑ ہندوؤں کے ساتھ ایک ہو جائیں مسلمانوں کے لیے ایسا کرنا ان کے مذہبی عمل میں سے تھا۔

•

بہرحال موضوع بحث یہ تھا کہ تحریک خلافت نے اندرونی میدان میں دوسری صورت سے جو کامیابی حاصل کی ہے' وہ یہ ہے کہ تحریک خلافت کی بدولت ہندوستان

کی آزادی کا سویا ہوا مسئلہ اس قوت سے جاگ اٹھا کہ آج اس کا غلغلہ دنیا میں بلند ہے۔

اب تیسری منزل کونسی ہے اس میدان کی؟ وہ تیسری منزل فی الحقیقت نہایت فیصلہ کن منزل ہے۔ تحریک خلافت نے ہندوستان کی آزادی کے مسئلہ کو' پنجاب کے مسئلے کو' جس طرح زندہ کردیا تھا' ضروری تھا کہ اس کے لیے کوئی مذہبی شاہراہ عمل ہوتی اور آپ کے سامنے کھولی جاتی۔ خلافت کمیٹی نے احکام شرع کے ماتحت فیصلہ کیا کہ ترک موالات مسلمانوں کے فرائض میں سے ہے۔ بدبختی سے جہاں مسلمانوں نے اپنے تمام مسائل کو ترک کردیا ہے' یہ مسئلہ بھی فراموش کردیا تھا' اس لیے ضرورت تھی کہ اس مسئلے کو زندہ کیا جائے۔ خلافت کمیٹی نے یہی کیا۔ سب سے پہلے ترک موالات کا اعلان کلکتہ کے اس جلسہ خلافت میں ہوا' جو 28' 29 فروری 1920ء میں ہوا تھا' اور میں ہی اس کا صدر تھا۔ سب سے پہلے اس کی تحریک وہاں کے خطبہ صدارت میں کی گئی تھی۔ اس کے بعد دہلی میں دوسری مرتبہ سربرآوردہ ہندو مسلمانوں کا اجتماع ہوا کہ کیا اس مسئلے کو بحیثیت قوم کے ہم اختیار کرسکتے ہیں۔ اس سب کمیٹی میں بھی جس میں مہاتما گاندھی' حکیم اجمل خان اور میں تھا' یہ طے پایا تھا' کمیٹی سے میں نے کہا کہ بحث کی ضرورت ہے' نہ کچھ اور۔ یہ سب کو معلوم ہے کہ یہ چیز جو ہمارے سامنے آرہی ہے' تیرہ سو سال سے موجود ہے۔ میں نے کہا کہ آپ اپنی رپورٹ تیار کیجئے۔ اس کے بعد میرٹھ میں اس صوبہ کا پہلا جلسہ ہوا اور اس میں مہاتما گاندھی نے اس تحریک کے مختلف اجزاء کو پیش کیا۔ اور جو لوگ وہاں موجود تھے' وہ تصدیق کریں گے کہ وہاں بھی میں نے اعلان کیا تھا کہ کوئی یہ خیال نہ کرے کہ یہ پہلی اپیل ہے' بلکہ فی الحقیقت یہ تیرہ سو برس سے مسلمانوں کے یہاں موجود ہے' اور بحیثیت مسلمان ہونے کے ہمارا فرض ہے کہ ہم اس پر عمل پیرا ہوں۔ اس وقت اس مسئلے کے عمل میں اگرچہ خلافت کمیٹی کے تمام اراکین شریک تھے' مسلمانوں کے علاوہ کی جماعت شریک تھی۔ لیکن یہ واقعہ آپ کو یاد ہوگا کہ یہ مسئلہ چونکہ نہایت پیچیدہ شکل میں ملک کے سامنے آیا تھا' اس لیے ہندوستان کی سب سے بڑی جماعت یعنی انڈین نیشنل کانگریس

نے اس میں شرکت نہیں کی تھی۔ یہ آخری میدان تھا' جس میں ہمیں فتح حاصل کرنا تھی۔ میں آپ کو یاد دلاؤں گا' اللہ تعالیٰ کے اس کرم کو کہ یہ تیسری منزل بھی سامنے آئی اور تحریک خلافت نے نہایت کامیابی سے اسے فتح کیا۔ ایک معرکہ وہ تھا' جو کلکتہ میں گرم ہوا' دوسرا وہ تھا' جو ناگپور میں گرم ہوا۔ اس دوسرے معرکے میں بیس ہزار ہندوستان کے ہندو مسلمانوں نے متفقہ آواز میں' جس میں ایک آواز بھی خلاف نہ تھی' ترک موالات کے ساتھ اتفاق کیا۔ اور یہ تیسری فتحمندی' مسئلہ خلافت کو ہندوستان کے میدان میں حاصل ہوئی۔

اب یہ تیسرا میدان جسے آپ ڈھونڈ رہے تھے' وہ بھی اسی ہندوستان کے اندر موجود تھا۔ جب تک آپ کے اندر خود آپ کی قومی قوت واپس نہ آجاتی' جب تک آپ خود اپنے دلوں کے معاملات صاف نہ کرلیتے' جب تک آپ کے دلوں میں عمل کی نئی روح پیدا نہ ہو جاتی' اس وقت تک آپ دشمنوں کے مقابلوں میں کیا کامیابی حاصل کرسکتے تھے؟

اصلی میدان ہندوستان کا میدان تھا' اندرونی میدان تھا۔ اصل فتح و شکست کا فیصلہ ہندوستان کے اندر ہونے والا تھا۔ اگر آپ اپنے ملک کے اتفاق کے میدان میں' ترک موالات کے میدان میں' قربانی و ولولہ کے میدان میں' مختصر یہ کہ ایمان کے میدان میں' کامیابی حاصل کرلیتے' تو دنیا کی کونسی قوت ہے' جو آپ کو شکست دے سکتی تھی؟ اگر آسمان کی تمام بجلیاں اتر آئیں' ہمالہ کی چٹانیں اپنی صفیں کھڑی کرلیں' تو بھی ایمان کو ایک منٹ کے لیے شکست نہیں دے سکتیں۔ سب سے بڑی ضرورت اس بات کی ہے کہ آپ سب سے پہلے اپنے دلوں کے میدان کو فتح کریں۔ ایمان کے میدان کو' استقامت کے میدان کو' قربانیوں کے میدان کو' ملک کے اتفاق کے میدان کو' سر کرلیں۔ جب تک ہم ان میدانوں کو فتح نہ کرلیتے' دشمنوں کے مقابلے میں کیسے بازی جیت سکتے تھے!

دنیا میں ہر فکر اور ہر عمل کے لیے دو ہی موجب ہیں: ایک موجب امید کا اور ایک یاس اور ناامیدی کا۔ اگر امید کی روشنی کو سامنے لائیں' تو اس میں شبہ نہیں ہے

کہ تحریک خلافت نے تمام درماندگیوں کو دیکھتے ہوئے' اندرونی میدان کی ان تین منزلوں کو اللہ کے فضل سے کامیابی کے ساتھ طے کیا۔ اس کے بعد اس نے ایک ایسی جماعت میں' جس سے بڑھ کر ہندوستان کے لیے کوئی ملکی جماعت نہیں ہوسکتی یعنی انڈین نیشنل کانگریس' اس کے اندر بھی اس نے کامیابی حاصل کی۔ یہ اٹھارہ مہینے جو گزر چکے ہیں' تحریک خلافت کی کامیابیوں کا زمانہ ہے۔ یہ شکست کا نہیں' یقیناً کامیابی کا زمانہ تھا' لیکن اگر اس کامیابی کا نتیجہ یہ ہو کہ آپ کے اندر گھمنڈ پیدا ہو جائے' اور آئندہ عمل کی قوت جاتی رہے' تو پھر یہ کامیابی آپ کے لیے فتحمندی نہیں ہے' ایک کھیل ہے' جسے ہوا کا ایک طمانچہ اڑا لے جائے گا۔

اس کامیابی کا دارومدار آخری منزل پر موقوف ہے۔ جب تک آپ اسے طے نہ کریں گے' پہلی کامیابی آپ کے لیے سود مند نہیں ہوسکتی۔ ایک موجب امید کا ہے۔ اس کی روشنی میں آپ نے گزشتہ حالات پر نظر ڈالی۔ تم نے دیکھا کہ بلاشبہ تحریک خلافت کی کامیابی کی بیل منڈھے چڑھی۔ ایک دوسرا موجب بھی ہے: وہ ناامیدی اور خوف کا ہے۔ ایمان دو پروں سے اڑتا ہے' ایک امید کا' دوسرا خوف کا۔ یہ ہماری بڑی ناکامی ہوگی کہ گزشتہ کامیابیوں کا تصور کرتے ہوئے آنے والی کامیابیوں کو بھول جائیں۔ بیشک' تحریک خلافت نے یہ کامیابی حاصل کی' لیکن ان تمام کامیابیوں کے لیے فیصلہ کن منزل وہ ہے' جو تمہارے غفلت سے بھرے ہوئے سروں سے گزر رہی ہے۔ ان گھڑیوں کے اندر ہندوستان کا ہر باشندہ' ہر مسلمان' ہندو' پارسی اور عیسائی' غرض کہ ہندوستان کا ہر بسنے والا' جس نے گنگا' جمنا' کی صاف روانی دیکھی ہے اور ہندوستان کے اس تاروں بھرے آسمان کو سر پر اٹھائے ہے' ہر ایک کا فرض ہے کہ آنے والی کامیابی کو حاصل کرے۔ اگر اب بھی تمہارے ایمان کے شعلے نہ بھڑکے' تو ان گزشتہ کامیابیوں کا افسانہ ایک منٹ کے لیے منزل مقصود تک تم کو نہ پہنچا سکے گا۔

اب آخری منزل آگئی۔ آج یا تو ہمیشہ کے لیے امید کا فیصلہ کرو گے' یا ہمیشہ کے لیے ناامیدی کے مدفن میں اس تحریک کو دفن کر دو گے۔ وہ آخری فیصلہ کن گھڑی آپ کے سامنے آگئی۔ وہ کونسی ہے؟ افسوس کہ وقت کوتاہی کر رہا ہے۔ میں چاہتا ہوں

کہ میرے مسلمان بھائیوں کے سامنے یہ آجائے کہ کونسی منزل ان کا انتظار کررہی ہے! جب تک وہ پوری صداقت کے ساتھ اسکا دھیان اپنے سامنے نہ لائیں گے' گزشتہ کامیابیاں سودمند نہیں ہوسکتیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس منزل کا نقشہ کن لفظوں میں آپ کی آنکھوں کے آگے سنواروں۔

میں دنیا کی تمام قوموں سے قطع نظر کرلیتا ہوں اور مسلمانوں کو دکھانا چاہتا ہوں کہ وہ دنیا کے طرح طرح کے اعلانات کی پرستش کررہے ہیں۔ مگر انہیں یاد کرنا چاہیے کہ ان کے پاس ایک الہامی اعلان بھی ہے۔ جب تک وہ اس تعلیم کو اپنے سامنے نہ لائیں گے' ان کی کامیابیاں سودمند نہیں ہوسکتیں۔ وہ اعلان قرآن مجید میں جابجا دہرایا گیا ہے۔ وہ ایک مختصر سبق ہے' جسے دہراتے ہوئے میں خاص طور پر سے خطاب کروں گا اپنے مسلمان بھائیوں سے' اور التجا کروں گا اپنے ہندو بھائیوں سے کہ وہ خاص اصطلاح سن کر کبیدہ خاطر نہ ہوں۔ بلکہ اس حقیقت کو ڈھونڈھیں کہ جس طرح بہت سے کنول ہیں' مگر روشنی ایک ہے۔ سرخ رنگ کے کنول سے روشنی سرخ نہیں ہوسکتی۔ اسی طرح خدا کی سچائی ایک ہے' اگرچہ طرح طرح کے ناموں میں پیش کی جائے' میں یقین دلانا چاہتا ہوں کہ دنیا میں کوئی چھوٹی سے چھوٹی کامیابی بھی دنیا کا کوئی وجود'کوئی روح' کوئی آتما' بلکہ کوئی ذرہ اس آسمان کے نیچے نہیں پاسکتا جب تک وہ اس پروگرام پر عمل نہ کرے' جو قرآن نے دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ اگرچہ قرآن نے اس بارے میں نہایت تفصیلی بیانات دیے ہیں لیکن ایک بہت ہی چھوٹا سا بیان بھی ہے' جس کی نسبت تاریخ اسلام کے ایک بہت بڑے امام نے جن کا نام امام شافعی ہے' یہ کہا تھا کہ اگر قرآن کے صرف یہی چند جملے نازل ہو جاتے' تو تمام کرۂ ارضی کی ہدایت کے لیے کافی تھے:

سورۃ العصر(4)

آپ کی تحریک خلافت ہندوستان کی آزادی کی تحریک ہے! یہ ایک مقصد ہے' جو فتح چاہتا ہے۔ عمل چاہتا ہے۔ جو لوگ مقصد اور عمل کے ڈھونڈھنے والے ہیں' جو مقصد کے عشق میں آنسو بہانے والے ہیں' تو میں کہنا چاہتا ہوں کہ قرآن کا ہر ایک

مقصد کے لیے یہ اعلان ہے کہ اس آسمان کے نیچے' نوع انسان کے لیے' انسانوں کی تلاشوں کے لیے' جستجوؤں کے لیے' امیدوں کے لیے' بڑی بڑی ناکامیاں ہیں' بڑے بڑے گھاٹے ٹوٹے ہیں۔ لیکن دنیا کی اس عام نامرادی سے کون انسان ہے' کون جماعت ہے' جو بچ سکتی ہے' اور ناکامی کی جگہ کامیابی پا سکتی ہے۔ ناامیدی کی جگہ امید اس کے دل میں اپنا آشیانہ بنا سکتی ہے' وہ کون انسان ہے؟ وہ انسان ہے' جو دنیا میں ان چار شرطوں کو قولاً اور عملاً اپنے اندر پیدا کر لے۔ جب تک یہ شرطیں پیدا نہ ہوں گی' اس وقت تک دنیا میں نہ کوئی قوم کامیاب ہو سکتی ہے' نہ ملک۔ حتیٰ کہ ہوا میں اڑنے والا پرندہ بھی دنیا میں کامیابی نہیں پا سکتا۔

ان چار شرطوں کے نام سے گھبرا نہ جانا! اگر ایک چیز عربی بھیس میں آجائے' تو کیا تم انکار کر دو گے' چاہے وہ پہچانی ہوئی ہو؟

پہلی شرط وہ ہے جس کا نام قرآن مجید کی بولی میں ایمان ہے الا الذین امنوا - تم جبھی کامیابی پا سکتے ہو' جب تمہارے دلوں کے اندر' روح کے اندر' وہ چیز پیدا ہو جائے' جس کا نام قرآن مجید کی زبان میں ایمان ہے۔ ایمان کے معنی ہیں' عربی میں زوال شک کے یعنی کامل درجے کا بھروسہ اور علم' کامل درجے کا اقرار تمہارے دل میں پیدا ہو جائے۔ جب تک کامل درجے کا یقین تمہارے دلوں کے اندر نہ پیدا ہو' اللہ کی صداقت پر' اللہ کی سچائی پر' اللہ کے اصولوں پر' جس وقت تک کامل درجے کا یقین تمہارے قلب کے اندر پیدا نہ ہوگا' کامیابی کا کوئی دروازہ تمہارے لیے نہیں کھل سکتا۔ شک کا اگر ایک کانٹا بھی تمہاری دل میں چبھ رہا ہے' تو تمہیں اپنے اوپر موت کا فیصلہ صادر کرنا چاہیے۔ تم کو کامیابی نہیں ہو سکتی۔ سب سے پہلی شرط یہی ہے کہ تمہارے اندر ایمان' اطمینان' یقین' جماؤ اور تمکن اور اقرار پیدا ہو' لیکن کیا محض دل کا یہ کام' دماغ کا یہ فعل' تصور کا یہ نقشہ' کامیابی کو پورا کر دے گا؟ نہیں۔

فرمایا : ایک دوسری منزل بھی اس کے بعد آتی ہے۔ جب تک وہ دوسری منزل بھی کامیابی کے ساتھ طے نہ کر لو گے' اس ایک منزل کو طے کر کے کامیابی نہیں پا سکتے۔ اس دوسری منزل یا شرط کا نام قرآن کی بولی میں عمل صالح ہے۔ یعنی وہ کام' جو

اچھا ہے، اسے اچھائی کے ساتھ کیا جائے، جس کام کو جس صحت اور جس طریقے کے ساتھ کرنا چاہیے جو طریقہ اس کے لیے سچا طریقہ ہو سکتا ہے اس کام کو اس کے ساتھ انجام دینا۔

قرآن کا یہ اصول تو عام ہے۔ ایمان کے معنی ہیں، وہ یقین، وہ کامل اطمینان، وہ کامل اقرار، جو عمل سے پہلے پیدا ہوتا ہے، جس وقت یہاں اس کانفرنس کی جگہ، ایک چٹیل میدان تھا، کوئی وجود اس شامیانے کا نہ تھا۔ تمہاری خلافت کمیٹی کے ارکان نے اس وقت یہ شامیانہ نصب نہیں کیا تھا، لیکن اس وقت بھی یہ شامیانہ مع ان چمکتی ہوئی لال ٹیوں کے موجود تھا، کہاں؟ ان کے دماغ میں۔ وہ چیز جو ان کے دماغ میں موجود تھی، وہ ارادہ جو ان کے ذہن میں پیدا ہوا تھا، کہ وہ پہلی منزل ہوئی، جو مذہب میں آکر ایمان کا نام اختیار کر لیتی ہے۔ پہلی چیز عمل دماغ ہے، عمل تصور و یقین ہے۔ اسی بنا پر سب سے پہلی منزل ایمان کی ہے۔ پہلی چیز یہ ہے کہ تمہارے دل کے اندر سچا ارادہ پیدا ہو، سچا عزم پیدا ہو۔ دوسری منزل عمل الصلحت کی ہے۔ صرف دماغ کی منزل طے کر کے قدم نہ رک جائیں، بلکہ عمل بھی کرو۔ وہ عمل جو صالح ہو۔ جو صحیح طریقہ ہے اس کام کے انجام دینے کا۔ جب اس کو پورا کرلیا تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ فتح مند اور کامیابی کی دو منزلیں تم نے طے کرلیں۔

مگر کیا تمہارا کام ختم ہوگیا؟ اس کے بعد کیا تم منزل مقصود تک پہنچ جاؤ گے؟ قرآن کی عالمگیر صداقت بتاتی ہے کہ نہیں۔ بلکہ ان دو منزلوں کے بعد دو منزلیں اور بھی باقی ہیں۔ اپنی ہمت کو آزماؤ کہ ان کے لیے تمہارے تلوے تیار ہیں یا نہیں! تمہاری کمر ہمت مضبوط ہے یا نہیں! اگر نہیں ہے، تو ممکن ہے کہ یہ دو منزلیں تمہارے لیے سودمند نہ ہوں۔ وہ دو منزلیں یہ ہیں: قرآن مجید نے فرمایا کہ ایمان اور عمل صالح آدمی کے اندر پیدا ہوا۔ یعنی یہ ہوا کہ انسانیت کی جو ایک زنجیر ہے، اس کی ایک کڑی نے اپنے آپ کو درست کرلیا۔ لیکن کیا ایک کڑی کے درست کر لینے کے بعد زنجیر کا پورا کام ہوگیا۔ ایک منٹ کے لیے بھی نہیں۔ تم کیا ہو؟ افراد کا مجموعہ، بکھری ہوئی کڑیوں کا ڈھیر۔ اس بکھری ہوئی شکل میں بیکار ہو، اس میں تمہارا کوئی وجود نہیں۔

قرآن وجود مانتا ہے اجتماع کا' قوم کل اس کے نزدیک وجود کڑیوں کا نہیں' بلکہ زنجیر کا ہے۔ تم میں سے ہر وجود ایک کڑی ہے۔ اس کا کام پورا نہیں ہو سکتا جب تک وہ باقی کڑیوں کی خبر نہ لے۔ جب تک باقی کڑیاں مضبوط نہ ہوں گی' زنجیر مضبوط نہیں ہو سکتی۔ اس لیے فرمایا کہ کامیابی کا سفیر کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک تیسری منزل تمہارے سامنے نہ آئے۔ وہ تیسری منزل فصیح و بلیغ لفظوں میں وتوا صوا بالحق وتوا صوابالصبر ہے۔ یعنی تم جو ایک کڑی تھے' تم نے اسے ایمان کی مضبوطی سے استوار کیا۔ لیکن تمہارا کام ختم نہیں ہوا۔ تمہارا فرض ہے کہ دوسری کڑیوں کو بھی درست کرو' اور انہیں اس طرح درست کر سکتے ہو کہ جس سچائی کو تم نے اپنایا ہے' اسے دوسروں میں بھی پھیلاؤ۔ جب تک تم میں یہ بات نہ ہوگی کہ تمہارا دل سچائی کے اعلان کے لیے تڑپنے لگے۔ جب تک تم تواصی حق نہ کرو گے' کامیابی تم کو نہیں مل سکتی۔

لیکن اگر اس تیسری منزل کے لیے تم تیار ہو گئے' اگر توفیق الٰہی نے تمہاری دستگیری کی' تو پھر آخری منزل کون ہے؟ وہ ہے' جو صبر کی منزل کے لیے لازم و ملزوم ہے۔ اس کے ساتھ اس کی گردن اس طرح جڑی ہوئی ہے کہ جدا نہیں کی جا سکتی۔ فرمایا کہ حق کی وہ وصیت کریں گے' حق کا وہ پیغام سنائیں گے' حق کی دعوت پہنچائیں گے' مگر حق کا یہ حال ہے کہ اس کی راہ میں کوئی قدم نہیں اٹھ سکتا' جب تک وہ قربانیوں کے لیے بھی نہ اٹھے۔ فرمایا کہ مومن صرف حق ہی کا پیام نہ پہنچائے' بلکہ صبر کا بھی پہنچائے۔

تم نے اپنی بدبختی سے نہ صرف شریعت کے حکم کو بدلا ہے' بلکہ اپنے طریق عمل سے شریعت کے لفظوں کو' بولیوں کو بھی بدل ڈالا ہے۔ صبر کے معنی کیا ہیں؟ تم سمجھتے ہو کہ صبر کے معنی ہیں بے غیرتی اور باطل کی پرستش اور پوجا۔ تم صبر کے معنی یہ سمجھتے ہو لیکن جو شخص صبر کے یہ معنی سمجھتا ہے' اس سے بڑھ کر قرآن مجید کی تحریف لفظی کرنے والا کوئی نہیں۔ تحریف معنوی تو بہت سے علماء کر رہے ہیں۔ لیکن تحریف لفظی یہ ہے کہ اگر صبر کے معنی یہ ہیں کہ تمہارے حق کے مقابلے میں مصیبت آجائے' تو

تم کو چاہیے کہ صبر کے گوشہ میں پناہ لو یعنی ہر طرح کی بے غیرتی کو' بیچارگی کو' باطل پرستی کو قبول کرلو۔ تو میرے بھائیو! تم سے بڑھ کر قرآن کی تعلیم کو بدلنے والا کوئی نہیں۔

صبر کے معنی اس سے بالکل مختلف ہیں۔ صبر کے معنی ہیں برداشت کے' صبر کے معنی ہیں جھیلنے کے' صبر کے معنی ہیں تحمل کے' جو قدم تم مقصد کی راہ میں اپنے محبوب اور پیارے مقصد کے لیے اٹھاؤ اور اس میں طرح طرح کی مصیبتیں آئیں۔ طرح طرح کی ڈراؤنی صورتیں آئیں' زنجیریں اور ہتھکڑیاں آئیں' بلکہ ممکن ہے کہ تمہارے سامنے تختہ آوے اور اس پر ایک پھندا جھول رہا ہو۔ یہ سب تمہارے سامنے آسکتا ہے۔ لیکن اگر تم حق کے پرستار ہو' تو تمہارا فرض ہونا چاہیے کہ تمہارے اندر صبر ہو تمہارے اندر برداشت کی وہ اٹل طاقت' برداشت کا' وہ پہاڑ موجود ہو' جس پر دنیا کی کوئی شوکت' کوئی تاج و تخت فتحیاب نہ ہوسکے۔ یہ معنی صبر کے ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید کے مواقع استعمال پر اگر غور کیا جائے' تو معلوم ہو جائے گا کہ ہر جگہ صبر کے یہی معنی ہیں۔

مقصد یہ تھا کہ قرآن مجید نے جو صداقت نوع انسان کے آگے کامیابی کے لیے پیش کی ہے' اور اب سے تیرہ سو برس پیشتر جو ایک اٹل اور لازوال پروگرام بنا دیا ہے۔ یہ اس کی چار دفعات ہیں۔ اگر وہ کوئی سفر ہے' تو یہ اس کی چار منزلیں ہیں۔ ہم کو ایک منٹ کے لیے غور کرنا چاہیے کہ کیا دنیا میں کوئی کامیابی بلا ایمان مل سکتی ہے؟ کیا تم شک کا روگ اپنے پہلو میں لے کر دنیا کی کوئی چھوٹی سے چھوٹی کامیابی پا سکتے ہو؟ کیا تم دنیا میں ایک مٹھی بھر جو اور چاول بھی پا سکتے ہو' جب تک تمہارے اندر طلب کے لیے سچا جذبہ نہ ہو؟ کیا ایک لمحے کے لیے دنیا کی کوئی کامیابی اپنا چہرہ تمہیں دکھا سکتی ہے' جب تک تم حق کی راہ میں قربانی چڑھانے کو تیار نہ ہو؟ خدا کی اس کائنات میں ایک ایک ذرے کے اندر اس حقیقت کی عالمگیر تصدیق موجود ہے کہ اس دنیا میں کامیابی کا کوئی چہرہ نہیں دیکھ سکتا' جب تک وہ ایمان' حق اور صبر کی منزلوں سے نہ گزرے۔ اللہ کا ہر قانون' ہر اڑنے والے پرندے کے لیے بھی ہے۔ کیا خدا اپنا قانون

تمہارے لیے بدل دے گا؟ کیا خدا تمہاری غفلتوں کا ساتھ دے گا؟ اگر تم اپنی غفلت کی وجہ سے اس دھوکے میں پڑے ہو' تو تم سے بڑھ کر اپنی موت کی طرف جانے والا کوئی نہیں ہے۔

میرے دوستو!

آج ہمارا پہلا فرض یہ ہونا چاہیے کہ ہم اپنی گزشتہ کامیابیوں کے افسانے نہ دہرائیں' بلکہ ہر شخص اپنے عمل کا احتساب کرے اور اپنے دل سے پوچھے کہ کیا واقعی اس کے دل کے اندر ایمان کا بجھا ہوا' چراغ روشن ہو گیا ہے! کیا واقعی اس کے اندر عمل صالح پیدا ہو گیا! کیا واقعی اس کے اندر حق پیدا ہو گیا ہے!

اب اس پروگرام میں آخری منزل قربانی کی ہے۔ اسی منزل کے چند ہفتوں' بلکہ اس کے چند دنوں کے اندر' تمہارے ہندوستان کی آزادی اور مسئلہ خلافت کی پوری قسمت پوشیدہ ہے۔ اگر اس منزل کے لیے تیار ہو' تو اللہ کی کامیابی بھی تمہارے استقبال کے لیے تیار ہے۔ اگر ایمان ہمارے اندر پیدا نہیں ہوا ہے' اگر اب تک ہمارا دل شک سے خالی نہیں ہے' اگر ہمارے دل کے اندر حق کا یہ پہلا احساس بھی نہیں پیدا ہوا ہے کہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں' اگر یہ سچ ہے' تو ضرور ہے کہ کامیابی ہو' اور دنیا کی ساری طاقتوں کے مقابلے میں ہم فتح مند رہیں گے۔ اگر اللہ کی چوکھٹ سے بھاگے ہوئے سر اس کے آگے پھر نہ جھکے ہوں' تو پھر کونسی شے ہے جو تمہاری چوکھٹ پر آئے گی اور تمہاری کنڈی کھٹکھٹائے گی! اگر اب بھی تم ایمان' تواصی بالحق' عمل صالح اور قربانی کے لیے تیار نہیں ہو' تو تم کو حق نہیں ہے کہ تم خدا کی زمین میں کامیابی کو ڈھونڈو۔

حضرات!

• میں یہ جتلا دینا چاہتا ہوں کہ اس وقت جو کچھ میں نے کہا' یہ وہ شرائط ہیں جن کو بلاشبہ اول کہا جا سکتا ہے نہ آخر۔ جب تک یہ چار چیزیں ہمارے اندر پیدا نہ ہوں گی' کامیابی ممکن نہیں۔ یہی چار چیزیں تھیں جو ہماری تمام کامیابیوں کے لیے علت تھیں' جن کو تمام کرۂ ارضی میں دشمن پامال کرتے کرتے نہ کر سکے۔ جس طرح یہ شرائط

اسلامی آپ کے لیے ضروری ہیں، اسی طرح آپ کو خبردار ہونا چاہیے کہ آپ نے جو عمل ترک موالات کا شروع کیا تھا، اس کے متعلق جو منزلیں سامنے آئی تھیں، جب تک ان منزلوں کو آپ کامل ایمان، عمل صالح، کامل قربانی کے ساتھ انجام نہ دیں گے، باقی منزلیں آپ کے سامنے نہیں آسکتیں۔ جب کوئی مقصد کسی کے سامنے رکھا جاتا ہے، تو وہ پوچھتا ہے کہ اس کا انجام کیا ملے گا؟ وہ ادائے فرض کے معاملے کو دکانداری بناتا ہے۔ وہ پوچھتا ہے: نتیجہ کب نکلے گا؟ لیکن فرض اس امر کا محتاج نہیں ہے کہ نتیجہ کیا اور کب پیدا ہوگا! اگر فرض، فرض ہے، تو ہمیں چاہیے کہ ہم اسے پورا کریں۔ نتیجے پر غور کرنا ہمارا کام نہیں ہے۔ دنیا میں بیج ہے، زمین ہے، انسان ہے، اور اس دنیا پر خدا بھی ہے۔ کیا تم خدا کا کام، خدا کی زمین پر کرسکتے ہو؟ تم تو یہ کرسکتے ہو کہ تمہاری جھولی میں جو دانہ ہے، زمین کے سپرد کر دو۔ پھر وہ خدا ہے جو اپنی رحمت کو بھیجتا ہے۔ اور اپنے بادل کو برساتا ہے، اور جو بیج تم نے زمین کے سپرد کردیا تھا، اس کو بار آور کرتا ہے۔ تمہارا فرض ہے کہ دیکھو، زمین صالح ہے، دانہ سچا ہے۔ اگر تمہارے ایمان کا دانہ سچا ہے اور اسے اپنے دل کی جس سرزمین میں ڈالا ہے، وہ سرزمین شور نہیں ہے۔ تو ضرور ہے کہ وہ دانہ زمین کے پردے کو چاک کرے گا اور اپنی کامیابی کا سر نکالے گا۔

اگر اس وقت میں آپ کے سامنے یہ لاؤں کہ ایمان کے علاوہ عمل صالح کے عام اور عالمگیر اصول کے علاوہ، ترک موالات اور تحریک خلافت کے سلسلے میں جو کام درپیش ہیں، وہ کون سے ہیں، تو میرے دوستو! جلد بازی سے کام نہ لینا۔ یہ نہ دیکھو کہ وہ کام آج تحریک خلافت اور ترک موالات کے لیے کہاں تک مفید ہیں! تمہارا فرض یہ نہیں ہے کہ تم ان کاموں کو اختیار کرو جو تحریک خلافت کے لیے مفید ہیں! بلکہ تمہیں چاہیے کہ تم وہ کام کرو جو تمہارا فرض ہیں۔

قربانی کی جو پہلی منزل تھی جب تک قدم اس منزل سے آگے نہ بڑھ جائے، دعویٰ قربانی نہیں مانا جا سکتا۔ میں کہتا ہوں کہ مری طرف نہ دیکھو، اپنے گریبان کی طرف دیکھو۔ وہ کپڑا جو تمہارے جسم پر ہے، وہ باریک ململیں جو تم نے اپنے جسموں پر

لپیٹی ہیں' ان سے تم کتنی بڑی خدمت اپنے دشمنوں کی انجام دے رہے۔ تمہارے ملک سے نوے کروڑ روپیہ ہر سال ان کپڑوں کے ذریعہ ان خزانوں میں جاتا ہے' جو پانچ سال سے اسلام کے مٹانے میں صرف کیا جارہا ہے۔ ترک موالات میں اس سے بڑھ کر اور کون سا مسئلہ ہو سکتا تھا؟ تمہارے عمل کے لیے یہ علت نہیں ہو سکتی کہ تم دوسروں کو کتنا نقصان پہنچا سکتے ہو۔ تمہارے لیے سچا اصول یہ ہے کہ تم اپنے دل کو کتنا فائدہ پہنچا سکتے ہو۔ تمہاری کامیابی کے لیے' خلافت کے لیے' سوراج کے لیے' پہلی چیز یہ تھی کہ ملک کے اندر قربانی کا ولولہ پیدا ہو۔ مقصد کے لیے' ملک کے لیے' حق کے لیے' تکلیف اٹھانے کا ایک ولولہ پیدا ہو۔ اس وقت ضرورت تھی کہ قربانی کا سبق آئے' جو سبق تمہارے سامنے آیا وہ جان' گردن اور رگوں کا نہ تھا' محض ان کپڑوں کا تھا۔ اگر اسے تم کامیابی کے ساتھ طے نہیں کرسکتے' اگر تمہارے دل میں اتنا عشق نہیں ہے کہ تم ان باریک کپڑوں کو چھوڑ کر موٹے کپڑے پہن سکو۔ تو کیا تمہارے دل میں یہ حوصلہ آسکتا ہے کہ تم خدا کی زمین میں بسنے کی ہمت کرو؟ جب تک غیر ملکی کپڑے کے بائیکاٹ کی منزل کو طے نہ کرو گے' قربانی کی کوئی منزل تمہارے سامنے نہیں آسکتی۔

30 ستمبر کا زمانہ خلافت کمیٹی نے اس کے لیے قرار دیا تھا۔ مگر ہماری کامیابیوں کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی درد انگیز داغ نہیں ہوسکتا کہ 30 ستمبر کی صبح آئی اور ہماری غفلت پر رو کر چلی گئی۔ اب تک وہ لباس موجود ہے' جس کی وجہ سے ہندوستان غلام بنایا گیا۔ جس کے ذریعہ ہندوستان کے بہترین مقاصد پامال کیے گئے۔ کیا ہم کو حق پہنچتا ہے کہ ہم یہ کہیں کہ ہم اپنی جانوں کو قربان کرنے کے لیے تیار ہیں؟ اگر تم اپنی جانیں قربان کرسکتے ہو' تو تم کو کیا ہوگیا ہے کہ تم اپنے لباس کو قربان نہیں کرسکتے۔ ہم میں سے ہر ایک مسلمان اور ہندو کا سب سے بڑا پاک اور اشرف فرض ہے کہ جہاں تک جلد ممکن ہو' اس معاملے کو کامیابی تک پہنچائے۔ جب تک یہ منزل طے نہ ہوگی' اور کوئی منزل ہمارے سامنے نہیں آسکتی۔ خصوصاً مسلمانوں کے لیے ایک بڑا کام' جو ان کے جسم کی قربانی سے تعلق رکھتا ہے' یہ معاملہ ہے کہ وہ ان باریک کپڑوں کو جو مانچسٹر اور لنکا شائر سے آتے ہیں اور ان کے ملک کو تباہ کررہے ہیں' ان کو اتار دیں اور

انہیں اپنے لیے جائز نہ رکھیں۔

دوسرا کام ان کے لیے اس جسم کی قربانی کے ساتھ جو میں ان کے سامنے پیش کرتا ہوں' وہ کون سی قربانی ہے؟ میرے دوستو' وہ مال کی قربانی ہے' جس کے لیے تمہیں تیرہ سو برس سے پکارا جاتا رہا ہے کہ اپنی جانوں اور مال کو سچائی کی راہ میں قربان کرو۔ اگر آج مسلمانوں کے بس میں اتنا نہیں ہے کہ وہ سمرنا پہنچیں اور دشمنان اسلام کے مقابلہ میں اپنی لاشیں تڑپائیں! اگر آج مسلمانوں کی قسمت میں یہ دولت نہیں لکھی ہے' تو کتنے افسوس کی بات ہے کہ وہاں کے مسلمان بھائیوں کی روپیہ سے بھی مدد نہ کریں۔ ہندوستان کا کوئی مسلمان اپنے کو مسلمان کہنے کا حق نہیں رکھتا' جب تک وہ زیادہ سے زیادہ اپنے مال کو آج حکومت انگورہ اور مجاہدین انگورہ کے لیے قربان نہ کر دے۔

بلاشبہ مرکزی خلافت کمیٹی کا یہ فرض تھا کہ وہ سب سے پہلے اس امر کی تکمیل کے لیے کوشش کرتی' لیکن طرح طرح کی مشکلات حائل تھیں۔ ضرورت تھی کہ جتنا روپیہ ہندوستان میں فراہم ہو' اس کو براہ راست غازی مصطفیٰ کمال پاشا تک پہنچانے کا مرکزی خلافت کمیٹی کوئی انتظام کرتی اور ملک کو دعوت دیتی۔ الحمدللہ' مرکزی خلافت کمیٹی نے اس کا انتظام کرلیا کہ ہر اس پیسہ کو جو ہندوستان میں غازی مصطفیٰ کمال پاشا کے لیے دیا جائے' وہ براہ راست غازی مصطفیٰ کمال پاشا کے نام بھیجے اور براہ راست ایک رسید ان کے ہاتھ کی حاصل کرلے! چنانچہ دس ہزار کی ایک قسط حال میں بھیجی گئی۔

مرکزی خلافت کمیٹی نے آج مسلمانوں کو دعوت دی ہے کہ ان کا فرض ہے کہ وہ انگورہ کے لیے اپنے مال کو قربان کریں اور انگورہ و خلافت کے لیے اپنے جسم کو تھوڑا سا نقصان پہنچائیں' بدیسی کپڑے کو ترک کر دیں اور اپنے گھر کے صندوقوں کو صرف دیسی کپڑے سے بھریں۔

برادران عزیز!

یہ چند منتشر کلمات تھے' جن سے میں اس موقع پر اس مجلس میں آپ حضرات کی

واضح کرسکے۔ افسوس ہے کہ باوجود اختصار کے اپنے خیالات کی رو میں بہتا چلا گیا اور محسوس نہ کیا کہ رات کا بہت حصہ گزر چکا ہے۔ اس حالت میں بہتر نہیں ہے کہ آج کے جلسہ کی کارروائی کو زیادہ طول دیا جائے۔ آج کے جلسہ میں سب سے پہلے دو نہایت اہم تجویزیں تھیں۔ جن کو افتتاحی تقریر کے ضمن میں عرض کرنا تھا' لیکن افسوس ہے کہ وقت زیادہ ہوگیا ہے اور اب موزوں نہیں کہ جلسہ کی کارروائی کو زیادہ طول دیا جائے۔ اس لیے آج کا جلسہ ختم کیا جاتا ہے اور کل کا اعلان ہے کہ صبح آٹھ بجے جلسہ کی دوسری نشست ہوگی۔ امید ہے' آپ حضرات اسی جوش و عمدگی کے ساتھ اس جلسے میں بھی حصہ لیں گے جس عمدگی کے ساتھ آج اس جلسہ میں آپ نے حصہ لیا ہے۔ اس لیے کہ نہایت ضروری اور اہم گزارشات ہیں' جو اس میں عرض کی جائیں گی۔ اس اعلان کے بعد آج کے جلسہ کے اختتام کا میں اعلان کرتا ہوں۔

4

خطبہ اختتامیہ

مجلس خلافت

آگرہ' 26 اکتوبر 1921ء

برادران عزیز!

دو دن سے آپ کے صوبے کی مجلس خلافت مختلف جلسوں اور صحبتوں میں اپنے فرائض انجام دے رہی تھی' یہ اس کا آخری جلسہ ہے۔

میں آپ کے سامنے اس وقت جو چیز آشکار کرنا چاہتا ہوں' وہ یہ ہے کہ اگر آپ اس جلسے کے اختتام کے منتظر تھے' اگر آپ سمجھتے ہیں کہ اس جلسے کا کام ختم کر چکے ہیں' تو میں آپ کے اس گمان کی تصدیق کرتا ہوں کہ جلسہ کا کام ختم ہو چکا۔ مگر یہ بھی یاد دلانا چاہتا ہوں کہ آپ کا کام ابھی تک ختم نہیں ہوا' بلکہ شاید اس وقت تک شروع بھی نہیں ہوا' جس قدر کام قول سے تعلق رکھتا تھا' زبانوں سے تعلق رکھتا تھا' تو میں اعلان کرتا ہوں کہ وہ کام پورا ہو چکا۔

لیکن اگر آپ سمجھتے ہیں کہ اس عالم کے علاوہ ایک دوسرا عالم بھی ہے۔ زبان کا عالم نہیں' فعل کا عالم' تو میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ تمہارا کام ختم نہیں ہوا' بلکہ شاید ابھی شروع بھی نہیں ہوا۔ جہاں تک صداؤں کا تعلق تھا' تم صدائیں سن چکے اور

سنا چکے' لیکن اب وہ گھڑی آگئی ہے کہ چند لمحوں کے لیے اپنے عمل کا احتساب کرو کہ کتنا تم نے عمل کیا ہے' اور کتنے عمل کی منزل سر کرنے کے لیے تم تیار ہو!

دوستو! مجھے چھوڑ دو کہ وہ دعوت آپ کے سامنے پیش کروں' جو آج نہ صرف مسلمانوں کے لیے بلکہ سچائی کی قدر کرنے والے ہر انسان کے لیے سب سے بڑی دعوت ہے۔ جس دعوت کو میں آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں' وہ کوئی تجویز نہیں ہے' تجویز ہوتی تو وہ اپنے رسوم کے ساتھ آپ کے سامنے آتی۔ وہ دعوت ہمارا ایک مسلمہ اعتقاد ہے' ایک مسلمہ یقین ہے' مذہب کا ایک مسلمہ رکن ہے' مذہب کا ایک مسلمہ عمل ہے' اور کوئی مسلمان جو ایمان کا دعویٰ رکھتا ہے' اس سے میں مطالبہ کر رہا ہوں کہ یا تو اسے اپنے عمل سے ثابت کر دے اور یا اسلام اور اس کی صداقت کا دعویٰ ہمیشہ کے لیے ختم کر دے۔ وہ اعتقاد' ایمان کے اعتبار سے کوئی نیا اعتقاد نہیں ہے۔ اس وقت کوئی خاص ضرورت نہ تھی کہ میں خصوصیت سے اس کا اعلان کرتا یا اس پر زور دیتا۔ وہ اعتقاد اگرچہ اس وقت سے موجود ہے' جب سے دنیا میں انسان موجود ہے۔ اور مسلمانوں کے دلوں اور عمل میں تو وہ اعتقاد تیرہ سو برس سے برابر چلا آرہا ہے۔ ہندوستان میں بھی اس کا بار بار اعلان کیا جا چکا ہے۔ اس لیے کوئی ضرورت نہ تھی کہ خاص طور پر اس کا اعلان کیا جاتا۔

تمہیں معلوم ہے کہ گزشتہ ہفتوں میں گورنمنٹ نے فیصلہ کیا کہ ملک میں جو مختلف نمایاں اشخاص' خلافت اور ہندوستان کی آزادی کی تحریک میں لے رہے ہیں' ان کی گرفتاری کا سلسلہ شروع کر دیا جائے۔ گورنمنٹ کو اتنا ہی حق حاصل تھا' جتنا ہر غرور اور گھمنڈ کو حق حاصل ہو چکا ہے کہ جس شہری کی چاہے' زنجیر اور طوق سے تواضع کرے' اس کی نہ ہم شکایت کرتے ہیں' نہ شکایت کی ضرورت' سمجھتے ہیں۔ یہ گرفتاریاں وہ ہیں' جن کا ہم اول وقت سے انتظار کر رہے تھے۔ جن کے متعلق ہمارا یقین ہے کہ جس میدان جنگ میں ہم نے قدم رکھا ہے' اس کی آخری منزل طے نہ ہوگی' جب تک ان گرفتاریوں کا سلسلہ تمام ہندوستان کے طول و عرض کا احاطہ نہ کرلے گا۔ یہی وہ چیز ہے جس کے انتظار میں ہم بے قراری کی صبحیں اور شامیں بسر

کر رہے تھے۔

میں اپنی کمزوریوں کو چھپانا نہیں چاہتا۔ یہ میدان خود ہم نے نہیں کھولا۔ ہم اپنے لوگوں کی استطاعت اور صلاحیت کے منتظر تھے' لیکن گورنمنٹ صبر نہ کر سکی۔ اس نے ایک قدم بڑھایا' اور جس چیز کے ہم بھوکے پیاسے تھے' اور جس کی تاخیر ہمارے کاموں کو رکے ہوئے تھی' گورنمنٹ نے اس دعوت کا اعلان کر دیا۔

اس دعوت کی اولین راہ یہ تھی کہ گورنمنٹ نے ملک کے ان نمایاں پیشواؤں میں سے چند افراد کو گرفتار کیا' جن کے متعلق ملک کا خیال ہے کہ وہ تحریک خلافت کے روح رواں تھے۔ گورنمنٹ نے محمد علی' (1) شوکت علی' (2) مولانا حسین احمد' (3) ڈاکٹر کچلو' (4) پیر غلام مجدد' (5) مولانا نثار احمد' (6) جگت گرو سری شنکر آچاریہ جی (7) اور اسی سلسلے میں دہلی میں مولانا احمد سعید صاحب' (8) عبدالعزیز صاحب (9) اور دیگر اشخاص کو یکے بعد دیگرے گرفتار کر لیا۔

گورنمنٹ اگر گرفتار کرنا چاہتی تھی' تو گرفتاری کے لیے کسی جرم کی ضرورت نہ تھی۔ دنیا کی ہر قوم و ملک کی تاریخ میں ایک زمانہ آتا ہے' جب ملک کا ہر باشندہ' ظلم' گھمنڈ اور مادی طاقت کی نظروں میں مجرم بن جاتا ہے۔ اس لیے کہ وہ آزادی چاہتا ہے اور ظلم کا مقابلہ کرنا چاہتا ہے۔ قوم کی تاریخ میں یہ فیصلہ کن گھڑی ہوتی ہے۔

آج ہندوستان کا کون بدبخت بسنے والا ہے جو گورنمنٹ کی نظروں میں مجرم نہیں ہے؟ اور ہندوستان کا وہ کون محروم باشندہ ہے' جسے اس جرم سے انکار ہوگا؟

گورنمنٹ کی ہندوستان میں بدبختیوں کی اگر تاریخ لکھی گئی' تو یقیناً اس تاریخ میں سب سے آخری بدقسمتی یہ شمار کی جائے گی کہ گورنمنٹ نے اپنی اس سب سے بڑی سلطنت کو اپنی سب سے بڑی فتح سمجھا اور غرور سے دیوانی ہو گئی۔

گورنمنٹ نے ان زندانیان حق کے لیے ایک ایسا جرم انتخاب کیا' جو اگر جرم ہے' تو صرف محمد علی' شوکت علی' حسین احمد کا نہیں ہے' بلکہ فی الحقیقت سات کروڑ قائلان کلمہ لاالٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا' بلکہ ہندوستان کے 32 کروڑ بسنے والوں کا متفقہ جرم ہے۔

آپ کو معلوم ہے کہ پچھلے دنوں کراچی میں مرکزی خلافت کمیٹی کا ایک جلسہ ہوا تھا اور اس جلسے میں ایک ایسی تجویز بھی پاس کی گئی تھی' جو احکام شرعی کی بنا پر' انصاف اور اس کے قدرتی قانون کی بنا پر' گزشتہ اٹھارہ مہینے کے اندر بار بار پاس ہو چکی ہے۔ گورنمنٹ نے اسی تجویز کو گرفتاری کی بنیاد قرار دیا ہے۔

اب اس سلسلے میں سب سے پہلے یہ چیز ہمارے سامنے آتی ہے کہ اگر چند لمحوں کے لیے تسلیم کرلیا جائے کہ اس تجویز میں اسلام کا جو عقیدہ پیش کیا گیا ہے' وہ کوئی نیا عقیدہ ہے اور اس کی نئی بندش ہے۔ اگر یہ تسلیم بھی کرلیا جائے کہ اس تجویز میں اسلام کا جو عقیدہ پیش کیا گیا ہے' وہ کوئی نیا عقیدہ ہے' اور اس کی نئی بندش ہے۔ اگر یہ تسلیم بھی کرلیا جائے' تو کیا گزشتہ اٹھارہ مہینے کے اندر اس کا بار بار اعلان نہیں ہو چکا ہے؟ اسی قدر نہیں' بلکہ کئی سال پہلے بھی اس کا اظہار و اعلان ہو چکا ہے۔

1916ء میں جب گورنمنٹ نے مجھے نظربند کیا اور گورنمنٹ آف انڈیا نے اعلان کیا کہ یہ شخص ملک معظم کے دشمنوں سے سازباز رکھتا ہے' تو میں نے ایک چٹھی لکھی تھی اور نہایت تفصیل سے اسلام کے احکام درج کردیے تھے' جن کی رو سے کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ ایک لمحہ کے لیے بھی برٹش گورنمنٹ کی نوکری کرے۔

میرے الفاظ یہ تھے کہ نہ صرف یہ حرام ہے بلکہ قرآن و حدیث کے احکام کے بموجب یہ لفظ کافی نہیں کہ حرام ہے' بلکہ اسلام اور کفر کا فیصلہ کردینے والا ہے۔ ہر لمحہ جو ایک بدبخت کے لیے انگریزی جھنڈے کے نیچے گزرے گا' وہ اس کے لیے حرام ہے۔

1916ء میں میں نے یہ چٹھی وائسرائے کے پاس بھیجی تھی۔ اس کی نقل گورنمنٹ آف انڈیا کے پاس موجود ہونا چاہیے۔ کیا کراچی میں اس مسئلے کی ابتدا ہوئی؟ نہیں۔ اس مسئلے کا بار بار اعلان ہوتا رہا ہے۔ 28 فروری 1920ء کو جب مسئلہ خلافت کے ابتدائی ایام تھے' انہی ایام میں کلکتہ میں خلافت کمیٹی کا جلسہ ہوا' اس کا صدر میں تھا۔ اس جلسے میں کراچی کی تجویز سے بھی زیادہ صاف لفظوں میں' خصوصیت سے سپاہیوں کو

مخاطب کر کے اسلام کے اس عقیدے کا اعلان کیا گیا تھا کہ موجودہ حالات میں چونکہ انگریزی حکومت اسلام کے مقابلے میں لڑنے والا جتھا ہے' اس لیے کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ برٹش گورنمنٹ کی فوج میں نوکری کرے یا نوکر رکھائے۔

یہ تجویز اور مختلف جلسوں میں بھی بار بار پاس کی گئی۔ بریلی میں جمعیتہ العلماء کا جلسہ ہوا۔ وہاں بھی یہ پاس ہوئی۔ پھر میں آپ کو بتلانا چاہتا ہوں کہ میری انہی انگلیوں سے اٹھارہ مہینوں کے اندر تین جزو سے زیادہ صفحات اس موضوع پر لکھے گئے اور وہ چھپ کر شائع بھی ہو چکے' جس کی بارہ ہزار سے زیادہ کاپیاں نکل گئیں۔

اگر یہ جرم ہے تو اسے چھوڑ دو کہ اس جرم کی تیرہ سو برس کی تاریخ کیسی ہے! میں تو تمہارے سامنے اٹھارہ مہینے کی تاریخ دہرا رہا ہوں' جب اس جرم کا پکار پکار کر اعلان کیا گیا' دس دس پندرہ پندرہ ہزار آدمیوں نے اپنی ٹولیاں بنا کر اس جرم کا ارتکاب کیا۔ اس وقت گورنمنٹ کے عمال کہاں تھے؟

پس فی الحقیقت اگر گورنمنٹ گرفتار کرنا چاہتی تھی' تو ہم اسے دعوتیں دے رہے تھے کہ کاش' وہ گرفتار کرنے کے لیے تیار تو ہو۔ جس وقت ان گرفتاریوں کا سلسلہ شروع ہوا' میں سچ کہتا ہوں کہ آرزو پیدا ہوئی کہ یہ گرفتاریاں اچانک شروع ہو کر رک نہ جائیں' اور سچ کہتا ہوں کہ اس اٹھارہ مہینے میں مجھ پر کوئی گھڑی ایسی نہ گزری تھی' جیسی وہ پاک گھڑی جب گورنمنٹ کی درماندگیاں سامنے آگئیں۔ اور اب اگر گرفتاریوں کا سلسلہ آگے نہ بڑھا' تو میرے قلب میں مایوسی کا داغ پڑ جائے گا کہ نصرت و مراد کا یہ ایک دروازہ تھا' جو افسوس کہ کھل کر بند ہو گیا۔

گورنمنٹ اگر گرفتار کرنے کے لیے تیار ہے' تو اور مجرموں کو چھوڑو' ایک مجرم تمہارے سامنے کھڑا ہے۔ اگر اس عقیدے کی دعوت جرم ہے' تو میں نے محض اعلان نہیں کیا' محض دور سے دعوت نہیں دی' بلکہ میں نے سپاہیوں سے کہا ہے کہ بارش کی بوندوں کی طرح خدا کی لعنت تم پر برس رہی ہے۔ اگر لعنت سے بچنا چاہتے ہو' تو انگریزی راج کی غلامی چھوڑ دو۔

ہاں' ہاں' میں نے سپاہیوں سے' ہندوستان کی برٹش فوج سے یہ کہا ہے' اور جب

تک میرے حلق میں آواز پھنستی نہیں، یہی کہتا رہوں گا۔ آج بھی اعلان کرتا ہوں اور جب تک میری زندگی باقی ہے، ہر صبح کو، ہر شام کو، میرا پہلا فرض یہی ہوگا کہ سپاہیوں کو ورغلاؤں، اور ان سے کہوں کہ گورنمنٹ کی نوکری چھوڑ دو۔ کیا عظیم الشان برٹش گورنمنٹ، جس کی حکومت میں کبھی سورج نہیں ڈوبتا، تیار ہے کہ گرفتار کرے؟ اگر یہ جرم ہے تو اس جرم کا ارتکاب تمام ملک کررہا ہے۔ میں نے سپاہیوں سے بھی کہا ہے، اور لوگوں سے بھی کہا ہے کہ تم سپاہیوں کے پاس چھاؤنیوں میں جاؤ اور سپاہیوں کو یہ پیغام سناؤ۔ پھر برٹش گورنمنٹ اگر اپنی طاقت کا گھمنڈ رکھتی ہے، تو کیوں نہیں قدم آگے بڑھاتی؟ کیا گورنمنٹ کی مشینری پر فالج گر گیا ہے؟

عزیزان من!

اس سلسلے میں یہ چیز میرے سامنے آئی ہے کہ گو بار بار اس مسئلے کا اعلان کیا جاتا تھا، مگر چونکہ اب گورنمنٹ نے اپنے ذہن میں بڑی دانشمندی سمجھ کر، مگر یہ بھول کر کہ اب ستون گرنے والا ہے، اور اس کا عالم یہ ہوا ہے کہ ہوش و حواس باختہ ہونے لگے ہیں، ہاں، چونکہ گورنمنٹ کی سطوت مٹنے والی ہے اور دنیا کی تاریخ نے، اور دنیا کی تاریخ کے فلسفوں نے، ہمیں بتلا دیا ہے کہ جب کسی قوم کے گھمنڈ اور طاقت کا زوال ہوتا ہے، تو جسمانی قوتوں کا زوال بعد میں ہوتا ہے۔ پہلے عقل کا زوال ہوتا ہے، یہ عقل کے زوال کا تماشا ہمارے سامنے ہے۔

میں نہیں جانتا کہ جو کچھ ہورہا ہے، تم اسے ایک ہنگامہ یا تماشا سمجھتے ہو، مگر یہ ہنگامہ نہیں ہے۔ دنیا کے لیے ایک عجیب و غریب منظر تیار ہورہا ہے۔ ہندوستان کی آنے والی تاریخ کا مورخ بے چین ہے۔ ہندوستان کی تاریخ اپنی فیصلہ کن گھڑیوں سے گزر رہی ہے، اور میری آنکھوں کے سامنے وہ منظر ہے، جو میں پچھلی تاریخوں میں دیکھتا تھا۔ میں اس وقت روما کو ڈوبتے ہوئے دیکھ رہا ہوں، میں کلدانیوں کا خاتمہ دیکھ رہا ہوں، میرے سامنے تخت جمشید الٹ رہا ہے، اور تاریخ عالم ہم کو انقلاب کا ایک آخری تماشا دکھا رہی ہے۔

درحقیقت یہ زوال عقل اور اختلال دماغ کا نتیجہ ہے کہ گورنمنٹ اپنے قدم کو

ہوشیاری کا قدم سمجھ رہی ہے' حال آنکہ یہ اس کے زوال کا قدم ہے۔ یہ گرفتاریاں انگریزوں کے زوال کا تماشا پیش کررہی ہیں۔ گورنمنٹ نے محمد علی' شوکت علی' سیف الدین کچلو' حسین احمد' شنکر آچاریہ کو گرفتار نہیں کیاہے بلکہ گورنمنٹ نے آخری اعلان کردیا ہے کہ وہ اسلام کو اور دنیا کی متفقہ سچائی کو گرفتار کرنا چاہتی ہے۔ لیکن گورنمنٹ کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس کا گھمنڈ لاکھ اونچا سہی' اسکے گھمنڈ سے بھی اونچی ایک طاقت موجود ہے۔ گورنمنٹ سمجھتی ہے کہ ہم سے بڑھ کر دنیا میں کون ہے' مگر وہ فاطر السموات والارض بتاتا ہے کہ حقیقی طاقتور اللہ تعالیٰ ہے۔ (10)

چونکہ گورنمنٹ نے اپنے عمل سے اسلام کو' اسلام کے عقیدے کو' دنیا کی عالمگیر صداقت کو' عالمگیر راستی کو چیلنج دیا ہے۔ اس لیے ہم میں سے ہر شخص کا فرض ہوگا کہ جب سچائی کو پامال کیا جائے' سچائی کو جرم قرار دیا جائے تو خواہ وہ کتنی ہی چھوٹی چیز ہو' اس وقت نوع انسان کے لیے بڑی سے بڑی عبادت یہ بن جاتی ہے کہ ظلم کا مقابلہ کرے۔

آخری حج کے موقع پر ایک شخص نے آں حضرت ﷺ سے پوچھا' سب سے بڑا اور سب سے بہتر جہاد کیا ہے؟ حضرت نے کچھ دیر تامل کرکے فرمایا (11) : "سب سے افضل جہاد ہے' ظالم حاکم کے روبرو کلمہ حق کا اعلان کر دینا!"

عزیزان من!

اگرچہ یہ مسئلہ ہمارے لیے کوئی نیا مسئلہ نہ تھا' جس کی پکار ہمارے لیے ضروری ہوتی' لیکن عاقبت نااندیش اور قریب زوال گورنمنٹ نے اس چیز کو جرم قرار دے کر آج ہر مسلمان کو اور ہر سچائی پسند انسان کو' ہندوستان کے ہر مسلمان اور ہر ہندو کو' جو دین کو' دھرم کو عزیز رکھتا ہے۔ مجبور کردیا ہے کہ وہ ساری باتوں سے بڑھ کر' سب سے بڑی نیکی' سب سے بڑا اجر' اللہ کی محبوبیت کا سب سے بڑا وسیلہ اسی چیز کو سمجھے اور پوری آزادی سے اعلان کرے کہ انگریزی گورنمنٹ کی نوکری حرام ہے' کفر ہے اور ہر سپاہی کو نوکری ترک کر دینا چاہیے۔

لیکن قبل اس کے کہ میں اس ٹکڑے کو ختم کروں۔ آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ

میری زبان سے ابھی لفظ "حرام" آپ نے سنا تھا۔ یہ لفظ عربی زبان کا ہے، مگر کیا عربی زبان کا لفظ ہونے کی وجہ سے اس کی سچائی اسلام کے لیے مخصوص ہوگئی؟ کون صداقت پسند ہے، انگریز ہو، عیسائی ہو، یہودی ہو، جو ایک منٹ کے لیے بھی مان سکتا ہے کہ ظالم کی مدد کرنا، بندگان خدا کا خون بہانا، ان کے پیروں میں غلامی کی بیڑیاں ڈالنا، ثواب کا کام ہے؟ کیا دنیا کا کوئی مذہب بھی ایک گھڑی کے لیے اسے تسلیم کرے گا؟

برٹش گورنمنٹ، اسلام کے اور ہندوستان کے مقابلے میں لڑنے والا فریق ہے۔ اس لیے برٹش گورنمنٹ سے مدد گاری کا کوئی رشتہ بھی رکھنا جائز نہیں۔ اگر آج یہ صورت ہوتی کہ برٹش گورنمنٹ گناہ اور پاپ کے لیے سپاہیوں کو نوکر نہ رکھتی، بلکہ نمازوں کے لیے نوکر رکھتی، تب بھی اس کی نوکری حرام ہوتی۔ جب برٹش گورنمنٹ فریق محارب ہے، تو اب یہ سوال نہیں رہا کہ اس کی نوکری میں ہم کو کیا کام کرنا پڑتا ہے۔ کوئی کام بھی کرنا پڑے، برٹش گورنمنٹ کی نوکری حرام ہے۔ اگر انگریزی راج کی فوج میں سپاہی کو گناہ نہیں کرنا پڑتا، بلکہ انگریزی راج، فوجی چھاؤنیوں میں مسجدیں اور مندر بنا کر مسلمان اور ہندو سپاہیوں سے کہتا کہ صبح و شام خدا کے آگے ماتھے ٹیکو، تو بھی میں یہی کہتا کہ انگریزی راج کی فوج میں بھرتی ہونا کسی ہندو مسلمان کے لیے جائز نہیں۔ اس نوکری کا اصلی مقصد وہ ارادہ ہے۔ وہ نیت ہے جس کی نسبت ابھی چند منٹ میں تم سنو گے کہ مسلمانوں کے لیے سب سے بڑا گناہ، سب سے بڑی معصیت، جو خدا کی لعنت کو پھیلاتی اور خدا کی پھٹکار کو ظاہر کرتی ہے، وہی عمل ہے جس کے لیے ہندوستان کے بدبخت مسلمانوں کو انگریزی فوج میں بھرتی کیا جاتا ہے۔

ہندوستان کی یہ فوج کس غرض سے ہے؟ صرف دو غرض سے: ایک تو وہ ہے جس کا تعلق ہندوستان کے اندر سے ہے، اور ایک وہ ہے جس کا تعلق باہر کی دنیا سے ہے۔

اگر تم پوچھنا چاہتے ہو کہ اس فوج کا ہندوستان میں کیا کام ہے؟ تو اس کا جواب میں نہیں دے سکتا، جلیاں والا باغ کی وہ مٹی دے سکتی ہے (12)، جو ہندو مسلمانوں کے خون سے تر ہو رہی ہے۔ کس نے اپنے بھائیوں پر گولیاں چلائی تھیں؟ ہندوستان کے

سپاہیوں نے!

ہندوستان کے اندر انگریزی فوج کا ہندوستان کا سپاہی کیا کرتا ہے؟ ہندوستان کو غلام بناتا ہے اور ہندوستانیوں کا خون بہاتا ہے۔ کیا تم جانتے ہو کہ ہندوستان کی حکومت ہندوستان کی طاقت کس نے پامال کی؟ میں تو بتلانا چاہتا ہوں کہ دو سو برس پہلے' جو انگریزی راج کے آنے کا زمانہ ہے' تمہارے ملک کو غلام بنانے کے لیے نہ دنیا کا خزانہ آیا تھا اور نہ برطانیہ کے جزیرے کے ڈھلے ہوئے ہتھیار آئے تھے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ کوئی انگریزی فوج نہیں آئی۔ ہندوستان کو غلام بنانے کے لیے اور کوئی برطانوی سونا چاندی نہیں آیا ہندوستان میں بکھیرنے کے لیے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے سے آج تک' بتاؤ کہ ہندوستان کی تاریخ میں ایک واقعہ بھی موجود ہے کہ ہندوستان کو انگریزی راج کا غلام بنانے کے لیے کوئی فوج بھی برطانیہ کے جزیرے سے آئی' اور کوئی لدا ہوا خزانہ سمندر کے کنارے لگا؟ جس سوراج کے لیے آج تم رو رہے ہو' جس کے لیے تمہارے دلوں میں سوراخ پڑ گئے ہیں' بدبخت ہندوستان کے بسنے والو' سن لو کہ اس سوراج کو خود ہندوستان کی فوجوں نے پامال کیا ہے' وہ ہندوستان ہی کی فوج تھی' جس نے مٹھی بھر گیہوں کے لیے اپنے دین کو' دھرم کو بیچا' جس نے اپنی روح کو' آتما کو انگریزوں کے حوالے کردیا' تاکہ ہندوستان کو' ان کے وطن کو' دیس کو' انگریز غلام بنا لیں! وہ ہندوستان ہی کا خزانہ تھا' جو اس قوم کے آگے ڈال دیا گیا کہ وہ جی بھر کر چوس لے ہندوستان کے خون کو۔ وہ تمہاری غفلت' تمہاری نااتفاقی تھی' جس نے تم کو غلام بنایا۔

آج صبح یہاں جو تقریریں ہورہی تھیں۔ میرے عزیز انہیں سن سن کر لعنت کی صدائیں بلند کررہے تھے۔ اس سے میرے دل میں جوش پیدا نہ ہوا۔ لائڈ جارج کا نام لیا جاتا ہے' تو تم چیخ اٹھتے ہو' لعنت! لعنت! لیکن' میرے دوستو' لعنت تمہاری غفلت پر' لعنت تمہاری ایمان فروشی پر' اور لعنت اس پر کہ تم نے خدا کی چوکھٹ چھوڑ دی اور بندوں کو معبود بنا لیا۔

میرے دوستو!

خدا کے اس آسمان کے نیچے اس ملک کے بسنے والوں سے بڑھ کر کوئی بدبخت ہو سکتا ہے کہ انہیں دو وقت کی روٹی بھی ملتی ہے' تو اس کام کے لیے کہ اپنے بھائیوں کا خون بہائیں اور اپنے وطن کو غلام بنائیں۔

اب سنو! ہندوستان کی فوج کو ہندوستان کے باہر کیا کام کرنا پڑتا ہے! میں وہ داستان' وہ کہانی تمہارے کانوں کو کیا سناؤں۔ اگر تمہارے دل کے ٹکڑے ہوں' تو اسے ان پر نقش کروں۔ آہ' وہ ترک' جو چھ سو برس سے اپنے سینوں کو اسلام کی حفاظت کے لیے ایک دیوار آہنی بنائے ہوئے ہیں' انہی ترکوں کے سینوں پر کس نے گولیاں برسائیں؟ بدبخت ہندوستانیوں نے۔ قسطنطنیہ کے ساحل پر کون قدم تھے' جو اترے؟ بدبخت ہندوستانیوں کے قدم۔ مسلمانوں کا خون بہانا' ایک ظالم کی زنجیر کو خدا کی آزاد مخلوق کے پاؤں میں ڈالنا' اس دنیا کی کون سی سچائی' کون سا دین' کون سا دھرم ہے' جو ایک گھڑی کے لیے بھی اسے نوع انسان کے لیے سب سے بڑی پھٹکار اور لعنت نہ کہے گا؟

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اور اسلام کے قانون نے اس نوکری کو' اس کام کو' جس میں انسان کا خون بہانا پڑے' ایک ایسا گناہ قرار دیا ہے' جس کے لیے رسول کی زبان پر کفر کا لفظ جاری ہوا ہے۔ اسلام کے قانون نے مسلمانوں ہی کا قتل نہیں' بلکہ کسی انسان کا بھی قتل کرنا اور اسکا خون بہانا' ایک بہت بڑی معصیت' گناہ' پاپ قرار دیا ہے چنانچہ سورۂ فرقان میں فرمایا ہے: یعنی "وہ لوگ جو خدا کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک نہیں کرتے' کسی جان کو قتل نہیں کرتے جسے اللہ نے روک دیا ہے' اور جسے اللہ نے حرام کر دیا' لیکن اگر انہیں کرنا پڑتا ہے تو صرف ان جانوں کے لیے وہ قتال جائز رکھتے ہیں' جن جانوں کو اللہ کی عدالت کے قائم رکھنے کے لیے سزا دینا ضروری ہے۔" (13)

اس قانون کی رو سے اگر قتل نفس جائز ہے۔ تو صرف ان جماعتوں' فوجوں' جتھوں کا' جن کا وجود دنیا کی ہدایت و حریت کے لیے' قوموں کے ایمان کے لیے' سچائی کی بقا کے لیے ایک فتنہ ہو۔ قرآن کے قانون نے فتنہ و فساد کو قتل سے زیادہ سنگین

قرار دیا ہے (14)۔ اسی طرح' جس طرح ایک جج' عدالت کی کرسی پر بیٹھ کر پھانسی کو جائز قرار دیتا ہے۔ قاتل اسکے سامنے اس جرم میں لایا گیا ہے کہ اس نے ایک آدمی کا خون کیا ہے۔ جج حکم دیتا ہے کہ قاتل کو پھانسی پر چڑھا دیا جائے۔ جج بھی قتل کرتا ہے' مگر اس کا یہ قتل کرنا' قتل نہیں ہے' زندگی کا اعلان ہے۔ قصاص میں تو فی الحقیقت زندگی چھپی ہوئی ہے۔ "اگر قاتلوں سے قصاص نہ لیا جائے' اگر ظالموں سے خدا کے بندوں کو نہ بچایا جائے' تو دنیا ظلم کا ایک جہنم بن جائے۔" (15)

شریعت نے قتل نفس کو سب سے بڑا گناہ قرار دیا ہے جو دنیا میں انسان کر سکتا ہے۔ اور اگر قتل نفس کو جائز رکھا ہے تو صرف فتنہ و فساد کے دور کرنے کے لیے' اور جب کہ علاج ہو جائے تو پھر اس علاج کو جائز نہیں رکھا۔

ایسی حالت میں کیونکر ممکن تھا کہ اسلام مسلمانوں کا مسلمانوں کے ہاتھوں قتل جائز رکھتا؟ اسلام نے بلا عذر شرعی مسلمانوں کے قتل کو ایک ایسی معصیت بتایا ہے کہ بمنزلہ کفر کے ہے۔ حضرت رسول ﷺ نے فرمایا' میرے بعد تم کافر نہ ہو جانا' کافروں کا چلن نہ اختیار کر لینا اور کافروں کا چلن یہ ہوگا کہ مسلمان مسلمانوں کی گردنیں مارنے لگیں۔ اسی طرح بخاری اور مسلم کی حدیث میں فرمایا' جس نے مسلمانوں پر ہتھیار اٹھایا' وہ مسلمانوں میں باقی نہیں رہا۔ یہ اللہ کے رسول کا قول ہے اور میں اسکی کوئی تاویل نہ کروں گا۔ اسی طرح قرآن کی نص قطعی موجود ہے: یعنی "جس شخص نے جان بوجھ کر کسی مسلمان کو قتل کیا' تو اس کی جزا یہ ہے کہ ہمیشہ جہنم کے عذاب میں رہے اور اللہ کی لعنت میں مبتلا رہے۔" (16)

بخاری و مسلم میں حضرت اسامہ کا واقعہ موجود ہے (17)۔ انھیں حضرت محمد ﷺ نے ایک خاص موقع پر دشمنوں سے مقابلہ کے لیے بھیجا تھا' جن کی قوتیں اسلام کو نقصان پہنچانے پر لگی ہوئی تھیں۔ حضرت اسامہ نے ایک شخص پر تلوار اٹھائی اور جوں ہی وار کرنا چاہا' وہ کلمہ توحید پکار اٹھا۔ حضرت اسامہ نے پروا نہ کی اور اسے قتل کر ڈالا۔ آنحضرت ﷺ کے سامنے یہ واقعہ بیان کیا گیا' تو حضرت اسامہ کہتے ہیں کہ سنتے ہی حضور کے قلب مبارک پر اس درجہ حزن و ملال چھا گیا کہ فرمایا: اے اسامہ' افسوس تو

نے اس آدمی کو مار ڈالا' حال آنکہ اس نے لا الہ الا اللہ کہا تھا! حضرت اسامہ کہتے ہیں کہ آپ بار بار اسی جملے کو دہراتے رہے اور بار بار اس پر افسوس و غم کا اظہار کرتے رہے۔ یہاں تک کہ میرے دل میں تمنا پیدا ہوئی کہ آج کے دن کے پہلے میں مسلمان ہی نہ ہوا ہوتا اور مجھے حضور کا یہ غم نہ دیکھنا پڑتا!

یہ اظہار غم اس لیے تھا کہ ایک ایسے شخص کو قتل کردیا گیا تھا' جو آخری وقت سہی' مگر مسلمان ہوگیا تھا۔ اسامہ نے عرض کیا' یا حضرت' اس شخص نے محض جان کے خوف سے کلمہ پڑھا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ خدا کو تو کیا جواب دے گا' جب کلمہ لا الہ الا اللہ خونیں چادر لے کر تیرے سامنے آئے گا۔

اس سے اندازہ کرنا چاہیے کہ ایک شخص نے میدان جنگ میں اس کلمے کا اقرار کیا' کب؟ اس وقت جب اسامہ کی تلوار اس کے سر پر پہنچ چکی تھی۔ زیادہ سے زیادہ ایک لمحہ وہ مسلمان رہا ہوگا۔ ایک لمحے کا مسلمان' اللہ کے رسول کو اتنا عزیز تھا!

اب مجھے بتاؤ کہ ان بدبخت مسلمانوں کا کیا حشر ہوگا' جنھوں نے ان مومنوں کو بندوقوں کا نشانہ بنایا۔ جو سو برس سے اسلام کی حفاظت کررہے ہیں؟ کھلی بات ہے کہ آج انگریزی فوج میں بھرتی ہونا یا اس فوج میں رہنا یا دوسروں کو رکھانا' یہ سب کے سب ملعون اور پھٹکار کے کام ہیں۔ یہ کام مسلمانوں کو مٹانے اور ہندوستان کو غلام بنانے بنانے کے کام ہیں' اس لیے اسلام کے قانون میں بہت بڑے کفر کے کام ہیں۔

میرے دوستو!

اگر کراچی کی تجویز میں اسی بات کا اعلان کیا گیا ہے' تو یہ کراچی کی تجویز نہ تھی' بلکہ اسلام کے قانون کا اعلان تھا۔ اب اگر یہ جرم ہے' تو میں تم سب سے پوچھتا ہوں اور ہر اس شخص سے' جس کے دل میں سچائی کا چراغ بجھ نہیں گیا ہے کہ کیا اسے اس جرم سے انکار ہوسکتا ہے؟ ہم کو معلوم ہے کہ برٹش گورنمنٹ کے پاس بڑے بڑے جیل خانے ہیں' لیکن کوئی ایسا جیل خانہ نہیں ہے' جس میں برٹش گورنمنٹ' سچائی اور ایمان کو قید کرسکے ......!

5

خطبہ صدارت

اجلاس جمعیتہ العلماء ہند (1)

لاہور، 18 - 21 نومبر 1921ء

جمعیتہ العلماء ہند کا یہ تیسرا سالانہ اجتماع ہے، جس کی صدارت کے لیے آپ نے اس عاجز کو منتخب فرمایا ہے۔ بلاشبہ یہ ایک بڑی عزت ہے جو ہندوستان کی اسلامی آبادی میں کسی خادم علم و ملت کو حاصل ہو سکتی ہے۔ لیکن دنیا کی تمام عزتوں کی طرح ادائے فرض و مسئولیت کا بارگراں بھی اپنے ساتھ رکھتی ہے۔ میں آپ تمام بزرگان دین کا شکرگزار ہوں اور امید کرتا ہوں کہ جس طرح آپ کے لطف و کرم نے مری بے بضاعتی کو قبول فرما لیا ہے، اسی طرح آپ کی رفاقت و مساعدت میری کمزوری اور درماندگیوں کے لیے بھی پردہ پوش ہوگی۔ آیئے! عزم و عمل کی اس نازک اور پرآشوب گھڑی میں ہم سب کے دل اس کارفرمائے حقیقی کے آگے جھک جائیں، جس کے فضل و کرم کے بغیر ہماری کوئی سعی و جستجو کامیاب نہیں ہو سکتی۔ وہ کریم کارساز ہماری درماندگیوں اور بے چارگیوں پر رحم فرمائے! ہماری خطاؤں اور لغزشوں کو بخش دے! اپنی رحمتوں اور برکتوں کا دروازہ ہم پر کھول دے! اور اس کی توفیق چارہ ساز کی دستگیریوں سے ایسا ہو کہ ہم سب کی نیتیں خالص ہم سب کے اعمال صالح، ہم سب کے ارادے

راسخ اور ہم سب کے قدم حق و صداقت اور صراط مستقیم پر قائم و استوار ہو جائیں۔
ربنا اتنا من لدنک رحمۃ وھی لنا من امرنا رشدا (2)

حضرات علمائے کرام!

قبل اس کے کہ ہمارا سفر نظر و فکر شروع ہو۔ مجھے ایک لحہ کے لیے ان عزیزان ملت سے مخاطب ہونے دیجئے' جو آج آپ کی مجلس میں چشم نظارہ اور دل پر شوق لے کر حاضر ہوئے ہیں۔

اے عزیزان ملت!

آیئے ایک نظر تفکر اس منظر پر ڈال لیجئے' جو اس وقت آپ کو دعوت نظارہ دے رہا ہے۔ آپ میں بہت سی آنکھیں ایسی ہوں گی' جن کے سامنے بارہا ارباب حکومت و دولت کی شان و شوکت نے جلوہ فروشیاں کی ہوں گی اور عجب نہیں کہ کچھ نظریں ایسی بھی ہوں گی' جو حکمرانوں کے درباروں کی ہیبت و جبروت کا نظارہ کر چکی ہوں' لیکن آج آپ دیکھ رہے ہیں کہ کشش و نظر فریبی کے ان تمام سامانوں اور جلووں میں سے کوئی ایک بات بھی یہاں نظر نہیں آتی' دولت کی شان و شوکت کا یہاں نام و نشان نہیں ہے' دنیوی حکومت و فرمانروائی کی نمود و نمائش سے یہاں کا گوشہ گوشہ خالی ہے' نہ زریں لباسوں کی آرائش ہے' نہ مسند نشینوں کی زیبائش' فقرائے علم کا مجمع ہے' بوریا نشینان حق کی مجلس ہے' نیاز مندان صدق و بے نیازان دنیا کا جمگھٹا ہے۔ یہاں آپکو اس دنیا کی شان و شوکت نہیں مل سکتی' جسے چھوڑ کر اس وقت آپ آرہے ہیں۔ البتہ اگر اقلیم حق اور شہرستان صدق و صفا کا جاہ و جلال دیکھنا مطلوب ہو' تو انہیں فقرائے علم کے پھٹے پرانے کپڑوں اور پر شکوہ صورتوں کے اندر ڈھونڈ لے سکتے ہیں۔ یہ ان لوگوں کا مجمع ہے جنہوں نے فقر و فاقہ کو ہمیشہ اپنی دولت سمجھا' زہد و تقویٰ کو اپنی اقلیم استغنا کا تاج و تخت بنایا۔ بے نیازی و بے مراوی کے لازوال خزانوں پر ہمیشہ قانع رہے اور عشق حق اور پرستاری علم کی بوریائے کہنہ پر بیٹھ کر دنیا اور دنیا کی ساری عظمتوں سے بے پروا رہے لیکن بایں ہمہ جن کے کبر حق اور سطوت الٰہی کا یہ عالم رہا کہ شاہان

عالم نے ان کے پھٹے پرانے دامنوں پر عقیدت و اطاعت کی آنکھیں ملیں اور تاج و تخت اور حکومت کو ہمیشہ ان کے پائے استقامت کی ٹھوکریں نصیب ہوئیں۔ انہوں نے اللہ کی چوکھٹ پر سرنیاز جھکا کر تمام کرۂ ارضی کی عظمتوں اور رفعتوں کو اپنے سامنے سرنگوں کر دیا تھا۔

مبیں حقیر گدایان عشق را کیں قوم
شہان بے کمر و خسروان بے کلہ اند (3)

یہ سچ ہے کہ آج یہ خود اپنی ہی غفلت و خود فراموشی کی بدولت اپنی وہ رفعت و عظمت الٰہی کھو چکے ہیں اور اب ان کی عظمت و جلال کی حقیقت بھی تاریخ ماضی کا ایک افسانہ بن کر رہ گئی ہے' خدا نے ان کو جس منصب عظیم و جلیل پر سرفراز فرمایا تھا' اس کی قدر انہوں نے نہ پہچانی اور خود اپنے ہی ہاتھوں اپنے شرف عزت کا خلعت پارہ پارہ کردیا۔ خدا نے دنیا کو ان کے سامنے گرایا تھا' لیکن افسوس ہے کہ یہ خود دنیا کے سامنے گر گئے۔ خدا نے ان کو صرف اپنی ہی چوکھٹ پر جھکایا تھا' لیکن انہوں نے انسانوں کی چوکھٹوں پر جبہہ سائی کی۔ جب اللہ اور اس کے کلمہ حق کی خدمت کی جانب سے ان کے دل غافل ہوگئے' تو دنیا نے بھی ان کی طرف سے آنکھیں بند کرلیں۔ بلاشبہ یہ ایک حقیقت ہے لیکن اے نظارگیان مجلس! خواہ زمانہ کے انقلابات و حوادث نے انہیں کتنا ہی حقیر و بے مرتبت بنا دیا ہو' لیکن خدارا' آپ انہیں چشم حقارت سے نہ دیکھیں' یہی ہیں' جنہوں نے اسی دنیا میں خدا کے رسولوں کی نیابت کی ہے۔ یہی ہیں' جو ان کی وراثت کے حقدار ٹھہرے ہیں۔ یہی ہیں' جن کے ہاتھوں میں امت مرحومہ اور خیرالامم کی قیادت و ہدایت کی باگ رہی ہے۔ یہی ہیں' جو آج تیرہ سو برس سے خدا کی زمین پر اس کے کلمہ حق کی حفاظت کررہے ہیں۔ یہی ہیں' جن کی عظمت لازوال کے نقوش صفحہ عالم پر ثبت ہیں اور جن کی ہیبت و سطوت کے افسانے آج تک زبان تاریخ پر جاری ہیں اور پھر یاد رکھیے کہ یہی ہیں' جو باوجود اپنی تمام کوتاہیوں اور درماندگیوں کے اب بھی آپ کی قسمت کے مالک اور آپ کی سعادت و شقاوت کی باگ اپنے ہاتھوں میں رکھتے ہیں۔ آپ کو اگر زندگی مل سکتی ہے' تو انہیں

کے ہاتھوں سے' اور اگر آپ اپنی کھوئی ہوئی عظمت دوبارہ حاصل کرسکتے ہیں' تو صرف انہی کی اطاعت اور پیروی سے:

در سفالیں کاسہ رنداں بخواری منگرید
کیں حریفاں خدمت جام جہاد بیں کردہ اند
قدیاں بے بہرہ انداز جرعہ کاس الکرام
ایں تطاول بیں کہ باعشاق مسکیں کردہ اند

(4)

اخلاص نیت اور اصابتہ عمل

حضرات!

ہمارا یہ اجتماع اور احتفال ایک جماعتی عمل ہے۔ ہم سب جمع ہوئے ہیں کہ اپنے گم کردہ مقصد کی جستجو کریں۔ اس لیے ضروری ہے کہ حکمت الٰہی نے تمام اعمال کی کامیابی کے لیے جو شرائط مقرر کردی ہیں' وہ اس عمل کی کامیابی کے لیے بھی ضروری ہوں۔ پس ہمارا پہلا فرض یہ ہے کہ مقصد کی جستجو سے پہلے خود اپنے اندر ان شرائط کی جستجو کرلیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو دو قوتیں عطا کی ہیں: دماغ دیا ہے' جو ارادہ کرتا ہے' اور اعضاء و جوارح دیئے ہیں' جو اس ارادہ کو فعل میں لاتے ہیں۔ پس ہر انسانی عمل کی کامیابی کے لیے قدرتی طور پر دو باتیں ضروری ٹھہریں: ارادہ کا صحیح ہونا' اور فعل کا صحیح طریق پر انجام پانا۔ دنیا کا کوئی عمل نہیں' جو ان دو شرطوں کے بغیر وجود میں آسکے۔ علوم و اخلاق میں ان ہی دو حقیقتوں کو مختلف ناموں سے تعبیر کیا گیا ہے۔ عزم' منصوبہ' تصور' اعتقاد' وغیرہ۔ سب سے وہی حقیقت مراد ہے' جو افعال سے پہلے وجود میں آئی ہے اور افعال کے لیے بمنزلہ علت و سبب کے ہوتی ہے۔ جب تک وہ نہ ہوگی۔ فعل بھی صحیح نہیں ہوسکتا۔ یہ بریڈلا ہال کی عمارت ہے' جس میں ہم سب آج مجتمع ہوئے ہیں۔ یقیناً اس کی دیواریں اور محرابیں ہاتھوں نے چنیں' اور اینٹ گارا بنا کر تیار کی گئیں۔ لیکن کیا یہ سب کچھ وجود میں آسکتا' اگر معمار اور انجینئر کے دماغ میں پہلے

اس کا صحیح نقشہ ارادہ و تصور کی حالت میں نہ کھنچ جاتا؟ پہلے یہ ہال انجینئر کے دماغ میں بن چکا' تب کہیں جاکر اس زمین پر وجود میں آیا۔ اسی حقیقت کو شریعت نے ایک جامع اصطلاح میں نیت اور عمل سے تعبیر کیا ہے اور تمام ایمانیات اور عبادات کو ان ہی دو حقیقتوں کی تصحیح و اصلاح سے مرکب کیا ہے۔ نیت' دماغ کا ارادہ اور دل کا یقین اعتقاد ہے' اور عمل اس کا ظہور ہے' جو ظاہر میں مرتب ہوتا ہے۔ پس شریعت بتلاتی ہے کہ تمام کاموں کی کامیابی کے لیے پہلی شرط نیت کی تصحیح اور درستگی ہے۔ یہی اصل جڑ ہے' باقی سب شاخیں۔ انما الاعمال بالنیات (5) اور لکل امری مانوی فمن کانت هجرته الی الله ورسوله فهجرته الی الله ورسوله ومن کانت هجرته لدنیا یصیبها اوا مراة تیز وجها' فهجرته الی ماهاجر الیه (6) فقیہہ الامت حضرت امام بخاری نے اسی لیے اس جامع الکلم کو اپنی جامع صحیح کا سرنامہ و عنوان قرار دیا' کیونکہ تمام اعمال کی بنیاد اور تمام ایمانیات و عبادات کی اصل یہی قانون الٰہی ہے اور اس لیے جو کچھ بھی اس کتاب میں روایت کیا گیا ہے' گویا وہ سب کا سب اسی کی شرح اور اسی اجمال کی تفصیل ہے۔

حضرات!

آپ نے اپنے بزرگانہ لطف و کرم سے جو خدمت میرے سپرد کی ہے' میں اس کی انجام دہی میں خیانت کروں گا' اگر اس حقیقت کی طرف سب سے پہلے آپ کو توجہ نہ دلاؤں۔ اس راہ کی سب سے پہلی شرط نیت کا اخلاص ہے اور ہر اس قلب پر فلاح و کامیابی کی لذت حرام ہے' جو اخلاص نیت کی دولت سے محروم ہو۔ اخلاص نیت سے مقصود یہ ہے کہ جو کام کیا جائے' اس سے مقصود صرف ادائے فرض ہو اور اللہ اور اس کی مرضات ہوں' (7) غرض نفس اور ذات کی خواہشوں اور آلودگیوں کو اس میں دخل نہ ہو۔ قرآن حکیم نے جابجا انبیائے کرام علیہم الصلوۃ والسلام کا اسوۂ حسنہ ہمیں بتلایا ہے کہ خدمت انسانی اور دعوت امت کی راہ میں ان کا اعلان کیا تھا! (8) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نسبت امام دارمی نے روایت کیا ہے کہ ہمیشہ یہ دعا مانگا کرتے اللھم اجعل عملی کله صالحا واجعله لوجهک خالصا والا تجعل لا حد فیه

شیبا (9)

حضرات! گزشتہ پچاس برس سے ہندوستان میں مختلف اغراض و مقاصد سے مجالس و اجتماعات کا سلسلہ شروع ہوا ہے اور جہاں ان کا وجود ہمارے تمام اجتماعی اعمال کے لیے بحکم شوریٰ ضروری ہے' وہیں نیات و مقاصد کے لیے ایک نئی امتحان گاہ بھی پیدا ہوگئی ہے۔ ان مجالس میں شہرت کے ذرائع ہیں' ترفع کے مواقع ہیں' نمود و نمائش کے مطامع ہیں۔ ان میں تقریریں کی جاتی ہیں' جن کی تحسین میں نعرہ ہائے توصیف بلند ہوتے ہیں' ان کے عہدے اور مناصف ہیں' جن کے لیے امیدواروں میں منافست و مسابقت کی کشمکش ہے' ان کی صدارت و ریاست ہے' جس کی طمع بسااوقات ہمارے اخلاص عمل پر غالب آجاتی ہے۔ پس' ہم سب کا پہلا فرض یہ ہونا چاہیے کہ اپنی اپنی نیتوں اور ولولوں کا کامل راست بازی کے ساتھ مراقبہ کریں' اور ان مہلکات راہ سے ایک لمحہ کے لیے بھی غافل نہ ہوں۔ ہمارا مقصود نہایت عظیم ہے اور ہم نے ادائے فرض اور خدمت انسانی کی ایک ایسی راہ میں قدم رکھا ہے' جس سے بڑھ کر ذمہ داری کی انسان کے لیے کوئی راہ نہیں ہو سکتی۔ ہمارے کاندھوں پر اللہ کے رسولوں اور نبیوں کی نیابت کا مقدس بوجھ ہے اور ہمارے سامنے حق کی شہادت اور امت مرحومہ کی احیاء و تجدید کا عظیم الشان کام ہے۔ حیف ہے' اگر ایک ایسے مقدس اور پاک کام میں بھی اپنی نیتوں کو پاک نہ رکھ سکیں اور اغراض و اہوا کی ایک ادنیٰ کدورت بھی ہمارے دلوں کو ملوث کر سکے' پس' ہر حال میں پہلا کام تصحیح و اخلاص نیت کا ہے۔ جب تک اس اولین منزل سے قدم کامیاب نہ گزر جائیں گے' فوزوفلاح کی کوئی منزل رونما نہیں ہو سکتی۔

دوسری شرط اس ارادہ کی صحت عمل ہے۔ صحت عمل سے یہ مقصود ہے کہ جب ارادہ و اعتقاد صحیح ہوگیا' تو اب اس کو فعل میں لانے کے لیے جو طریقے اختیار کیے جائیں' وہ نہج حق و صواب پر ہوں' یعنی ہر طرح کی گمرہی' کجروی اور کمزوری و نقائص سے محفوظ ہوں۔ اس بارے میں قرآن حکیم نے ہمیں بتلایا ہے کہ تمام برکات عمل کا اصلی مبداء و سرچشمہ انبیائے کرام کا اسوۂ حسنہ ہے۔ لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنتہ (10) اور قد کانت لکم اسوۃ حسنتہ فی ابراھیم والذین معہ (11)

اور پانچ وقت ہم خدا کی سکھلائی ہوئی یہ دعا مانگا کرتے ہیں : اھد نا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیھم (12) سورۃ نساء میں بتلا دیا ہے کہ جماعت من انعم اللہ علیھم کون ہے؟ فرمایا ہے' سب سے پہلا طبقہ ان میں انبیائے کرام کا ہے۔ الذین انعم اللہ علیھم من النبیین والصدیقین والشھداء والصالحین۔ (13) پس صرف وہی عمل مقبول ہو سکتا ہے' جو وجہ صواب پر ہوا' اور وہ نہیں ہے' مگر انبیائے کرام کا اسوہ۔ جو عمل اس اسوۂ متاسی طریقہ نبوت سے متحقق اور منہاج نبوت کے قدم بقدم نہ ہوگا' وہ کبھی مقبول و مشکور نہیں ہو سکتا۔

حضرات!

یہی وہ شرطیں ہیں جن کی تکمیل پر ہمارے تمام اعمال کی کامیابی بھی موقوف ہے۔ کتنا ہی اخلاص نیت ہو' لیکن صحت عمل کے بغیر عمل کی کامیابی حاصل نہ ہوگی۔ اسی طرح خواہ کتنا ہی بہتر طریق صواب اختیار کیا جائے۔ لیکن اگر اخلاص نیت کی رو سے عمل خالی ہوگا' تو کبھی کامیابی سے ہمکنار نہ ہو سکے گا۔ چنانچہ اسی بنا پر صحابہ و سلف سے آیہ کریمہ (14) کی تفسیر میں منقول ہے۔ (رواہ ابن عساکر و ابن کثیر والسیوطی (وغیرہم) پھر اس کی تشریح کی۔

لیکن سنت سے یہاں مراد صرف عبادات و طاعات ہی کی سنن نہیں ہے' بلکہ اعمال نبوت کے تمام سنن و نوامیس مقصود ہیں' جن کی راہیں اللہ تعالیٰ انبیائے کرام علیہم الصلوۃ و السلام پر کھول دیتا ہے اور وہ ان کے ذریعہ معالجہ نفوس و تزکیہ قلوب و تشکیل جماعت و تاسیس امت صالحہ و عاملہ کی شکل میں بدل دینا اور بکھرے ہوئے اجزاء سے ایک متحدہ و موتلف قومیت میں ڈھال لینا اور تمام امراض اجتماعیہ اور علل المعانویہ کی تداوی و طبابت سے عہدہ برآ ہونا ایک خالص عمل نبوت ہے اور انبیائے کرام کے بعد صرف وہی ورثائے نبوت اس عمل کو انجام دے سکتے ہیں' جو اسوۂ حسنہ نبوت سے متاسی ہوں' جن پر اللہ تعالیٰ نے حکمت نبوت کے اسرار و غوامض کا دروازہ وراثت و نیابت کھول دیا ہو۔ شرح اس اجمال کی بہت طولانی ہے' یہاں صرف اشارہ مقصود ہے اور ان مطالب کو اپنی بعض تالیفات میں مشرح لکھ چکا ہوں۔

حضرات علمائے کرام اور ارکان جمعیۃ!

اس وقت بہت بڑی آزمائش ہمارے طریق عمل کے لیے درپیش ہے۔ ہم نے مدتوں کی غفلت کے بعد قومی و اجتماعی اعمال کی کشمکش و کشاکش میں قدم رکھا ہے۔ اس لیے سب سے پہلے ہماری نظر آج کل کے مجلسی و اجتماعی کاموں کے طرق و اسلوب پر پڑتی ہے اور تقلید و محاکات کا جذبہ ہمیں بے اختیار ان کی جانب کھینچنے لگتا ہے۔ لیکن میں آپ کو یاد دلاؤں گا کہ آپ کی راہ ان راہوں سے بالکل الگ ہے اور کتاب اللہ کی ہدایت اور حکمت نبوت کی سنت نے آپ کو دنیا اور دنیا والوں کے تمام گھڑے ہوئے طریقوں اور قاعدوں سے مستغنی کردیا ہے۔ آپ اس لیے نہیں ہیں کہ انسانوں کے بنائے ہوئے طریقوں کی تقلید کریں۔ بلکہ آپ کو علم و شریعت اس لیے دیا گیا ہے تاکہ دنیا کی آنکھیں آپ کی طرف امید و طلب سے اٹھیں اور آپ کی ہدایت ان کے لیے اتباع و تقلید کا پیام ہو۔ آپ کے پاس اللہ کی کتاب ہے اور اس کے رسول کی سنت ہے اور ان دو چیزوں سے بڑھ کر اور کونسا مبداء علم اور سرچشمہ حکمت ہوسکتا ہے' جو انسانی اعمال کے تمام اصول و فروغ کے لیے دنیا میں وجود رکھتا ہو! دنیا میں علم و یقین صرف وحی الٰہی اور علوم و اعمال نبوت ہیں۔ اسکے سوا علم و یقین کا اس سمائے دنیا کے نیچے وجود نہیں۔اس کے ماسوا جس قدر بھی ہے' قرآن پکار پکار کر کہتا ہے کہ ظن ہے' تخمین ہے' (15) قیاس ہے' (16) اٹکل ہے' (17) تخرص (18) اور تلعب بالریب (19) ہے' ظلم ہے۔

علم' یقین' برہان' بصیرت' فرقان' النور اور نور علی نور تو صرف اسی اعلم الخلائق اور اعرف العباد کی درسگاہ سنت و حکمت سے مل سکتا ہے' جو شک کی جگہ یقین کا' جہلم کی جگہ علم و بصیرت کا' ظن والے کی جگہ بینہ و حجت کا' قیاس و تخمین کی جگہ برہان و فرقان کا' اور ان سب سے بھی بڑھکر یہ کہ نور کا۔ کا' تمام نوع انسانیکے سامنے اعلان کررہا ہے اور تمام کرۂ ارضی کو یہ کہہ کر بلا رہا ہے۔ دیکھئے حاشیہ نمبر 20 تا 24-

پس اے علمائے ملت! آپ کو اپنے طریق عمل و نظم کار کے لیے صرف کتاب و سنت ہی کو دستور العمل بنانا چاہیے' اور ہر طرف سے آنکھیں بند کرلنی چاہئیں۔ دنیا علم

و بصیرت کے لیے آپ کی محتاج ہے۔ آپ کو علم و بصیرت کے لیے دنیا والوں کی احتیاج نہیں ہے:

دلارامی کہ داری دل دروبند دگر چشم از ہمہ عالم فرو بند (25)

حضرات!

اس تمہید بیان کے بعد میں بالکل آمادہ تھا کہ مقاصد و مطالب کا سفر شروع کروں' لیکن اچانک ایک غمگین حادثہ کی یاد نے میرے قدم روک دیئے۔ آپ کی اس جمعیتہ کا گزشتہ اجلاس مجمع علمائے ہند کے جس بزرگ و محترم و جود کی رہنمائی و صدارت میں منعقد ہوا تھا' آج وہ ہم میں نظر نہیں آتا' اور اسکی موجودگی کی برکتوں سے ہم محروم ہوگئے ہیں۔ میرا اشارہ حضرت مولانا محمودالحسن (26) کی ذات گرامی کی جانب ہے اور میں یقین کرتا ہوں کہ آپ میں سے ہر فرد کو انکی یاد دعوت غم دے رہی ہوگی۔ ان کی وفات بلاشبہ ایک قومی ماتم ہے اور ہم سب کو ان کی عزت میں چند لمحوں کے لیے رک جانا چاہیے۔

حضرات!

مولانا مرحوم ہندوستان کے گزشتہ دور کے علماء کی آخری یادگار تھے۔ ان کی زندگی اس عہد حرمان و فقدان میں علمائے حق کے اوصاف و خصائل کا بہترین نمونہ تھی۔ ان کا آخری زمانہ جن اعمال حقہ میں بسر ہوا وہ علمائے ہند کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیں گے۔ ستر برس کی عمر میں جب ان کا قد ان کے دل کی طرح اللہ کے آگے جھک چکا تھا' عین جوار حرم میں گرفتار کیے گئے' اور کامل تین سال تک جزیرہ مالٹا میں نظر بند رہے۔ یہ انہیں صرف اس لیے برداشت کرنی پڑی کہ اسلام و ملت اسلام کی تباہی پر بربادی پر ان کا خدا پرست دل صبر نہ کرسکا اور انہوں نے اعدائے حق کی مرضات واہوا کی تسلیم و اطاعت سے مردانہ وار انکار کردیا۔ فی الحقیقت انہوں نے علمائے حق و سلف کی سنت زندہ کردی اور علمائے ہند کے لیے اپنی سنت حسنہ یادگار چھوڑ گئے۔ وہ اگرچہ اب ہم میں موجود نہیں ہیں' لیکن ان کی روح موجود ہے' اور اس کے لیے جسم کی طرح موت نہیں۔

وما دام ذکر العبد بالفضل باقیا
فذالک حی وھو فی التراب ھالک (27)

اسوۂ یوسفی

حضرات!

ٹھہریئے! ابھی ایک اور جماعت بھی ہے جو آپ کے دلوں کو اپنی طرف کھینچ رہی ہے: یہ ہمارے رفقائے طریق ہیں' جو کل تک ہمارے ساتھ دعوت و تبلیغ حق میں سرگرم تھے' اور جن کو آج اس جمعیۃ کی صف اول میں ہونا تھا' مگر وہ یہاں نظر نہیں آتے' وہ اس وقت آپ کو کہاں ملیں گے؟ آپ انہیں اس مصر فراعنہ میں نہ ڈھونڈیں' جس کی وسیع آبادیاں اگرچہ آل فرعون کے لیے عیش کدۂ حکومت و آزادی کا حکم رکھتی ہیں' مگر اسیران بنو اسرائیل کے لیے سرتا سر زندان استبداد ہیں۔ وہ آپ کے کنعان ملت کے عزیز گم گشتہ ہیں۔ اگر آپ ڈھونڈتے ہیں' تو اسی یوسف کدۂ عزت و اقبال میں ڈھونڈیئے' جہاں اگرچہ السجن احب الی مما یدعوننی (28) کے زنجیر و طوق میں گرفتار ہیں' مگر فی الحقیقت انک الیوم لدینا مکین امین (29) اور کذالک مکنا لیوسف فی الارض (30) کا تاج و تخت فتح و مراد بھی اسی زنجیر و طوق سے ڈھالا جارہا ہے قد من اللہ علینا انہ من یتق و یصبر فان اللہ لا یضیع اجرالمحسنین۔ (31)

حضرات! قرآن کریم نے ہمارے سامنے حضرت یوسف علیہ الصلوۃ والسلام کا اسوۂ حسنہ پیش کیا ہے۔ (32) حضرت یوسف مصر کے بازاروں میں غلام بنا کر فروخت کیے گئے۔ پھر ان کے سامنے دو راہیں کھلیں: ایک میں اللہ کی معصیت تھی اور ایک میں انسان کا ظلم۔ انہوں نے قیدخانے کی مصیبت گوارا کرلی' مگر معصیت کی عیش و آزادی گوارا نہ کی۔ ان کو حق کی فتح اور ظلم کے خسران پر اس قدر یقین و ایمان تھا کہ خوشی خوشی قید خانے چلے گئے اور انکی روح ہمیشہ اس یقین سے معمور رہی کہ اگر وہ حق پر ہیں تو بالاخر کامیابی و فتح مندی ان ہی کے حصہ میں آئے گی۔ ان کے استغراق ایمانی اور

ادائے فرض دعوت حق کا یہ حال تھا کہ قید خانے میں بھی زبان کھلی' تو اپنے نفس کے لیے نہیں' بلکہ حق و ہدایت کی تبلیغ و دعوت ہی کے لیے کھلی۔ (33) بالآخر جب فیصلہ حق و باطل کا وقت آگیا' تو نصرت الٰہی ظاہر ہوئی اور جو زنجیریں قید خانہ مصر میں پہنائی گئی تھیں' وہی بالآخر مصر کا تاج و تخت بن کر نمودار ہوئیں۔ (34)۔ اس اسوۂ یوسفی کے بصائر و عبر بے شمار ہیں' مگر زیادہ نمایاں حیثیت جو ہمارے سامنے آتی ہے' وہ یہ ہے کہ جو شخص تاج مصر سر پر رکھنے کا طلب گار ہو' اس کے لیے ضروری ہے کہ پہلے زندان مصر کے طوق و زنجیر کو اپنے دست و گردن کا زیور بنا لے۔ ہم تخت مصر کا جاہ و جلال دیکھ کر للچانے لگتے ہیں' مگر زندان مصر کی قید و محن فراموش کر دیتے' حالانکہ طلب گاران تاج آزادی کے لیے پہلی منزل زندان و قید کی ہے:

اے کہ از دیدار یوسف غافلی داغ یعقوب و زلیخا رانگر (35)

بلاشبہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی چشم پر شوق ایک مدت کے ہجر و فراق کے بعد جمال یوسفی سے روشن ہوئی۔ (36) مگر معلوم ہے کہ فتح و مراد کی یہ روشنی اسی سفید چشم سے چمکتی تھی' جو ایک مدت مدید کے صبر و طلب سے دیدۂ یعقوب میں پھیل چکی تھی۔ (37) پس راہ کی پہلی آزمائش صبر کامل اور طلب صادق ہی کی ہے۔ جب تک طلب یعقوبی حاصل نہ ہو' طلعت یوسفی نظر افروز نہیں ہو سکتا۔

یا من شکی شوقه من طول فرقة

اصبر لعلک تلقی من تحب غدا (38)

مولانا روم کے اشارات اس مقام پر کیا لطیف و بدیع ہیں:

تو کہ یوسف نیستی' یعقوب باش

روز و شب درگریہ و آشوب باش

پیش یوسف نازش خوبی مکن

جز نیاز و آہ یعقوبی مکن (39)

سورۂ یوسف نے یہ حقیقت بھی آشکارا کر دی کہ اگر ایک غلام زندانی اپنے حسن عمل و استقامت سے ملک کے تاج و تخت کا مالک ہو جا سکتا ہے' تو کیا ایک پوری قوم

ایمان و عمل کے غیر مسخر اسلحہ سے مسلح ہو کر اپنی کھوئی ہوئی حکومت واپس نہیں لے سکتی؟ ہزار رخنہ بدام و مرا بہ سادہ دلی تمام عمر در اندیشہ رہائی یافت (40)

حضرات!

الحمدللہ کہ اسوۂ یوسفی کے اتباع و تاسی کا باب سعادت ملک و ملت پر کھل چکا ہے' اور زندان ہند میں اب روز بروز آزادگان حق کی تعداد بڑھتی جاتی ہے۔ ابھی ابھی ہم ملک و ملت کے محبوب و محترم پیشواؤں کو کراچی کے قید خانہ میں وداع کرکے آرہے ہیں اور آپ کی جمعیتہ کے سرگرم و فداکار ناظم مولانا احمد سعید (41) دہلی سے میانوالی کے جیل میں اس طرح پہنچائے گئے ہیں کہ ان کے جسم پر قیدیوں کا کمل پڑا ہوا تھا اور ہاتھ ہتھکڑیوں میں بندھے ہوئے تھے:

وحد ثتني يا سعد عنها فزدتني
جنونا فزدني من حديثك يا سعد (42)

حضرات!

اگر اللہ کی محبوبیت' خدمت ملت کی لازوال عزت' دعوت و شہادت حق کا شرف بے مثال' صرف ان ہی زنجیروں اور ہتھکڑیوں کے معاوضے میں مل رہا ہے' تو اس سے زیادہ ارزاں سودا اور کون ہو سکتا ہے! اور ہزار رشک و حسرت ان خوش نصیبوں پر جو اس دولت بیکراں اور سعادت بے ہمتا سے شاد کام ہوئے:

تمنت سليمى ان نموت بحبها
واهون شي عند نا ماتمنت (43)

حضرات!

یقیناً یہ وہی وقت ہے جس کی صحاح کی حدیث میں خبر دی گئی۔ الصبر فيهن كا لقبض على الجمر (44) (ان وقتوں میں ایمان و حق پر استقامت ایسی مشکل ہو جائے گی' جیسے انگاروں کو مٹھی میں لینا) سو واقعی آج یہی حال ہو رہا ہے' آج ایمان پر قائم رہنا گویا آگ سے کھیلنا ہے' اور اسکے لیے تیار نہیں' اسے چاہیے کہ اس شعلہ زار حق پرستی سے ہٹ جائے اور اسے جانبازان ایمان کے لیے چھوڑ دے۔

حضرات!

خدارا' بتلایئے' میں اپنے دل کے خونچکاں زخموں کا مرہم کہاں ڈھونڈوں؟ کون ہے' جو اس درد و غم کا لذت شناس ہو سکتا ہے' جس کو برسوں سے اپنے سینہ مجروح میں چھپائے ہوئے ہوں؟ جب سوچتا ہوں کہ ہمرہان طریق آج قید خانوں میں اسیر ہیں' اور میں نامراد جلسوں کی صدارت کرتا پھرتا ہوں' تو یقین کیجئے کہ مجھے اپنی اس زندگی اور نام نہاد آزادی سے وحشت ہونے لگتی ہے' اور میں لفظوں میں اور صداؤں میں درد و غم کی کشاکش ظاہر نہیں کر سکتا' جس سے میرا سینہ شق ہونے لگتا ہے۔ اگر احادیث میں روکا نہ گیا ہوتا کہ مومن کو ابتلا کی تمنا نہیں کرنی چاہیے' تو یقین کیجئے کہ میں اس آزادی سے اس قدر اکتا گیا ہوں کہ قید و بند کی آرزوئیں کرتا۔ اور اس کے لیے خدا سے دعائیں مانگتا۔ اس پر بھی آپ کو معلوم ہے کہ قطع نظر ایام گزشتہ کے پچھلے دو ماہ کے اندر میں اپنی جانب سے بار بار معاملہ کو انتہا تک پہنچا چکا ہوں' مگر نہیں معلوم' کیا بات ہے کہ ساری دنیا گرفتار کی جا رہی ہے' مگر مجھ مشتاق کے نام کوئی پیام نہیں آتا:

دیوانہ برا ہے رود و طفلی برا ہے یاراں! مگر ایں شہر شما سنگ ندارد (45)

حضرات!

مجھے یقین ہے کہ میں آپ کے دلوں کی سچی ترجمانی کروں گا' اگر ان تمام عزیزان ملت کو آپ کی جانب سے پیام محبت و تشکر پہنچاؤں۔ پس ان سب پر سلام' جو دین و ملت کے نام پر زندان ہائے ہند میں اسیر ہیں' ان سب کے لیے ہمارے دلوں کی مخلصانہ تبریک' ہماری روحوں کا لازوال عشق اور اللہ کی خوشنودی و محبت کی ابدی و سرمدی بشارت! وہ وقت دور نہیں ہے' جب یا تو ہم ان تک پہنچیں گے' یا ان کو اپنے حلقہ محبت و شوق کے اندر موجود پائیں گے۔ (46)

دعا اصحاب کہف

حضرات!

ابھی تھوڑی دیر ہوئی ہے کہ میں نے اس خطبہ کو شروع کرتے ہوئے اپنے دعائیہ

کلمات کا خاتمہ اس دعا پر کیا تھا ربنا اتنا من لدنک رحمة وھیئی لنا من امرنا رشدا۔ (47) آپ سے پوشیدہ نہیں ہے کہ یہ دعا بھی منجملہ اور ادعیہ قرآنیہ کے ہے اور سورۂ کہف میں ہمیں بتلایا گیا ہے کہ اصحاب کہف نے اتباع حق کی راہ میں اپنے وطن و دیار کو چھوڑتے ہوئے یہ مقدس دعا مانگی تھی' اصحاب کہف سے مقصود چند بندگان مومن و مخلص ہیں۔ ربی اعلم بعدتھم (48) جو ایک ایسی آبادی میں بستے تھے' جس میں ہر طرف ظلم و ظلالت کی حکومت چھائی ہوئی تھی اور کوئی گوشہ امن و عافیت ایسا نہ تھا جو پیروان حق کے لیے مامن و ملجا ہو سکتا۔ ان کا جرم صرف یہ تھا کہ وہ اللہ پر ایمان رکھتے تھے؟ اور طریق حق کو چھوڑ کر بطلان و ضلالت کے آگے سر جھکانا نہیں چاہتے تھے۔ (49) وہ صرف ایک ہی پروردگار عالم پر ایمان رکھتے تھے اور کہتے تھے کہ ہمارا سر اس کے آگے جھک چکا ہے' اب اور تو کسی ہستی کے آگے نہیں جھک سکتا۔ (50) لیکن یہ حق پرستی ان کے حکمران ملک کے قانون میں سب سے بڑا انسانی جرم ٹھہری اور جب کہ ان کی آبادیوں میں ظلم کے لیے عیش و آزادی تھی' کفر کے لیے عافیت تھی' گمراہی کے لیے امن تھا تو ان عشاق حق کے لیے صرف جنگلوں کے بھٹ اور پہاڑوں کے غاروں ہی میں امن و نجات کا گوشہ باقی رہ گیا تھا۔ بالآخر وہ آبادی سے نکل کر ایک پہاڑ کے غار میں پوشیدہ ہو گئے۔ اور انسانی آبادی کا دروازہ جن مظلوموں پر بند ہو گیا تھا' ان کے لیے خدا کے پہاڑ نے اپنی آغوش کھول دی۔ (51)

حضرات!

عہد قدیم کی یہ ایک داستان عبرت ہے جو کلام الٰہی نے ہمیں سنائی ہے اور اس بارے میں قرآن حکیم کا اسلوب بیان آپ کو معلوم ہے کہ وہ بحکم فیه بناء ما قبلکم و خبر ما بعدکم و حکم ما بینکم (رواہ الترمذی عن علی و صححه' ابونعیم فی الحلیته عن عدة طرق) ہمیشہ ماضی کو مستقبل کے لیے اور رفتہ کو آئندہ کے لیے بیان کرتا ہے اور اعمال انسانی کے یکساں و یک رنگ حوادث و ایام کو بطور تاریخی استقراء کے مرتب کر کے دائمی نتائج و عواقب کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں کہیں بھی مسلسل یا متفرق قصص و ایام ماضیہ کا ذکر کیا ہے' صاف صاف واضح کر دیا

ہے کہ مقصد جمع تاریخ اور نقل و حکایت نہیں ہے' بلکہ وہ حقیقت ہے' جس کے الگ کر دینے کے بعد تاریخ افسانہ بن کر رہ جاتی ہے اور اس کے وجود میں دنیا کے لیے کوئی سود اور فائدہ باقی نہیں رہتا۔ یعنی موعظت و تذکیر' انتباہ و اعتبار' واقعات و حوادث کے تسلسل و یک رنگی سے قوانین عالم کا ادراک و انکشاف اور گزشتہ سے آیندہ کا استباط۔ چنانچہ سورۂ ہود میں جس کا محور بیان یہی حقیقت ہے۔ فرمایا: وکلاء نقص علیک من انباء الرسل ما نثبت به فوادک وجاء ک فی هذه الحق و موعظته وذکری للمومنین۔ (52) اور عہد نوحؑ سے لے کر عہد موسوی تک کے ایام کا ذکر کرکے نتیجہ نکالا: وکذالک اخذ ربک اذا اخذ القرٰی وهی ظالمته ان اخذه الیم شدید ان فی ذالک لایة لمن خاف عذاب الاخرة (53) سورۂ یوسف کے آخر میں فرمایا وکاین من آیته فی السموات والارض یمرون علیها وهم عنها معرضون۔ (54) یعنی کائنات ہستی کی آیتوں میں سے ایک آیت تو ملکوت السماوات کی ہے جس کا تفکر ماخلقت هذا باطلا۔ (55) اور انی وجهت وجهی للذی فطر السموات والارض حنیفا۔ (56) کا باب عرفان و حقیقت کھولتا ہے اور دوسری قسم آیات ارضیہ کی ہے اور آیات ارضیہ میں سب سے زیادہ نمایاں آیت حوادث و ایام کی ہے جو ہمیشہ قوموں اور ملکوں پر گزر چکے ہیں اور اب یا تو صرف ان کی داستانیں زبانوں پر باقی رہ گئی ہیں۔ جعلنا هم احادیث (57) یا اطلال و آثار ہیں۔ بہت سے مٹ چکے اور بہت سے ٹوٹی ہوئی دیواروں اور ویران کھنڈروں کی شکل میں عبرت سرائی کے لیے باقی ہیں۔ منها قائم وحصید۔ (58) پس اس آیت میں حوادث و ایام امم کو بھی زمین کی آیتوں اور نشانیوں سے تعبیر کیا گیا اور اسی طرح سورۂ یونس' اعراف' شعرا وغیرہم میں بیان واقعات کے بعد فرمایا: فانظر کیف کان عاقبته المنذرین (59) فانظر کیفی کان عاقبته المجرمین (60) ان فی ذالک لایته وما کان اکثرهم مومنین (61) سورۂ نور میں بالکل واضح کردیا۔ ولقد انزلنا الیکم آیات مبینات ومثلا من الذین خلوا من قبلکم (62) اور عام طور پر بھی ہر جگہ ایام گزشتہ سے نتائج و عبر اخذ کیے ہیں اور انسان کی غفلت و اعراض پر افسوس کیا ہے کہ وہ آنکھ رکھ کر بھی نہیں دیکھتا اور

کان رکھ کر بھی نہیں سنتا۔ فکاین من قریتہ اھلکنا ھا وھی ظالمنہ فھی خاویتہ علی عروشھا و بئرمعطلتہ و قصر مشید افلم یسیروا فی الارض فتکون لھم قلوب یعقلون بھاء او اذان یسمعون بھا فانھا لا تعمی الابصار ولکن تعمی القلوب التی فی الصدور۔ (63)

غرض قرآن حکیم کا مقصد قصص و اخبار سے موعظت و تذکیر ہے۔ آج کل فلسفہ تاریخ کے بعض جدید مذاہب نے تاریخ اقوام سے قوانین اجتماع اور طبیعت اقوام کے اصول اخذ کیے ہیں' لیکن قرآن حکیم نے موعظت و تذکیر کے ایک لفظ میں بے شمار حقائق و معارف کے ساتھ اس حقیقت کو بھی آشکارا کر دیا ہے۔ قرآن کریم کا استدلال اس بارے میں یہ ہے کہ جس طرح عالم انسانی و مادی کے لیے ایک قانون طبیعت ہے اور اشیاء کے خواص و آثار ہیں' جو کبھی ان سے علیحدہ نہیں ہوسکتے: پانی ڈبوتا ہے' آگ جلاتی ہے' زہر کی یبوست ہلاکت کا باعث ہوتی ہے' صالح غذا سے جسم نشوونما پاتا ہے' ٹھیک اسی طرح عالم معنویات کے لیے بھی ایک قانون طبیعت ہے' اور اشیاء کی طرح عقائد و اعمال کے بھی خواص و نتائج ہیں' جو کبھی ان سے الگ نہیں ہو سکتے۔ باطل کے لیے ہمیشہ مٹنا ہے اور حق کے لیے ہمیشہ قائم رہنا ہے۔ اصلاح کا نتیجہ ہمیشہ زندگی ہے۔ ظلم و جور ضرور ہے کہ جب کبھی ہو' بالآخر شکست کھائے اور عدل و صداقت کے لیے ضروری ہے کہ جب کبھی ہو' فتح پائے۔ قرآن حکیم نے اسی قانون معنوی کو جا بجا سنت اللہ اور فطرۃ اللہ کے لفظوں سے تعبیر کیا ہے۔ کیونکہ فی الحقیقت یہی ناموس خلقت ہے' آئین طبیعت ہے' آگ کی حرارت اور پانی کی برودت سے بھی زیادہ محکم و غیر مبدل۔ اور صرف عالم حیوانات ہی میں نہیں' بلکہ کارخانہ ہستی کے ایک ایک وجود اور ایک ایک ذرہ تک میں جاری و ساری ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ دنیا میں ہمیشہ اسی قانون کے ماتحت قوموں کو زندگی ملی ہے اور اسی کے ماتحت وہ ہلاک ہوئی ہیں۔ اور چونکہ قانون دائمی ہے' اعمال یکساں ہیں' طبیعت غیرمبدل ہے' خواص لاینفک ہیں' اور نتائج و ثمرات ناگزیر ہیں' اس لیے آئندہ بھی ہمیشہ وہی ہوگا' جو ہمیشہ ہوتا رہا ہے۔ اور وقت کا امتداد و تغیر اللہ کے قانون مکافات و مجازات عمل کو متغیر نہیں کر

دے گا۔ زہر کھانے سے اگر ایک ہزار برس پہلے آدم مرجاتا تھا' تو ایسا نہیں ہو سکتا کہ اب زہر کھانے سے زندگی ملے' اور اگر آگ پانچ ہزار برس پہلے جلاتی تھی' تو ایسا نہیں ہوسکتا کہ اب اسکے شعلوں میں انگلی ڈالو اور ٹھنڈک اور راحت ملے۔ سنتہ اللہ فی الذین خلوا من قبلھم ولن تجد لسنتہ اللہ تبدیلا۔ (64)

چنانچہ اسی بنا پر جا بجا گزشتہ حوادث و انقلابات کے نتائج کو سنتہ الاولین کے لفظ سے تعبیر کیا ہے' اور آخرین کے لیے اس کو بطور دلیل و برہان استعمال کیا۔ انفال میں کہا وان یعودوا فقد مضت سنتہ الاولین (65) اور فاطر میں کہا فھل ینظرون الا سنتہ الاولین فلن تجد لسنتہ اللہ تبدیلا ولن تجد لسنتہ اللہ تحویلا (66) اور سورہ نساء میں فرمایا سنن الذین من قبلکم (67)

پس سنتہ اللہ سے مقصود یہ قانون نتائج حق و باطل اور آئین فلاح و خسران امم ہے' نہ کہ مادی و جسمانی خواص کا قانون' جیسا کہ معتزلہ جدید اور مفتوحین فتنہ علوم جدیدہ نے استدلال کیا ہے۔ ایسا استدلال قطعاً" تحریف معنوی ہے اور نظم قرآن کو بالکل درہم برہم کر دینا ہے۔

حضرات!

آپ حضرات کی نظر علم و بصیرت سے یہ حقیقت بھی مستور نہ ہوگی کہ قرآن حکیم نے اس ضمن میں جماعت انسانی کے وحدت اعمال' وحدت خواص اور وحدت نتائج کو ایک عجیب معجزانہ استدلال فطری کے ساتھ پیش کیا ہے۔ البتہ اس کی فقہ و معرفت کا دروازہ صرف انہی قلوب صافیہ پر کھل سکتا ہے' جن کو حق تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے انوار کتاب و سنت کے اکتساب و استنارہ کے لیے مجلی و مزکی کر دیا ہو' اور جنہوں نے ظلمات قیل و قال اور آرائے رجال و صناعات مخترعہ جدل و خلاف کو سبل متفرقہ یونانیہ و کلامیہ کے طلسمات ظنون اور کارخانہ جات اہوا سے نکل کر فضائے بیکنار حکمت قرآن و سنت کی سیر کی ہو۔ (68)

بہرحال قرآن حکیم نے حیات امم کے قانون الٰہی کا اعلان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ابتدائے خلقت سے جس طرح حق و عدالت کا ظہور یکساں رہا ہے' اسی طرح بطلان و

فساد کا ظہور بھی ہمیشہ یکساں رہا ہے۔ جس طرح حق کی صدائیں ہمیشہ ایک ہی طرح اٹھتی رہیں' اسی طرح ظلم و عدوان کے دعوے بھی ہمیشہ ایک ہی طرح کے ہوئے ہیں۔ جس طرح حق و ہدایت کی شکل و صورت اور خصائص و اوصاف ہر عہد میں ایک ہی طرح کے رہے۔ اسی طرح بطلان و فساد کا رنگ روپ بھی ہمیشہ ایک ہی طرح کا رہا۔ چنانچہ وہ جا بجا کہتا ہے بل قالوا مثل ما قال الاولون۔ (69) پھر اس استقراء کے بعد وہ اس قدرتی یقین و اذعان کی طرف رہنمائی کرتا ہے کہ جس طرح حق و باطل کی یہ دو زنجیریں متقابل و متوازی ابتداء سے چلی آتی ہیں۔ ضرور ہے کہ آیندہ بھی جاری رہیں' تاآنکہ حق کی آخری فتح مندی کا وقت آجائے اور بطلان و فساد کی تمام سرکش قوتیں مٹ جائیں۔ لیظہرہ علی الدین کلہ۔ (70) پس ماضی میں جو نتائج نکلے ہیں' ضرور ہے کہ مستقبل میں بھی نکلیں۔ ہمیشہ ایسا ہی ہوگا کہ حق و باطل' نور و ظلمت' ظلم و مظلومی کا معرکہ آویزش و کشاکش گرم ہوگا۔ حق کا یہ خاصہ طبیعت ہے کہ اس کی قوت' ظلم اور استعداد فساد جس قدر بڑھتی جائے گی' اتنا ہی وہ ہلاکت و خسران کے لیے زیادہ تیار ہوتا جائے گا۔ حق کی مظلومی میں بالطبع داعیہ فتح ہے اور ظلم کی سرکشی میں بالطبع داعیہ خسران۔ کچھ عرصے تک کشمکش جاری رہے گی اور فساد کو تکمیل مادۂ خسران کے لیے ایک خاص زمانے تک مہلت دی جائے گی۔ اس مہلت کو قرآن حکیم نے جا بجا تمتع الی حین اور تربص و انتظار و اجل سے تعبیر کیا ہے۔ اور اس خاص وقت کو جو فرمان الٰہی کے ماتحت ظہور نتائج کے لیے مطلوب ہوتا ہے' اجل مقدر اور اجل مسمّیٰ کہا ہے۔ ویستعجلونک بالعذاب ولولا اجل مسمی لجاء ھم العذاب۔ (71) اور سورۂ یونس میں فرمایا ویقولون متی ھذا الوعد ان کنتم صادقین قل لا املک لنفسی ضرا ولا نفعا الا ماشاء اللہ لکل امۃ اجل اذا جاء اجلھم فلا یستاخرون ساعۃ ولا یستقدمون۔ (72) پس جب وہ وقت آ جائے گا اور مادہ فساد تکمیل تک پہنچ کر انجار کے لیے تیار ہو جائے گا تو پھر حق و باطل کا آخری فیصلہ ظہور میں آئے گا۔ حق کی مظلومی و درماندگی فتح پائے گی۔ باطل کی مغرور طاقت و سطوت کچھ کام نہ دے گی۔ قرآن حکیم کی اصطلاح میں اس آخری فیصلہ کا نام قضا

بالحق ہے اور اب لوگوں نے اسے انتخاب اصلح اور بقائے امثل کے نام سے بھی پکارنا شروع کیا ہے۔ فاذا جاء امر اللہ قضی بالحق و خسر ھنالک المبطلون۔ (73)

حضرات!

اصحاب کہف کو اگر اپنے عہد کے ضلالت و طغیان سے درماندہ و لاچار ہو کر پہاڑ کی غار میں پناہ لینی پڑے' تو گو وہ عہد جا چکا ہے لیکن اس عہد کی ضلالت و طغیان اس دنیا سے رخصت نہیں ہوئی ہے۔ آج بھی عشاق حق کے عزم و ثبات کے لیے ایک ویسی ہی آزمائش درپیش ہے۔ آج بھی ظلم کی حکومت ہے' بطلان و فساد کی حکمرانی ہے جور و طغیان کا دور دورہ ہے اور اصحاب کہف کی بستی کی طرح صرف ایک ہی قطعہ ارضی نہیں' بلکہ تمام کرۂ ارضی کی خشکی و تری' حق و عدالت سے محروم ہو گئی ہے اور خدا کی زمین پر اس کے مظلوم و درماندہ بندوں کے لیے کوئی گوشہ امن و عافیت باقی نہیں رہا ہے۔ ظھر الفساد فی البر والبحر بما کسبت ایدی الناس۔ (74) گویا زمین کی تمام پچھلی نامرادیاں لوٹ آئی ہیں۔ اور تاریخ عالم کی ساری گزری ہوئی شقاوتیں ایک ایک کر کے پلٹ رہی ہیں۔ سر زمین اصحاب کہف کا جبر و طغیان' فراعنہ مصر کا ظلم و استبداد' نمارودۂ کلدان کا غرور و تمرد' اصحاب مدین کا انکار و اعراض' قوم عاد کا فسق و عدوان' یہ سب کچھ بیک ظرف و زمان جمع ہو گیا ہے۔ مصر' ایران' بابل و نینوا' یونان و روما' اگرچہ اپنے اپنے وقتوں میں اللہ کی صداقت و عدالت کے مقابلہ کے لیے اٹھ چکے ہیں' لیکن اب ان سب کی جگہ اور ان سب سے بڑھ کر یورپ کی مدنیت ملعونہ ہے' جو پانچ سال تک آگ اور خون کے سیلابوں میں غرق رہ کر بھی بدستور من ھو اشد منہ قوۃ (75) کا دعویٰ کر رہی ہے۔ اصحاب کہف کی جماعت چند انفاس پر مشتمل تھی۔ اس لیے پہاڑ کی غار میں انہیں پناہ مل گئی۔ لیکن آج اصحاب کہف کی سی مظلومی میں چند افراد ہی نہیں' بلکہ آبادیوں کی آبادیاں اور اقلیموں کی اقلیمیں تباہ ہو گئی ہیں' اور لاکھوں کروڑوں بندگان الٰہی پر ان کی بستیوں اور شہروں میں امن و آزادی کا دروازہ بند ہو گیا ہے۔ اس لیے نہ تو صحراؤں کے اس قدر گوشے ہیں جہاں انہیں پناہ مل

سکے اور نہ پہاڑوں کی اس قدر غاریں ہیں' جو انہیں اپنی آغوش میں لے سکیں۔

حضرات!

آیئے' قبل اس کے ہم اس صف ماتم میں بیٹھیں' زرا اپنی ان بربادیوں پر بھی ایک نظر ڈالیں' جن کے ماتم و فغاں سنجی کے لیے آج یہاں جمع ہوئے ہیں۔ تمام کرۂ ارضی کے مشارق و مغارب پر نظر ڈالیے اور ڈھونڈیے کہ پرستاران حق و اسلام کے لیے کوئی ایک گوشہ امن بھی آج باقی رہا ہے؟ سانپوں کے لیے بھٹ ہیں' اور درندوں کے لیے غار ہیں' جہاں امن و بے فکری سے اپنی رات بسر کرسکتے ہیں۔ مگر آہ! پیروان اسلام کے لیے آج تمام کرۂ ارضی میں چار بالشت زمین بھی امن و عافیت کی باقی نہیں رہی۔ (76) گویا اسلام کی پوری تیرہ صدیوں کی تاریخ اب محض ایک افسانہ ماضی اور حکایت رفتہ ہے۔ اوراق دفاتر میں پڑھ لی جا سکتی ہے' مگر بلاد و اقلیم میں دیکھی نہیں جا سکتی:

کان لم یکن بین الحجون الی الصفا
انیس ولم یسمر بمکنہ سامر (77)

حضرات!

معلوم نہیں کہ آپ کے کانوں کا کیا حال ہے' مگر میں اپنے نامراد سامعہ کو کیا کروں جس سے ہر لحہ ہر آن واشر الغوابتہ دنیا کی جگر دوز صدائیں ٹکرا رہی ہیں' اور مری مجروح آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ کفر و ظلم کے غلبہ و قہر سے ارض الٰہی کا ایک ایک چپہ چیخ رہا ہے۔ پرستاران حق کی غربت و بے کسی ہر طرف سرپیٹ پیٹ کر ماتم کر رہی ہے اور فضائے کائنات کا ایک ایک ذرہ قائم حق کو ڈھونڈ رہا ہے اور حامیان ملت کو پکار رہا ہے۔

یا ناعی الاسلام ثم رابغہ
قد زال عرف و بدا منکر (78)

شیخ سعدی نے قتل بغداد کا مرثیہ لکھا اور ابوالبقا نے تباہی اندلس پر ماتم کیا۔ وقت آگیا ہے کہ اس عہد کا ایک نیا ابوالبقا اندلس و بغداد کا نہیں بلکہ تمام عالم اسلامی کا مرثیہ

لکھے:

اصابها العین فی الاسلام نارتراث حتی خلت منه اقطار و بلد ان
تبکی الحنیفته البیضاء من اسف کما بکی لغراق الانف هیمان
علی د یار من الاسلام خالینه قد اقفرت ولها بالکفر عمران
حیثا لمساجد قد مارت کنائرما فیهن الانوا قیس و صلبان
حتی المحاریب تبکی وهی جامدة حتی المنابر ترثی وهی عیدان
یا غافلا وله فی الدهر موعظنه ان کنت فی سته فالد هر یقظان
اعندکم بناء من اهل اندلس فقد سری بحد یث القوم رکبان
کم یستغیث بناء المتضعنون وهم فتلی مرا سری فیما یهنزانسان
الانفرس ابیات لها هم واما علی الخیر انصار و اعوان
ماذا لتقاطلع فی الاسلام بینکم وانتمو یا عباد الله اخوان

لمثل هذا ینوب القلب من کمد
ان کان فی القلب وایمان اسلام (79)

حضرات!

یہ دعا اصحاب کہف نے اس وقت مانگی تھی' جب ان کی آبادی کے دروازے ان پر بند ہوگئے تھے۔ آیئے' آج ہم اسی دعا کو وسیلہ قبولیت بنائیں' جب کہ صرف ایک ہی آبادی کے نہیں' بلکہ تمام دنیا کے دروازے پیروان حق پر بند ہوگئے ہیں' اور ہر طرف ظلم و فساد کی حکومت پھیل گئی ہے۔ اس دعا میں رحمت الٰہی کی طلب ہے اور ارشاد امر کا سوال ہے۔ رحمت' اللہ کی وہ وصف کاملہ ہے جو ہر طرح کے فیض و بخشایش کا دروازہ کائنات ہستی پر کھولتی ہے اور رشد امر سے مقصود ہر طرح کی ہدایت و رہنمائی ہے' جو حصول و انجاح مقاصد کے لیے مطلوب ہو۔ پس گویا اعجاز بلاغت قرآن نے ان چند لفظوں کے اندر ان تمام برکات و مقاصد کو جمع کردیا ہے جن کی نوع انسانی محتاج ہوسکتی ہے۔ اس کو رحمت کی ضرورت ہے جو اس کی درماندگیوں اور خطاؤں کو بخش دے' اور ارشاد امر کی ضرورت ہے تاکہ صحیح راہ کامیابی پر چل کر کامران و فتح مند

ہو۔ ان ہی دو چیزوں کے ہم بھی آج محتاج و آرزومند ہیں۔ ہم نے خطائیں کی ہیں۔ پس اس کی رحمت مطلوب ہے' جو بخش دے۔ ہم نے راہ عمل گم کر دی ہے اور رشد و ہدایت کے سائل ہیں' تاکہ صراط مستقیم پر گامزن ہو جائیں: ربنا اتنا من لدنک رحمتہ وھی لنا من امرنا رشدا (80)

حضرات!

اب میں جمعیتہ العلماء کے وجود و مقاصد کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ اس سلسلے میں دو اہم مطالب سامنے آتے ہیں۔ ایک جمعیتہ العلماء کے مقاصد و وظائف کا مبحث ہے' جو اس وقت تک مسائل وقت کے انہماک کی وجہ سے بحث و نظر میں نہ آسکا۔ دوسرا موضوع مسائلِ حاضرہ کا ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ آرائش بیان و تزئین عبارت سے بالکل قطع نظر کر کے نفس مطالب بطریق اشارات گوش گزار کر دوں۔

مسئلہ احیاء و تجدید ملت

حضرات!

جمعیتہ العلماء کا قیام فی الحقیقت مسئلہ احیاء و تجدید ملت کی ایک فرع ہے' جو گزشتہ ایک صدی سے تمام عالم اسلامی میں دعاۃ اصلاح و ترقی کے لیے مبحث افکار و معرکہ آراء و نظارہ رہ چکا ہے۔ مسئلہ احیائے ملت کا مقصود واضح ہے' یعنی مسلمانوں کو موجودہ پستی و ادبار سے نکالنے اور ان کے عز و اقبال رفتہ کو واپس لانے کے لیے کیا اسباب و وسائل اختیار کرنے چاہئیں؟ اور راہ عمل و فوز کیا ہو سکتی ہے؟ اس بارے میں ابتدا سے تین مختلف مذاہب اصلاح ہیں۔ جو ہندوستان' مصر' ترکی' ایران' ٹیونس اور بلاد ترکستان و قفقار کے داعیان اصلاح نے اختیار کیے ہیں۔

پہلا مذہب وہ ہے جسے "اصلاح افرنجی" سے موسوم کرتا ہوں۔ گزشتہ صدی یورپ کے تمدن و صنائع کے ظہور و اعلان کا عہد تھا۔ یورپ کی پستی نہایت تیزی کے ساتھ گزر رہی تھی۔ جب یورپ کے تمدن کا ہوشربا جلوہ اسلامی ممالک کے سامنے بے نقاب ہوا' تو دو مختلف اثرات دو مختلف جماعتوں پر مترتب ہوئے۔ غالب جماعت نے تو

اپنی غفلت و جمود کی وجہ سے اس انقلاب و تغیر کی طرف نظر ہی نہ اٹھائی، لیکن ایک جماعت ارباب بینش و خبر کی بھی تھی جس نے فوراً تغیر احوال محسوس کیا۔ لیکن جیساکہ طبیعت بشری کا خاصا ہے، اپنی پستی و کمزوری اور جلوہ کی نظر فریبی و ہوشربائی کی وجہ سے بہ اول نظر مرعوب و مسحور ہوگئی اور مقابلہ و مقاومت کی جگہ تقلید و اطاعت کے جذبات اس میں پیدا ہوگئے۔ ہندوستان میں سرسید احمد خان (81) مرحوم اور ان کے متبعین و مقلدین، ٹرکی میں سلطان محمود خان (82) اور اس کے عہد کے وزراء مثلاً فواد پاشا (83)، مصر میں محمد علی پاشا (84)۔ ٹیونس میں خیرالدین (85) صاحب المسالک الاقوام" اور بیرم تونسی (86) صاحب "صفوۃ الاعتبار" وغیرہم اسی گروہ میں محسوب ہیں۔ انہوں نے اصلاح و تغیر کے لیے صرف یورپ کی تقلید، علوم حدیث کی ترویج، عادات و خصائل فرنگ کے تخلق و شبہ اور ان کے ذہنی و عملی تعبد و اطاعت کو آس کار و اعتقاد اصلاح قرار دیا۔

دوسرا مذہب "اصلاح سیاسی" کا مذہب ہے۔ یہ وہ جماعت ہے، جس کو اسلامی ممالک کے پولیٹیکل زوال اور سیاسی اختلال کا حد درجہ استغراق ہوا۔ اس لیے اس کی نظر اس طرف گئی کہ سب سے مقدم سیاسی اصلاح ہے۔ جب تک یہ ظہور پذیر نہ ہو، کوئی سعی سودمند نہیں ہوسکتی۔ ممالک اسلامیہ میں اسی مذہب اصلاح کے سب سے بڑے داعی مرحوم سید جمال الدین اسد آبادی (87) تھے اور ٹرکی میں مدحت پاشا (88) ابوالاحرار کی دعوت بھی اسی مسلک میں محسوب ہے۔

تیسرا مذہب اصلاح، "اصلاح دینی و اسلامی" کا ہے، اور اگرچہ اس مذہب کے دعاۃ بمقابلہ مذہب سابقہ قلیل رہے، مگر فی الحقیقت مسئلہ اصلاح میں یہی گروہ اصحاب رشد و ہدایت اور سالکین جادۂ اقتصاد و حق کا رہا ہے۔ بحکم حدیث غربت (89) "قلیل فی ناس سوء کثیر" گو ان کی تعداد قلیل اور ان کی صدائیں ضعیف رہیں، لیکن زمانہ روز بروز ان کی دعوت سے قریب تر ہوتا گیا اور مذاہب سابقہ کی نامرادیوں نے بہت جلد اس مسلک کی صحت و حفاظت دنیائے اسلام پر آشکارا کردی۔

اصلاح دینی کے مبادیات

اس آخری مسلک اصلاح کی بنیاد حسب ذیل مبادی و مقدمات پر تھی اور انھی کی دعوت و تبلیغ کے لیے 1912ء میں' میں نے الہلال (90) جاری کیا تھا۔

اسلام کے نظم شریعت میں دین و دنیا کی تقسیم نہیں ہے۔ اسلام نے شریعت الٰہی کو نوع انسانی کی تمام سعادت و ہدایت کا کفیل و سرچشمہ قرار دیا ہے اور مسلمانوں کی سیاسی' علمی' اخلاقی' قومی و مدنی زندگی کی بنیاد صرف ایک ہی حقیقت جامعہ پر ہے' یعنی شریعت اسلامیہ اور کتاب و سنت پر۔

2 مسلمانوں کی قومیت صادقہ کی بنیاد صرف شریعت کا علم و عمل ہے۔ شریعت نے انھیں بتلایا تھا کہ دنیا میں سب سے بڑی قوم وہی ہیں' وہی خیر الامم ہیں (91) وہی خیر البریۃ (92) ہیں' وہی شہداء علی الناس (93) ہیں۔ وہی شہداء للہ فی الارض (94) ہیں۔ ان کے عروج و سعادت کی علت صرف یہ تھی کہ قرآن حکیم اور سنت رسول کو انھوں نے اپنا دستور العمل و حیات قرار دیا تھا۔ قرآن حکیم کی نسبت صاحب قرآن کا اعلان تھا: ان اللہ یرفع بھذ الکتاب اقواما ویضع بہ آخرین (95) (رواہ مسلم) اللہ تعالیٰ اس کتاب کی ہدایت سے قوموں کو اٹھائے گا اور یہی ہے جس کو ترک کر کے قومیں گریں گی اور ہلاک ہوں گی۔ اور روایت حضرت علی عند ترمذی و ابو نعیم و الطبرانی فی الکبیر میں فرمایا: وھو الفصل لیس بالھزل من ترکہ من جبار قصمہ اللہ ومن ابتغی العدی فی غیرہ اضلہ اللہ الی ان قال من قال بہ صدق ومن عمل بہ اجر' ومن حکم بہ عدل' ومن دعا الیہ ھدی الی صراط المستقیم۔ (96) پس جب مسلمانوں نے قرآن و سنت کا علم و عمل ترک کر دیا' تو اقبال و عروج نے بھی ان سے کنارہ کشی کر لی۔ یہ مسلم اور حقائق تاریخی میں سے ہے کہ مسلمانوں کے عروج و اقبال کا سب سے بہتر و ارفع زمانہ وہی تھا' جب بجز کتاب و سنت کے علم و عمل کے اور کوئی تعلیم ان کی رہنمانہ تھی' یعنی عہد صحابہ کرام و خلفائے راشدین اولئک اصحاب محمد ابرھذہ الامتہ قلوبا و اعمقھا علما و اقلھا تکلفا' قوم اختارھم اللہ لصحبتہ نبیہ و اقامتہ دینہ فاعر فوالھم حقھم تمسکوا بھد یھم' فانھم کانوا

علی الھدی المستقیم (قالہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ) اور تنزل و فساد کا عہد اسی وقت سے شروع ہوا جب کہ اقوام ماضیہ مغضوبہ کے علوم و اعمال بشکل علوم و حیلہ و اعمال بدعیہ ان میں رائج ہوئے۔ ایک ہی علت کے دو مختلف نتائج نہیں نکل سکتے۔ پس اگر اب بھی مسلمان اپنے عروج رفتہ کو دوبارہ حاصل کرسکتے ہیں، تو اس کی صرف ایک ہی راہ ہے۔ اس کے علاوہ اور جس قدر راہیں بھی کھلی ہوں گی، گمرہی و فساد کی ہونگی۔ یعنی علم و عمل شریعت کا احیاء اور ترک و ہجر شریعت کا انسداد۔

3 اس مسلک کی بنیاد اس ایمانی اور اعتقادی حقیقت پر بھی تھی کہ شریعت اسلامیہ آخری و اکمل شریعت ہے۔ اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی (97) اور اس کا وعدہ ہے لیظھرہ علی الدین کلہ (98) یقیناً اس وعدہ کا ابھی ظہور نہیں ہوا۔ پس ضرور ہے کہ وعدۂ الٰہی ظاہر ہو اور اس لیے مستقبل کے لیے اگر کوئی راہ فوز و فتح ہو سکتی ہے، تو وہ صرف دعوت شریعت اور احیائے عمل بالقرآن ہی ہے۔

4 مسلمانوں سے اہتداء و اتباع شریعت مہجور نہیں ہوا۔ مگر علمائے اسلام کی غفلت و اعراض سے۔ شریعت کے علم و عمل کے وہی حامل و مبلغ تھے۔ اور امت کی حیات شرعیہ کا تمام دارومدار ان کی حیات علمی و عملی پر تھا۔ جب کتاب و سنت کا ترک و ہجر، تفرقہ و تشتت، وحدت اور سبل متفرقہ کا شیوع، اختلاف و تحزب کی عصبیت، علوم محدثہ کا استغراق، حب جاہ و ریاست کا استیلاء، فریضہ دعوت الی الخیر و امربالمعروف و نہی عن المنکر سے تغافل، اہوائے سلاطین و امراء کا اتباع، اجتہاد فکر و نظر کا فقدان، غرضکہ منصب نیابت نبوت کا ضیاع اور احبار و رہبان اہل کتاب کے متذکرۂ قرآن مفاسد کا بحکم یاتی علی امتی ما اتی علی بنی اسرائیل حذو النعل بالنعل (99) او کما قال۔ ظہور و احاطہ خود طبقہ علماء میں بحد کمال پہنچ گیا، تو اس کا لازمی نتیجہ امت کی ہلاکت تھا اور وہ ظہور میں آیا۔ وکان وعدا مفعولا۔ (100)

پس اب اگر اصلاح حال کی کوئی راہ صحیح ہے تو وہ صرف یہی ہے کہ علمائے امت کے طبقہ میں احساس حال کی تبدیلی پیدا ہو اور وہ اپنے منصب عظیم کو ازسرنو سنبھال لینے کے لیے آمادہ ہو جائیں اور اس طرح علم و عمل شریعت کا احیاء صورت پذیر ہو۔

ترکستان و بلاد روسیہ میں شیخ صدر الدین' مصر میں شیخ محمد عبدہ' شام میں شیخ عبدالرحمان کو ابی اور شیخ کمال الدین قاسمی و غیرہم' اسی مسلک اصلاح کے داعی تھے مگر سلطان عبدالحمید مرحوم کے استبداد نے مہلت عمل نہ دی اوران کے افکار نفاذ و عمل تک نہ پہنچ سکے۔

ایک چوتھا مذہب

ان تین جماعتوں کے علاوہ ایک چوتھی جماعت بھی ہمیشہ رہی ہے اور اب بھی موجود ہے' لیکن اس جماعت کا کوئی ایجابی مسلک نہیں ہے' محض سلبی وجود ہے' یعنی ارباب جمود و غفلت کا طبقہ۔ اس جماعت کو اصلاح سے انکار ہے اور ضرورت سعی و انقلاب سے گریز۔ اور پھر انہی میں وہ دعات فتن' علماء سو و مشائخ دنیا و دجاجلہ فساد بھی ہیں' جو ہر صدائے حق کے جحود اور ہر سعی اصلاح و عمل کے انکار و مقاومت کو اپنا فریضہ علم و عمل سمجھتے ہیں۔ میں نے ان کا ذکر نہیں کیا کیونکہ الحمدللہ ان کی کوئی مقاوم ہستی باقی نہیں رہی ہے۔ استحوذ علیھم الشیطان فانسھم ذکراللہ اولئک حزب الشیطان الا ان حزب الشیطان ھم الخاسرون۔ (101)

اصلاح دینی کے گزشتہ ایام

حضرات!

اس مسلک اصلاح کے مطابق اگرچہ ممالک اسلامیہ میں متعدد کوششیں علماء کے اجتماع و نہضت کے لیے کی گئیں۔ شیخ محمد عبدہ نے اپنے تمام آخری ایام حیات علمائے ازہر کے انتباہ و بیداری میں صرف کر دیے۔ شیخ محمد جزائری نے علمائے جامعہ زیتونیہ' تیونس کی ایک جمعیتہ اصلاح قائم کرنے کے لیے مدت العمرآہ و فغاں کی۔ شیخ عبدالرحمٰن کواکبی نے سجل جمعینہ ام القریٰ لکھ کر علمائے اسلام کی ایک بین الملی جمعیتہ کی تحریک کی۔ ہندوستان میں پہلے ندوۃ العلماء اورپھر جمعیتہ الانصار دیوبند قائم ہوئی۔ لیکن افسوس ہے کہ اس وقت تک کوئی سعی و تدبیر بھی سودمند اور کامیاب نہ ہوئی۔ اس ناکامی کے بھی واضح و بین اسباب ہیں۔ لیکن میں بخیال اختصار ان کی تشریح

نہیں کروں گا۔ بعض مساعی کے لیے استبداد حکومت مانع ہوا' بعض مساعی باہم دگر اختلافات و نزاعات کی وجہ سے ناکام رہیں۔ بعض تدابیر میں علمائے سوء کی مقاومت نے خلل ڈالا۔ اور اکثر کا یہ حال رہا کہ خود نفس دعوت و تدبیر کے اندرونی نقائص کامیابی میں حائل ہوگئے۔ از آں جملہ سب سے بڑا نقص ان تمام دعوتوں میں یہ رہا کہ گو اصلاً اصلاح دینی کی قسم میں داخل تھیں' لیکن بمصداق خلطوا عملا صالحا و اخر سیئا (102) جو طریق عمل اختیار کیا گیا تھا وہ ٹھیک نہج قویم و مستقیم پر نہ تھا' یعنی منہاج و اسوۂ نبوت کے علوم و اعمال کو ان میں غلبہ و احاطہ حاصل نہ تھا' اور کتاب و سنت کی دعوت خالص و بے آمیزش کی جگہ موجودہ عہد کے طرق محدثہ نے ان میں راہ پالی تھی' اور از آں جملہ ایک بڑا سبب ان کی ناکامی کا یہ بھی ہوا کہ اصول کی جگہ فروع کا استغراق داعیوں پر چھا گیا اور یہ حقیقت ان پر منکشف نہ ہوئی کہ راہ کی ہدایت و نہایت کا تعین کیونکر کرنا چاہیے۔ پس ایسا ہوا کہ جو طاقت اصل پر خرچ کرنی تھی' وہ بعض شاخوں پر صرف ہوگئی۔ مثلاً مسئلہ اصلاح نصاب تعلیم وغیرہ۔ اور اس طرح تمام کارخانہ دعوت درہم برہم ہوگیا۔ معہذا اس کارخانہ حیات اور کارگاہ مکافات و مجازات کا کوئی عمل بھی بکلی ضائع نہیں جاتا' جس کی بنیاد اعتقاد صحیح پر ہو۔ یہ کوششیں اگرچہ خود راہ نہ پا سکیں' لیکن انہوں نے آنے والے عہد کے لیے بہت کچھ راہ صاف کر دی اور کم از کم ان میں سے ہر سعی کا یہ نتیجہ ضرور نکلا کہ دعوت اصلاح دینی اور حرکت و نہضت علمائے ملت کے لیے وقت کی استعداد روز بروز بڑھتی گئی۔

دعوت الہلال

حضرات!

مجھے امید ہے کہ آپ مجھے خودستائی اور خود فروشی کا الزام نہ دیں گے' اگر میں بطور تحدیث نعمت اس موقع پر دعوت الہلال کا بھی ذکر کروں۔ عالم اسلامی کے ماضی قریب میں اصلاح دینی اور انتباہ و انبعاث علمائے ملت اور احیاء و تجدید امت کی جو دعوت ان تمام پچھلی دعوتوں کے طریقوں اور اسلوبوں سے بالکل مختلف اسلوب پر بلند

ہوئی ہے، وہ دعوت الہلال ہے۔

آج آپ کی یہ مقدس و مبارک جمعیۃ العلماء جس مقصد کی جستجو میں منعقد ہوئی ہے میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ یہ وہی یوسف مقصود ہے، جس کے فراق میں 1911ء سے متصل وا اسفا علی یوسف (103) کی فغاں سنجی کررہا ہوں اور جس کے لیے میں نے الہلال مرحوم کے صفحوں کو کبھی اپنے چشم خونیں کے آنسوؤں سے رنگا ہے اور کبھی اس کے سوا دو حروف کے اوپر اپنے دل و جگر کے ٹکڑے بچھا دیے ہیں۔ 1911ء سے لے کر آج تک یہ مقصد میرے دل کی تمناؤں اور آرزوؤں کا مطلوب اور میری روح کی عشق و شیفتگی کا محبوب رہا ہے۔ خدا کی کوئی صبح مجھ پر ایسی طلوع نہیں ہوئی اس مقصد کی طلب سے میرا دل خالی ہوا ہو، اور کوئی شام مجھ پر ایسی نہیں گزری، جب میں نے اس کی تمنا میں اپنے بستر غم و اندوہ پر بے قراری کی کروٹیں نہ بدلی ہوں۔ میں نے اپنی آزادی کی تمام فرصت اسی کے عشق میں بسر کی اور نظر بندی و قید کے چار سال بھی اسی کے فراق میں کاٹے۔ (104)

یذ کرنی طلوع الشمس صخرا　وأذكره لكل غروب شمس (105)

پس　　اے　　بزرگان　　ملت!

اگر آج علمائے امت کی یہ ہئیت مبارکہ جمعیۃ العلماء کی شکل میں طالع و نظر افروز ہوئی ہے، تو مجھے کہنے دیجئے کہ یہ میرے دہ سالہ سوالوں کا جواب ہے، میری تمناؤں اور آرزوؤں کا ظہور ہے، میری فریادوں اور التجاؤں کی قبولیت ہے۔ میرے لیے ما تشتهيه الانفس و تلذ الاعين۔ (106) اور یقیناً میری امیدوں کے قدیم خواب کی تعبیر ہے۔ هذا تاويل رؤياى من قبل قد جعلها ربى حقا (107):

کار زلف تست مشک افشنی اما عاشقاں
مصلحت را تہمت بر آہوئے چیں بستہ اند

(108)

جمعیتہ العلماء کا قاعدۂ اساسی

حضرات!

جمعیتہ العلماء کا قیام دراصل اسی آخری مذہب اصلاح و احیاء کا ظہور ہے۔ اور اس کی تاسیس حضرت امام مالک کے اس اعتقادی قاعدہ پر ہوئی ہے کہ لا یصلح آخر ھذہ الامتہ الا بما صلح بہ اولھا۔ اس امت کے آخری دور کی اصلاح بھی اسی چیز سے ہوگی، جس سے ابتدائی عہد کی ہوئی تھی، اور یہ قاعدہ ٹھیک ٹھیک حضرت صادق مصدوق کی اس خبر کے مطابق ہے جو مشہور حدیث غربت میں دی گئی۔ بدء الاسلام غریبا و سیعود کما بدا۔ (109) (رواہ مسلم) کہ اسلام کے لیے دو عہد غربت ہیں۔ ایک غربت اولیٰ اور ایک ثانیہ۔ پس ضرور ہے کہ جو کچھ غربت اولیٰ میں ہوا، غربت ثانیہ میں بھی ہو۔ اور جس چیز نے غربت اولیٰ کو فتح و اقبال اول سے بدل دیا ہے، وہی چیز اس غربت ثانیہ کو بھی اقبال ثانی سے بدل دے، اور وہ نہیں ہے مگر دعوت صادقہ و صالحہ کتاب و سنت اور احیائے علم و عمل شریعت۔ عضوا علیھا بالنواجذ (110) اور لن تضلوا ما تمسکتم بھما کتاب اللہ و سنتہ رسولہ: (111)

مصلحت دید من آنست کہ یاراں ہمہ کار
بہ گزارند و خم طرۂ یارے گیرند (112)

چنانچہ اسی حدیث غربت میں بھی اس کی تصریح موجود ہے۔ فطوبیٰ للغرباء وھم الذین یصلحون ما افسد الناس من سنتی (رواہ ترمذی) سبحان اللہ غرباء دور آخر کی خوش قسمتی اور مصلحین غربت ثانیہ کی بلند طالعی! کہ زبان حق ترجمان نبوت سے ان کے لیے مبارکی نکلی:

گدایاں را ازیں معنی خبر نیست
کہ سلطان جہاں باماست امروز (113)

حضرات!

یقیناً میں نے یہ عرض کرنے میں آپ تمام مجمع علم و بصیرت کے آراء و معتقدات کی ترجمانی کی ہے کہ جمعیتہ العلماء کے اعمال دعوت کے لیے قاعدہ اساسی یہی مسلک

ہے۔ اسی مقصد کو سامنے رکھ کر وہ موجودہ عہد غربت اسلام میں منصب نیابت و شہادت حق کے فرائض انجام دینے کے لیے مستعد کار ہوتی ہے اور بلاخوف رد کہا جا سکتا ہے کہ مسلک اصلاح دینی کی بنا پر عالم اسلامی کا یہ سب سے پہلا اجتماع علماء ہے۔ جو اس وسعت و اتحاد اور جمعیتہ اقوام کے ساتھ مجتمع ہوا ہے۔ جو کام اس وقت تک تمام بلاد اسلامیہ کی طلب و سعی سے بروئے کار نہ آسکا اور جس کی توفیق موجودہ عہد کی اسلامی حکومتوں کو بھی نہ ملی اور تمام مصلحین عہد اس کی تمنائیں اپنے ساتھ لے گئے' آج وہ آپ کی سعی و ہمت سے فعل و وجود تک پہنچ چکا ہے اور عمل و اقدام کی شاہراہ آپ کے آگے باز ہے۔ الحمد للہ الذی ھدانا لھذا وما کنا لنھتدی لولا ان ھدانا اللہ (114)

وظیفہ علم اور شہادۃ اولوالعلم

حضرات!

اس اصل کی تقریر کے بعد ضرورت تھی کہ جماعت علماء کے منصب و وظائف کی بھی پورے شرح و بسط کے ساتھ تفصیل کر دی جاتی اور یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی کہ طلب صلاح اور ادائے فرض کے سلسلے میں آج جو مقصد اصلی و قدیم ہے' وہی ہے جو روز اول سے وحی الٰہی نے جماعت علماء کے قرار دیا ہے۔

اس مقام پر سب سے پہلے زیادہ اہم مشہد علم حق کی شہادت و دعوت کا تھا' جہاں پہنچ کر ہم معلوم کرتے کہ حکمت الٰہی نے کائنات ہستی اور نوع انسانی کے قیام و سعادت کے لیے کونسا نظام ہدایت قرار کیا ہے۔ اور قرآن حکیم کے بیانات اس بارے میں کیا ہیں۔

قرآن حکیم نے بتلایا ہے کہ دنیا کی قوام سعادت کی بنیاد تین حقیقتوں پر ہے' جن کو اصطلاح قرآنی میں شہادت سے تعبیر کیا ہے۔ شھد اللہ انہ لا الہ الا ھو والملائکتہ واولوا العلم منکم قائما بالقسط لا الہ الا ھو العزیز الحکیم (115)۔ (آل عمران) اس آیتہ کریمہ میں بالترتیب تین شہادتوں کا ذکر فرمایا ہے۔ اللہ کی شہادت' ملائکہ کی شہادت' اولوالعلم یعنی علم والوں کی شہادت۔

قرآن حکیم جب کبھی لفظ شہادت کو اس سیاق و سباق کے ساتھ استعمال کرتا ہے'

جیساکہ یہاں ہے' تو شہادت کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اللہ کے کلمہ حق کی اس کی زمین پر گواہی دینا' یعنی اس کا اعلان و اظہار کرنا' ہدایت الٰہی کی دعوت کو قائم کر دینا' اور حق و صداقت کی تعلیم و بیان سے دنیا کی غفلت و ضلالت کا استیصال کرنا۔ پس وہ تمام امور جو بیان' اظہار' اعلان' تعلیم' دعوت اور قیام و قوام دعوت سے تعلق رکھتے ہیں' سب کے سب لفظ شہادت کے مفہوم میں داخل ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ اسلام نے فرمایا: کنت علیھم شھیدا مادمت فیھم (116) (معلما وداعیا الی الحق) سورۂ نساء میں ہے فکیف اذا جئنا من کل امۃ بشھید وجئنا بک وعلی ھولاء شھیدا (117) بالاتفاق اس آیت میں شہید سے مراد انبیائے کرام ہیں' جو حق کے معلم و ہادی اور اس کی دعوت کے بلند کرنے والے ہیں۔ اور دعوت حق کا اصلی سرچشمہ انہی کا وجود ہے۔ پس آیہ آل عمران میں شہادت سے مقصود شہادت حق و توحید ہے' خواہ زبان قال سے ہو' خواہ حال سے۔

اللہ کی شہادت سے مقصد صداؤں میں اس کی وحی ہے' اور مشاہدۂ و احوال میں کائنات ہستی کا نظام و جمال ہے۔ یہ آخری شہادت دنیا کے گوشے گوشے' چپے چپے' ذرے ذرے سے ہر آن و ہر لحظہ بلند ہورہی ہے' ہر سامعہ معرفت سنتا ہے اور ہر چشم عرفان اس کا مشاہدہ کرتی ہے۔ سنریھم ایاتنا فی الافاق وفی انفسھم حتی یتبین لھم انہ الحق۔ (118)

ملائکہ کی شہادت اس اعتبار سے بھی ہے کہ وہ وحی الٰہی کے سفیر و وسیط ہیں' اور اس اعتبار سے بھی ہے کہ کارگاہ ہستی کے تمام تغیرات و شئون کی اصلی علت انہی کے اعمال مدبرہ ہیں' اگرچہ ہمارا علم محدود محسوس نہ کرسکے۔ یہ ملائکہ سماویہ ارضیہ کی شہادت ہے جو تمام تغیرات کونیہ کے اندر سے فاطر السموات و الارض کی قدرت و حکمت کا اعلان کررہی ہے۔ ولکن یعقلھا الا العالمون۔ (119)

تیسری شہادت اولوالعلم یعنی علم والوں کی ہے۔ جب شہادت الٰہی کی ابدی و سرمدی نداؤں اور ملک السموات والارض کی غفلت شکن صداؤں سے غافل انسان اپنے کان بند کرلیتا ہے' تو پھر ایک تیسری شہادت کی ضرورت ہوتی ہے' جو خود انسانوں

ہی کے اندر سے اٹھے' وہ شہادت الٰہی کی حامل و مبلغ ہو' اور شہادت ملائکہ کے ادراک و معرفت کی راہیں کھولنے والی ہو۔ تیسری شہادت اصحاب علم و معرفت کی شہادت ہے۔ اصل اور اساسی طبقہ اس جماعت کا انبیائے کرام علیہم الصلوۃ والسلام ہیں اور پھر تبعاً" ان کے متبعین صادقین یعنی علماء و عرفائے حق ہیں' جو ہمیشہ نوع انسانی کی غفلتوں اور ضلالتوں کا مقابلہ کرتے ہیں اور خدا کی زمین کو اس کے کلمہ صدق و حق کی شہادت سے خالی نہیں ہونے دیتے۔

چنانچہ شاہدین حق کی یہ جماعت ابتدائے ظہور ہدایت سے برابر رہی اور جب تکمیل شریعت کا وقت آگیا اور اتمام نعمت کی وجہ سے حضرت خاتم الادیان و مکمل الشرائع و متمم النعم کا ظہور ہوا' تو اس شہادت الٰہی کا منصب بھی قیامت تک کے لیے انہی کے سپرد ہوا اور علمائے اسلام ان کے وارث اور نائب ٹھہرے۔ وکذالک جعلنا کم امتہ وسطا لتکونوا شھد آء علی الناس ویکون الرسول علیکم شھیدا۔ (120) نیز فرمایا: انا ارسلناک شاھدا و مبشرا ونذیرا و داعیا الی اللہ باذنہ وسراجا منیرا۔ (121) یعنی حق و ہدایت کی جو شہادت اس شاہد صادق نے امت مرحومہ کو پہنچائی ہے' امت مرحومہ تمام نوع انسانی اور کرۂ ارضی میں اس کے اعلان و قیام کی ذمہ دار ٹھہری' تاکہ جو روشنی اس سراج منیر سے حاصل کی ہے' اس سے تمام ارض الٰہی روشن کر دے۔

علمائے اسلام و فرض شہادت

پھر اس کے بعد واضح کرنا تھا کہ علمائے اسلام نے گزشتہ تیرہ صدیوں کے اندر کس طرح اس فرض شہادت کو انجام دیا ہے اور دعوت و اعلان حق کی راہ میں کیسی کیسی قربانیاں اور سرفروشیاں کی ہیں! دنیا کی کسی قوم کی تاریخ حق پرستی کی ایسی مثال نہیں دکھا سکتی' جن سے علمائے اسلام کی تاریخ کا ہر باب و صفحہ روشن ہے۔ دنیا کی کوئی طاقت و وحشت اور انسانی تاج و تخت کی کوئی ہیبت و سطوت بھی علمائے اسلام کے جذبہ اعلان حق پر غالب نہ آسکی اور دنیوی خوف و طمع کا کوئی منظر بھی انھیں اس راہ سے باز

نہ رکھ سکا۔ دنیا میں راہ حق سے روکنے والی صرف دو چیزیں ہیں اور ساری آزمائشیں انہی میں مضمر ہیں: ایک خوف ہے' ایک طمع۔ لیکن ان کے دلوں میں خوف تھا تو صرف اللہ کے جبروت و جلال کا' اور طمع تھی' تو صرف اسیؑ کی رضا و رحمت کی۔ یدعون ربهم خوفا وطمعا۔ (122) پس نہ تو خوف کا حربہ ڈرا سکتا تھا اور نہ طمع کی دلفریبی ان کے دل کو لبھا سکتی تھی۔

تزول الجبال الراسيات و قلبهم
على العهد لايلوى ولا يتغير (123)

حضرات!

وقت تھا کہ اسی سلسلہ میں آپ کو علمائے اسلام کے ادائے فرض کے چند مناظر دکھاتا۔

آپ حضرات سید التابعین سعید بن المسیب (124) کو دیکھتے کہ حکام کے جور کے حکم سے ان کی پیٹھ پر درے لگائے جا رہے ہیں' مگر ان کی زبان صدق اعلان حق میں پہلے سے بھی زیادہ سرگرم عمل ہو گئی ہے۔

آپ مدینہ کی گلیوں میں امام دارالہجرت حضرت مالک بن انس (125) کو دیکھتے۔ ان کی مشکیں اس زور سے کس دی گئی ہیں کہ دونوں بازو اکھڑ گئے ہیں اور اوپر سے پیہم تازیانے کی ضربیں پڑ رہی ہیں۔ اس عالم میں بھی جب زبان کھلتی ہے تو اسی مسئلہ کا اعلان کرتے ہیں' جس کو وہ حق پر سمجھتے تھے' لیکن وقت کی حکومت اس کے اعلان کو اپنے جبر و طاقت سے روکنا چاہتی تھی۔ یعنی مسئلہ طلاق مکرِہ کو۔ جب گورنر مدینہ نے تشہیر و تذلیل کے لیے اونٹ کی برہنہ پیٹھ پر سوار کرا کے گشت کرایا' تو ان کا یہ حال تھا کہ جب کبھی کوئی بازار یا مجمع سامنے آجاتا تو عین ضرب تازیانہ کی حالت میں کھڑے ہو جاتے اور پکار کر کہتے۔ من عرفني فقد عرفني ومن لم يعرفني فانا مالک بن انس اقول ان الطلاق المكره ليس بشيئ (حکاہ ابن خلکان)

مُکرَہ

آپ امام اہل سنت حضرت امام احمد بن حنبل (126) کو دیکھتے کہ معتصم باللہ (127) جیسا قاہر و باجبروت فرمانروا ان کے سامنے کھڑا ہے' تو جلاد کیے بعد دیگرے تازیانے لگا

رہے ہیں' پیٹھ زخموں سے چور چور ہو گئی ہے' تمام جسم خون سے رنگین ہو چکا ہے' اور یہ سب کچھ اس لیے ہو رہا ہے کہ جس مسئلہ کو وہ کتاب و سنت کے خلاف سمجھتے ہیں' اس کا ایک مرتبہ اقرار کرلیں۔ لیکن اس پیکر حق' اس مجسمہ سنت' اس صابر اعظم کما صبر اولوا العزم من الرسل (128) کی زبان صدق ترجمان سے یہی صدا نکل رہی ہے۔ اعطونی شیئا" من کتاب اللہ و سنتہ رسولہ حتی اقول۔

ما قصہ سکندر و دارا نخواندہ ایم

از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس (129)

آپ حضرات امام الاعظم امام ابو حنیفہ (130) رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ کو دیکھتے کہ قیدخانہ بغداد میں اسیر ہیں' لیکن اس پر بھی منصور عباسی (131) جیسے قاہر و سفاح بادشاہ کے حکم کے سامنے ان کا سر نہیں جھکتا۔

آپ کو امام شافعی 132 اس حالت میں نظر آتے ہیں کہ یمن سے بغداد تک قید و اسر کی حالت میں بھیجے جا رہے ہیں اور ان کا جرم صرف یہ ہے کہ حق کے داعی ہیں اور صدق و ہدایت پر قائم ہیں۔

آپ شیخ الاسلام احمد بن تیمیہ (133) کو دیکھتے کہ تین تین مرتبہ مصر کے قیدخانے میں اسیر کیے گئے اور بالآخر قیدخانہ ہی میں وفات پائی۔ مگر اظہار حق سے منہ نہ موڑا اور حکومت وقت کے آگے سر اطاعت خم نہ کیا۔

آپ خود اسی ہندوستان میں حضرت شیخ احمد سرہندی (134) مجدد الف ثانی کو دیکھتے کہ قلعہ گوالیار میں قید ہیں' مگر جہانگیر (135) کے آگے اس سر کو جھکانے کے لیے تیار نہیں' جس کو اللہ نے صرف اپنے ہی آگے جھکنے کے لیے بنایا ہے۔

آج ہندوستان میں صرف قید و بند ہی کی منزل ہمارے سامنے آئی ہے' اس لیے صرف انہی کا ذکر کر رہا ہوں' جنہوں نے راہ دعوت حق میں اس منزل کو مردانہ وار طے کیا۔ ورنہ علمائے حق اور ادائے فرض نیابت نبوت کا سب سے بڑا مشہد و منظر تو میدان شہادت ہے۔ جہاں انہوں نے صرف اپنی زبان ہی سے نہیں' بلکہ اپنے خون شہادت کی سرخی سے حق و صداقت کے نقوش ہمیشہ کے لیے صفحہ عالم پر ثبت کر دیئے ہیں۔

سدباب شہادت اور تنزل علم علماء

پھر اس کے بعد مجھے بالتفصیل عرض کرنا تھا کہ وہ کیا اسباب و بواعث ہیں' جن کی وجہ سے اس شہادت کے قیام و اجرا میں خلل پڑا! یعنی مسلمانوں کے تنزل علم و عمل کے مبادی و اساسات کیا کیا ہیں؟ کیونکہ جب تک امراض کی صحیح تشخیص نہ ہوگی' علاج صحیح کی راہ نہیں کھل سکتی۔

اصول مفاسد

اس سلسلہ میں مفاسد و مہالک کے اصول تھے اور فروع تھے۔ مبانی و مبادیات تھے۔ اور ان کا شیوع و اشعاب تھا۔ مجھے ایک ایک کرکے سب کو شمار کرنا تھا۔

اصل اس بارے میں وہ مفاسد و فتن ہیں جو ہمیشہ اقوام و شرائع کی ضلالت و فساد کا باعث رہ چکے ہیں اور اس لیے قرآن و سنت نے اول ہی دن ان سب کی توضیح و تشریح کردی تھی۔

ازاں جملہ وہ مفاسد ہیں' جن کا حال امم سابقہ علی الخصوص اہل کتاب کے اسباب ضلالت کی حکایت کرتے ہوئے قرآن حکیم نے جا بجا بیان کیا ہے۔ اور مقصود ان سے امت مرحومہ کا تنبہ و اعتبار ہے۔ چنانچہ حدیث ابوسعید عند بخاری و مسلم میں فرمایا

لتبتعین سنن من کان قبلکم حذو القذۃ" وفی لفظ حذو النعل بالنعل۔ (136)

اور ازاں جملہ فتنہ شبہات و شہوات ہے جس کی خبر حدیث عائشہ عند صحیحین و غیرہما میں دی گئی۔ (137) "شہادت" میں تمام ذہنی و اعتقادی مفاسد آگئے اور "شہوات" میں تمام عملی مفاسد۔

اور ازآں جملہ فتنہ تفرقہ و اختلاف ہے۔ جس کے اخبار سے دواوین سنت مملو ہیں۔

اور ازاں جملہ فتنہ تاویل الجاہلین و تحریف الغالین و انتحال المبطلین ہے' جس کی خبر حدیث ابراہیم بن العذری عند بیہقی میں دی گئی تھی اور جس کے تین جملوں میں سارے فتنے گن دیئے۔

اور ازاں جملہ فتنہ جدل و فتنہ تعمق و تنطع اور فتنہ اہواء ہے' جن کے اخبارات کو حضرت امام بخاری نے باب اعتصام بالسنہ میں ایک عجیب و دقیق ترتیب حکیمانہ و استنباط فقیہانہ کے ساتھ جمع کیا ہے۔

اور ازاں جملہ فتنہ مولدین و دخلاء ہے جس کی خبر حدیث ابن ماجہ میں دی گئی تھی کہ لم یزل امر بنی اسرائیل معتدلا حتی نشاء فیہم المولدون۔ (138)

اور ازاں جملہ فتنہ تولید وھن اور ترک جہاد فی سبیل اللہ ہے اور وھن کے معنی جتلا دیئے تھے کہ حب الدنیاء کراھتہ الموت (رواہ ابو داؤد) 139

فروع مفاسد

پھر ان مفاسد اصلیہ کے فروع اور برگ و بار ہیں' ضرور تھا کہ ان کی بھی تشریح کی جاتی: مثلاً نظام و قوام خلافت کی برہمی' تفرقہ قوئی و مناصب' حکومت شوریٰ کی جگہ حکومت شخصیہ و مستبدہ کا قیام۔

وحدت کلمہ اسلام کی جگہ تفرقہ مذاہب و احزاب کی فی الحقیقت راس الفتن اور علتہ العلل انقراض ملت یہی ہے۔

اسی طرح ترک اہتدابہ کتاب و سنت اور علوم اصلیہ کتاب و سنت کی جگہ علوم محدثہ و دخیلہ کا استغراق اور شیوع' فتنہ یونانیہ و عجمیہ کا ظہور کہ فتنہ شبہات اور فتنہ مولدین میں انہی دو سبب سے بڑے فتنوں کی خبر دی گئی تھی۔

اور ازاں جملہ علماء میں اصحاب مناصب و ریاست کی کثرت کہ بقول امام غزالی سب سے بڑا سبب علمائے دنیا کی کثرت اور علمائے آخرت کی قلت کا یہی ہوا۔ قالہ فی الاحیاء۔

اور ازاں جملہ خلافت عربیہ کا انقراض' عجمی حکومتوں کا قیام اور مرکزیت و وحدت خلافت کا فقدان' بالآخر تمام اسلامی حکومتوں کا زوال' علماء کا محکومیت و غلامی پر اقتناع' فریضہ جہاد و دفاع فی سبیل اللہ سے اعراض' ادائے فرائض و وظائف شرعیہ میں طرح طرح کے حیل و احتیال اور اسی طرح کے بیشمار فروعی مفاسد تھے' جن کا افسانہ درد

آپ کے آگے دہرانا تھا۔

اور ازآں جملہ اقوام مغضوبہ و مسفلہ کی موالات کا شیوع و استیلاء' جس سے کتاب و سنت میں بار بار روکا گیا تھا' اور صحابہ کرام اس فتنہ سے تعوذ کیا کرے تھے۔

طرق اصلاح

ان تمام تفصیلات کے بعد ان طرق اصلاح پر نظرڈالنی تھی' جو گزشتہ صدی میں عالم اسلامی کے تمام داعیان اصلاح نے اختیار کی ہیں اور پھر خاص ہندوستان کی سابق اور موجودہ حالت اور اس کی مقتضیات و داعیات پر بحث کرنی تھی۔ اس طرح واضح ہوتا کہ ہمارے لیے آیندہ مسلک عمل کیا ہونا چاہیے۔ اور اس کے ارکان و طرق حسب ہدایت کتاب و سنت کیا کیا ہیں؟ لیکن مسائل حاضرہ کے استغراق اور وقت کی قلت کا لحاظ کرتے ہوئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان تمام مباحث کو اس خطبہ کے مطبوعہ نسخہ کے لیے اٹھا رکھوں اور یہاں صرف یہ عرض کردوں کہ آیندہ کے لیے سب سے زیادہ مقدم اور بنیادی معاملہ کیا ہے۔

طرق تاسیس و تجدید

حضرات!

اس موقع پر میں آپ کی توجہ اس خطبے کے ابتدائی حصے کی طرف مبذول کراؤں گا۔ میں نے ابھی ابھی عرض کیا ہے کہ اس راہ میں شرط کامیابی یہ ہے کہ ہمارا عمل خالصاً" لوجہ اللہ ہو' اور نیز طریق صواب پر ہو' اور طریق صواب نہیں ہے مگر طریق سنت و منہاج نبوت۔

اس کے لیے میں دو لفظ بولوں گا: ایک لفظ "تاسیس" اور ایک "تجدید": ان کے معانی آپ پر روشن ہیں۔ تاسیس' اساس سے ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ ازسرنو کسی چیز کو بنانا۔ تجدید' جدت سے ہے اور اس کے معنی یہ ہیں کہ کسی پیشتر کی بنی ہوئی چیز کو تازہ کر دینا' اور اس طرح سنوار دینا گویا وہ بالکل نئی ہو گئی۔ آج ہمارے قومی کاموں کی ہر شاخ میں ایک بنیادی غلطی یہی ہے کہ ہم نے اصولی طور پر طریق اصلاح کا فیصلہ

نہیں کیا۔ مسلمانوں کی اصلاح حال کے لیے ضرورت طریق تاسیس کی ہے۔ یا تجدید کی' یعنی اس کی ضرورت ہے کہ از سرنو نئی باتیں' نئے طریقے' نئے ڈھنگ' نئے نظام اور نئی نئی چالیں اختیار کی جائیں' یا صورت حال یہ ہے پہلے سے ایک مکمل کارخانہ ملت موجود ہے۔ جس کو اپنے بقاو ترقی کے لیے کسی نئی بات کی احتیاج نہیں' مگر طرح طرح کی خرابیاں عارض ہوگئی ہیں اور بہت سی باتیں بڑھا دی گئی ہیں۔ پس ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ خرابیاں دور کر دی جائیں' کھوئی ہوئی چیزیں واپس لے لی جائیں' اور اس کو ویسا ہی بنا دیا جائے' جیسا کہ اصل میں وہ تھا۔

تاسیس کے معنی تو یہ ہوئے کہ آپ نے ایک نئی عمارت تعمیر کی۔ تجدید یہ ہوئی کہ مکان پہلے سے موجود ہے' صرف شکست و ریخت کی درستگی مطلوب تھی۔ پس اپنے نقائص دور کرکے درست کردیا۔ ہم کو غور کرلینا چاہیے کہ بنائے ملت کی درستگی کے لیے تعمیرات اساسیہ مطلوب ہیں یا صرف اصلاحات تجدیدیہ؟

اگر تاسیس مطلوب ہے تو بلاشبہ ہمارا پہلا کام یہ ہوگا کہ نئے نئے ڈھنگ اختیار کریں۔ لیکن اگر تجدید کی ضرورت ہے تو ہمیں نئی نئی چیزوں کی ضرورت نہ ہوگی۔ صرف یہ دیکھنا ہوگا کہ پہلے سے جو چیزیں موجود ہیں' ان کا کیا حال ہے! اور ان میں جو خرابیاں پیدا ہوگئی ہیں' وہ کیونکر دور کی جائیں!

حضرات!

دین کامل ہو چکا اور اتمام نعمت کا اعلان کردیا گیا۔ الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی (140) اور مجھے یقین ہے کہ ہم میں ایک فرد واحد بھی ایسا نہ ہوگا جو یہ کہے کہ اصلاح ملت اسلامیہ کے لیے قرآن و شریعت کی تعلیمات و نظامات کافی نہیں ہیں' اور ہمیں غیروں کی تقلید اور دریوزہ گری کی ضرورت ہے۔ پس یہ اصل تو متفق و مسلم ہے کہ راہ اصلاح میں ضرورت صرف تجدید کی ہے' تاسیس کی نہیں ہے۔ خود شارع علیہ السلام نے بھی ہمیں تجدید ہی کی خبردی' نہ کہ تاسیس کی ان اللہ یبعث لھذہ الامۃ علی راس کل مائۃ سنۃ من یجدد لھا دینھا (141) (رواہ ابوداؤد عن ابی ہریرہ) لیکن میں عرض کروں گا کہ اگر یہ سچ ہے تو عملاً نتیجہ اس اعتقاد کا

یہ ہونا چاہیے کے ہمارا قدم طلب اصلاح میں تاسیس کی طرف نہ جائے' اور وقت کے نظر فریب اسلوب کا علی الخصوص یورپ کے مجلسی و اجتماعی طریقے ہمیں نظم شرعی سے روگرداں نہ کردیں۔ افسوس ہے' اس وقت تک تمام داعیان اصلاح کا طرز عمل اس کے مخالف رہا ہے اور یقین کیجئے کہ یہی علت ہے کہ اس وقت تک ہماری کوئی سعی اصلاح و ترقی فوزوفلاح نہ پاسکی۔

اسلام اگر ایک دین کامل ہے' تو ضرور ہے کہ اس نے اپنے پیروؤں کی تمام انفرادی و اجتماعی اور مدنی ضروریات کے لیے کامل و اتم تعلیم دے دی ہو' اور اگر وہ دین آخری ہے تو ضروری ہے کہ اس کی تعلیم اور شارع کی عملی سنت ہر عہد' ہر زمانے' ہر حالت اور ہر مشکل و ضیق کے لیے رہنما و کفیل ہو۔ ہمارا ایمان ہے کہ حقیقت ایسی ہی ہے اور اسلام نے ہماری تمام اجتماعی و قومی برکات کا سامان کردیا ہے۔ لیکن پھر یہ کیا مصیبت ہے کہ ہم ان کھوئی ہوئی برکتوں کو واپس لینا نہیں چاہتے' مگر نئی نئی راہوں کی جستجو میں حیران و سرگرداں ہیں۔ مثلاً چند امور عرض کروں گا۔

قوم افراد سے مرکب ہے' اور افراد کی قومی ہستی کے قیام و ظہور کے لیے ضروری ہے کہ ایک جماعتی مسلک میں تمام افراد منسلک ہو جائیں' اور تفرقہ و تشتت کی جگہ وحدت و اتحاد پر افراد قوم کی شیرازہ بندی کی جائے۔ ہم اس کی ضرورت محسوس کرتے ہیں اور یورپ کے اجتماعی طریقوں کی نقالی کرنا چاہتے ہیں' لیکن یہ بھول جاتے ہیں کہ آخر اسلام نے بھی حیات اجتماعی کے لیے کوئی نظم ہمیں دیا تھا یا نہیں؟ اگر دیا تھا' اور ہم نے ضائع کردیا ہے' تو یورپ کی دریوزہ گری سے پہلے خود اپنی کھوئی ہوئی چیز کیوں نہ واپس لے لیں اور سب سے پہلے اسلام کا قرار واده جماعتی نظام کیوں نہ قائم کریں!

ہم دیکھتے ہیں کہ جب تک مجالس نہ ہوں' اجتماعیات نہ ہوں' انجمنیں نہ ہوں' کانفرنسیں نہ ہوں' کوئی قومی عمل انجام نہیں پا سکتا' نہ اتحاد و تعاون کی برکت حاصل ہوسکتی ہے۔ پس' ہم آج کل کے مجلسی طریقوں کے مطابق انجمنیں بناتے ہیں' کانفرنسیں منعقد کرتے ہیں۔ مگر ہم میں سے کسی کو بھی اس کا خیال نہیں آتا کہ اسی

مقصد اجتماع و تعاون کے لیے اسلام نے پانچ وقت کی نماز باجماعت' جمعہ و عیدین' اجتماع حج کا حکم دیا ہے' اور اس کا نظام و قوام درہم برہم ہوگیا ہے۔ سب سے پہلے اسے کیوں نہ درست کرلیں!

ہم دیکھتے ہیں کہ جب تک کوئی قومی فنڈ نہ ہو' اس وقت تک قومی اعمال انجام نہیں پا سکتے' پس' ہم نئے نئے فنڈ قائم کرتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے۔ مگر کاش کوئی یہ بھی سوچ کہ خود شریعت نے اسی ضرورت کو رفع کرنے کے لیے زکوٰۃ و صدقات کا حکم دیا ہے۔ اس کا نظام ٹھیک قائم ہے یا نہیں؟ اگر وہ قائم ہو جائے' تو پھر کبھی کسی چندہ یا فنڈ کی ضرورت نہ ہوگی!

ہم دیکھتے ہیں کہ قوم کی تعلیم عام کے لیے مجامع و محافل کی ضرورت ہے۔ ہم اس کے لیے نئی نئی تدبیریں کرنے لگتے ہیں۔ مگر کبھی یہ حقیقت ہمارے دلوں کو بے قرار نہیں کرتی کہ عین اسی مقصد سے شریعت نے خطبہ جمعہ کا حکم دیا تھا اور ہم نے اس کی برکتوں کا دروازہ اپنے اوپر بند کرلیا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ کوئی قومی و اجتماعی کام انجام نہیں پا سکتا جب تک اس میں نظم و انضباط نہ ہو' اور یہ ہو نہیں سکتا' جب تک اس کا کوئی رئیس و قائد مقرر نہ کیا جائے۔ پس ہم تیار ہو جاتے ہیں کہ جلسوں کے لیے صدر تلاش کریں۔ لیکن اگر یہی حقیقت شریعت کی ایک اصطلاح امامت کے لفظ میں ہمارے سامنے آتی ہے' تو ہمیں تعجب و حیرانی ہوتی ہے' اور اس کے لیے ہم تیار نہیں ہوتے۔

حضرات!

میں مثالوں میں آپ کا زیادہ وقت نہ لوں گا۔ مقصود یہ ہے کہ ہمارے لیے راہ عمل' تجدید و احیاء ہے نہ کہ تاسیس و اختراع۔ پس کسی طرح بھی یہ طریق صواب نہ ہوگا کہ علمائے امت کی جمعیت بھی اپنے نظام و قوام کے لیے محض آج کل کی مجلسوں کے قاعدوں اور طریقوں کی نقل و محاکات پر اکتفا کرلے۔ حاملین شریعت کا مقام اس سے بہت بلند ہے کہ وہ اپنے عمل کے لیے ان مجلسوں کے ڈھنگوں اور طریقوں کے محتاج ہوں۔ اس کی راہ اتباع شریعت اور اہتدابہ مشکوٰۃ نبوت کی ہے۔ اور اسوۂ حسنہ'

نبوت اور حکمت رسالت نے انہیں تمام انسانی طریقوں سے مستغنی و بے نیاز کر دیا ہے۔ ہمارا طریق عمل یہ ہونا چاہیے کہ ہم ہر طرف سے آنکھیں بند کر کے حکمت اجتماعیہ نبویہ کو اپنا دستور العمل بنالیں، شریعت کے کھوئے ہوئے نظام کو از سر قائم و استوار کر دیں، اور اس طرح اسلام کی مٹی ہوئی سنتیں زندہ ہو جائیں۔ محض مجلس آرائی و ہنگامہ سازی ہمارے لیے کچھ سودمند نہیں ہو سکتی۔

مسئلہ نظم جماعت

حضرات!

اب آپ مجھے اجازت دیں کہ میں مختصراً اس مسئلہ کی نسبت بھی کچھ عرض کردوں، جس کو میں علی وجہ البصیرت آج تمام اعمال اصلاحیہ کے لیے بمنزلہ اصل و اساس کے یقین کرتا ہوں اور کامل بارہ سال کے متصل غور و فکر کے بعد اس نتیجہ تک پہنچا ہوں کہ بغیر اس کے کبھی عقدۂ کار حل نہیں ہو سکتا۔ میرا اشارہ مسئلہ نظام جماعت اور قیام امارت شرعیہ کی جانب ہے۔

مسئلہ نظام جماعت سے مقصود یہ ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی اصلاح حال اور ادائے فرض شرعیہ کی استطاعت کبھی ظہور پذیر نہیں ہو سکتی۔ جب تک وہ اپنی موجودہ حیات انفرادی کو ترک کر کے حیات اجتماعی و شرعی اختیار نہ کرلیں۔ یعنی احکام نظام شرع کے مطابق سب ایک امیر و قائد شرع کی اطاعت پر مجتمع نہ ہو جائیں اور بکھرے ہوئے متفرق قومی مرکزوں کی جگہ ایک ہی مرکز قومی پیدا نہ ہو جائے۔ یہی اصل اساس کار ہے، اور تمام مقاصد اصلاح اور مصالح انقلاب کا نفاذ و ظہور اسی کے قیام و وجود پر موقوف ہے۔

حضرات!

اسلام کے نظام اجتماعی کی نسبت کسی شرح و تفصیل کی ضرورت نہیں، علی الخصوص ایک ایسے مجمع میں جیساکہ فضل و توفیق الٰہی سے اس وقت میرے گردوپیش موجود ہے۔ اسلام نے مسلمانوں کے تمام اعمال حیات کے لیے بنیادی حقیقت یہ قرار

دی ہے کہ کسی حال میں بھی فرادیٰ' متفرق' الگ الگ اور مشت نہ ہوں' ہمیشہ مجتمع' موتلف' متحد اور نفس واحدہ ہو کر رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن و سنت میں جابجا اجتماع و وحدت پر زور دیا گیا اور کفرو شرک کے بعد کسی بد عملی سے بھی اس قدر اصرار و تاکید کے ساتھ نہیں روکا جیساکہ تفرقہ و تشتت سے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اسلام کے تمام احکام و اعمال میں یہ حقیقت اجتماعیہ بمنزلہ محور و مرکز کے قرار پائی۔ اور تمام دائرۂ عمل اسی کے گرد قائم کیا گیا۔ عقیدۂ توحید سے لے کر تمام عبادات و اعمال تک یہی حقیقت مرکزیہ جلوہ طرازی کررہی ہے' اور اسی بنا پر بار بار نظم جماعت پر زور دیا گیا۔ علیکم بالجماعته والسمع والطاعته۔ (142) (رواہ ترمذی) اور علیکم بالجماعته فان الشیطان مع الفذ و هومن الاثنین بعد (143) (رواہ البیہقی) اور اذکان ثلاثته فی سفر فلیوم واحد کم۔ (144) (رواہ اصحاب السنن) اور اسی لیے نظم و قوام ملت کے لیے منصب خلافت کو اطاعت قرار دیا گیا کہ تمام متفرق کڑیاں ایک زنجیر میں منسلک ہو جائیں۔ شرح اس مقام کی بہت طولانی ہے اور معارف کتاب و سنت اس بارے میں بیشمار اور حد احصاء و استقصاء سے باہر ہیں۔ رسالہ خلافت میں اس پر بحث کرچکا ہوں' اور زیادہ شرح و تفصیل تفسیر القرآن میں ملے گی۔

میں اس بارے میں کچھ عرض نہیں کروں گا' کیونکہ گزشتہ آخری صدیوں میں مسلمانوں کا شیرازۂ اجتماع پراگندہ ہوا اور تقریباً پانچویں صدی ہجری کے بعد سے اس پراگندگی کے اسباب یکے بعد دیگرے ظہور میں آتے رہے۔ مجھے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ باایں ہمہ تفریق و پراگندگی ہندوستان میں اسلامی حکومت قائم تھی اور جب تک وہ قائم رہی' نظام جماعت بھی قائم رہا۔ لیکن اسلامی حکومت کے انقراض کے بعد مسلمانان ہند کا نظام جماعت بالکل درہم برہم ہوگیا۔ اور سرتاسر جاہلیت کی سی بے نظمی و بے قیدی ہم پر چھا گئی۔ بلاشبہ مرکزی خلافت آل عثمان کی موجود تھی اور مسلمانان ہند کے لیے بھی تمام مسلمانان عالم کی طرح وہی خلیفہ و متاع تھے' لیکن مسلمانان ہند کا فرض تھا کہ یا تو اپنے علائق فعلاً" و عملاً" پایۂ خلافت سے قائم کرتے اور اس کے ایک موجود عامل نائب کی نیابت حاصل کرکے اپنا فرض اسلامی انجام دیتے' اور اگر ایسا ہوتا

دشوار تھا' اور واقعی بات یہی ہے کہ دشوار تھا' اعادۂ حال اور تہیہ کار اور ادائے فرض اسلامیہ میں کوشاں ہوتے۔ لیکن بدبختانہ ایسا نہیں ہوا اور جہاں غیر مسلم غلبہ و استیلاء پر محکومانہ قناعت کرلی گئی' وہیں اس اولین فریضہ ملت کی طرف سے بھی ہمتوں کے قصور اور عزائم کے فقدان نے کوتاہی کی۔ بہرحال ایک زمانہ دراز اس پر گزر گیا اور اب حالت یہ ہے کہ دس کروڑ مسلمان جو تمام کرۂ ارض میں سب سے بڑی یکجا اسلامی جماعت ہے' ہندوستان میں اس طرح زندگی بسر کررہی ہے کہ نہ تو ان میں کوئی رشتہ اسلاک ہے' نہ وحدت ملت کا کوئی رابطہ' نہ کوئی قائد و امیر ہے اور نہ کوئی آمر و ناقد شرع' محض ایک بھیڑ ہے' ایک انبوہ ہے' ایک گلہ ہے' جو ہندوستان کی آبادیوں میں بکھرا ہوا ہے اور یقیناً ایک حیات غیر شرعی و جاہلی ہے جس میں یہ پوری اقلیم مبتلا ہوگئی ہے۔

اس حالت کے مفاسد و شرور میں ایک بہت بڑا مفسدہ یہ بھی ہے کہ برسوں سے ہندوستان میں شریعت کا باب قضاء گویا بالکل معدوم ہوگیا ہے' کیونکہ قضا کا وجود بلا قاضی کے نہیں ہو سکتا اور قاضی کا وجود امارت و امامت کے قیام پر موقوف ہے۔

حضرات!

ایک منصب قضا ہے اور ایک منصب امارت ہے۔ دونوں میں عام و خاص کی نسبت ہے۔ قضاء امارت کے مقاصد میں داخل اور اس کے ماتحتُ ہے' مگر مقاصد امارت قضاء سے حاصل نہیں ہو سکتے۔ پس یہ مقاصد امارت کے فقدان کا ذکر کررہا ہوں' صرف قضاء کا ذکر نہیں کرتا' جس کے لیے محض نام نہاد قاضیوں کا تقرر یا فرضی عدالتوں کا اجراء کافی ہو۔

حضرات!

اب سوال یہ ہے کہ کیا موجودہ حالت میں ہم کوئی قدم مقاصد اعمال ملیہ کا اٹھا سکتے ہیں؟ کیا احیائے تجدید ملت اور قیام شرع و ادائے فرائض اسلامیہ کی کوئی صحیح راہ پیدا ہو سکتی ہے؟ کیا محض ایک بھیڑ اور انبوہ لے کر ہم وہ فرائض انجام دے سکتے ہیں' جن کے لیے اولین شرط عقلاً" و شرعاً" وجود جماعت منظمہ اور امارت صحیحہ شرعیہ ہے۔

چھوڑ دیجئے' مصلحات شرعیہ کو۔ اگر ان سے ہمیں اس قدر بعد ہوگیا ہے کہ ہماری باتوں کے لیے تیار ہیں مگر بحکم اشمازت قلوب الذین لا یومنون بالاخرۃ (45) طریق شرعی اور اس کے نظام و قوام کے الفاظ سن کر یکایک متوحش و مضطرب الحال ہو جاتے ہیں تو صرف انہی قواعد و اصول کو سامنے لائیے' جن پر آج تمام اقوام عالم عامل ہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا بغیر ایک قائد اور لیڈر کے کوئی جماعت اپنی ہستی قائم رکھ سکتی ہے؟ پھر وہی حقیقت تو شریعت نے بھی لفظ امیر یا امام میں مضمر رکھی ہے۔ یہ کیا مصیبت ہے کہ اگر لیڈر کا لفظ کہا جاتا ہے' تو آپ اس کا استقبال کریں' اور امیر و امام کا لفظ آجائے' تو نفرت و استکراہ سے بھر جائیں۔ کیا یہ وہی غلطی نہیں ہے' جس کو راہ تاسیس اور راہ تجدید کی اصطلاح میں ابھی ابھی عرض کر چکا ہوں۔

اس کو بھی چھوڑیئے' آج وقت کی سب سے بڑی مہم اور ادائے فرض اسلامی کی سب سے بڑی نازک اور فیصلہ کن گھڑی ہے' جو آزادی ہند اور مسئلہ خلافت کی شکل میں ہمارے سامنے آگئی ہے۔ ہندوستان میں دس کروڑ مسلمان ہیں' جو اس وقت تک سرشار غفلت تھے اور اب آمادہ ہوئے ہیں کہ اطاعت و اعانت خلیفہ عہد' حفظ و صیانت بلاد اسلامیہ اور آزادی ہندوستان کی راہ میں اپنا اولین فرض اسلام انجام دیں۔ خدارا! بتلایئے' اس صورت حال میں بھی طریق کار کیا ہونا چاہیے؟ اور ایسے وقتوں کے لیے آخر اسلام نے بھی کوئی نظام کار بتلایا ہے یا نہیں؟ یا وہ باوجود دعویٰ تکمیل شرع اس قدر نامراد ہوگیا ہے کہ آج اس کے پاس وقت کی مشکل و مصیبت کا کوئی حل نہیں؟ اگر بتلایا ہے' تو وہ کیا ہے؟ یا محض انجمن سازی اور ہنگامہ مجالس آرائی؟ کیا محض اتباع آرائے رجال اور تقلید ارباب فن و تخمین؟ میں اعلان کرتا ہوں کہ اس بارے میں راہ شرعی صرف وہی ایک ہے اور جب تک وہ ظہور میں نہ آئے گی' ہماری کوئی سعی مشکور نہیں ہو سکتی۔

جو فتنہ آج یورپ سے اٹھا ہے' چھٹی صدی ہجری میں بھی اس کے سیلاب بلاد تاتار و چین سے اٹھے تھے اور تاتاریوں کے استیلا سے تمام عالم اسلامی تہ و بالا ہوگیا تھا۔ اس وقت بھی تمام بلاد شرقیہ اسلامیہ کا یہی حال تھا' جو آج نظر آرہا ہے۔ لیکن اس

عہد کے علماء نے پہلا کام یہ کیا کہ جن بلاد پر تاتاریوں کا قبضہ و استیلا ہوگیا تھا' وہاں تنظیم جماعت اور قیام شرع کے لیے ولاۃ مسلمین کے نصب و تقرر کا حکم دیا۔ اسی بنا پر فقہائے متاخرین کے یہاں اس کی تصریح پاتے ہو کہ بلاد محکومہ تاتار کے لیے فتویٰ دیا تھا کہ وہاں کے مسلمانوں کو ابدا" اس تغیر پر قانع نہیں ہونا چاہیے' اور ایک لحہ بھی بغیر کسی امام کے بسر نہیں کرنا چاہیے۔ یاتو وہاں سے ہجرت کر جائیں اور یا ایک امیر نصب کرکے اپنے فرائض شرعیہ انجام دیں۔

فی الحقیقت احکام شرع کی رو سے مسلمانان ہند کے لیے صرف دو ہی راہیں تھیں اور اب بھی دو ہی راہیں ہیں۔ یا تو ہجرت کر جائیں یا نظام جماعت قائم کرکے ادائے فرض ملت میں کوشاں ہوں۔

حضرات!

بعض اصحاب نے اس واضح و بین مسئلہ کی نسبت بھی شکوک و شبہات ظاہر کیے ہیں' لیکن وہ سب کے سب اہل نظر و بصیرت کے نزدیک مالا یعبابہ میں داخل ہیں۔ اور اس لیے ان کے ردونقد میں آپ کا وقت ضائع نہ کروں گا۔ بعض حضرات مسئلہ کی صحت و شرعیت تو تسلیم کرتے ہیں' مگر اس لیے آمادہ عمل نہیں کہ اس کے نفاذ میں مشکلات اور دشواریاں پیش آئیں گی۔ میں عرض کروں گا کہ بلاشبہ دنیا کے ہر عمل عظیم کی طرح اس عمل کی راہ میں بھی مشکلات پیش آسکتی ہیں۔ لیکن یہ آپ سے کس نے کہا ہے کہ آپ کی راہ عمل آسانیوں کا باغ اور راحتوں کا عیش کدہ ہے آپ نے تو مشکلوں ہی کی طرف قدم اٹھایا ہے اور دشواریوں ہی کی طلب کی ہے۔ آپ قوموں کی قسمت پلٹنے کے لیے اٹھے ہیں' اور تمام کرۂ ارضی کی ظلم و ضلالت سے آپ کو مقابلہ درپیش ہے۔ اگر آپ مشکلوں سے گھبراتے ہیں' تو صرف اس مسئلہ پر کیا موقوف ہے' عمل و عزم ہی سے کنارہ کش ہو جایئے:

ناز پرورد تنعم نہ بردراہ بدوست　　عاشقی شیوہ زندان بلاکش باشد

آپ نے خلافت اسلامیہ و جزیرۃ العرب کی حفاظت و دفاع کا اعلان کیا ہے۔ آپ ہندوستان کی آزادی کے لیے بے قرار ہیں۔ یہ کونسی آسانیوں کی راہ ہے؟ کونسی پھولوں

کی سیج یہاں آپ کے لیے تیار کی گئی ہے! آپ کرۂ ارضی کی سب سے بڑی قاہر و جابر طاقت کے دہن سے اس کا نگلا ہوا لقمہ واپس لینا چاہتے ہیں۔ یقیناً تنظیم جماعت کی راہ اس سے زیادہ دشوار نہیں ہے!

حضرات!

یاد رکھیے کہ آج آپ نے جس راہ میں قدم اٹھایا ہے وہ سرتاسر مشکلوں اور آزمائشوں ہی کی راہ ہے' وہ پھولوں کی روش نہیں ہے' کانٹوں کا وشت بیکنار ہے۔ اگر آپ کے تلوے لذت غم سے آشنا نہیں ہیں' تو مشکلات راہ کی شکایت نہ کیجئے۔ بہتر یہ ہے کہ دیبا و مخمل کے فرش پر لوٹیے اور اس راہ کی زخم و کاوش انہی لوگوں کے لیے چھوڑ دیجئے' جو اس ذوق کے لذت شناس ہیں :

کسے کو تشنہ وصل ست' با کوثر نمی سازد
بہ آب خضر اگر عاشق رود' لب تر نمی سازد
رہ الفت خطرناک ست پنہانش نظر در کن
دراں وادی کہ عشق اوست' تن باسر نمی سازد (146)

اور حضرات! حق تو یہ ہے کہ جس راہ کو آپ مشکل کہہ رہے ہیں' ساری آسانیاں اسی میں پنہاں ہیں' اور جس کو آپ نے سہل سمجھ رکھا ہے' مشکلوں اور دشواریوں کا وہی سرچشمہ ہے۔ مشکلیں انسان کے بنائے ہوئے طریقوں میں ہو سکتی ہیں' مگر اللہ کی کھولی ہوئی فطری راہوں میں نہیں ہو سکتیں' نہ وہاں دشواری ہے' نہ اعوجاج' اور نہ کسی قسم کا ضیق و جرج۔ ملته السمحته الخليفيه ليلها كنهارها۔ البتہ ساری دشواری خود ہمارے نفس و غفلت ہی کی پیدا کی ہوئی ہے۔ اور بلاشبہ جب تک اس سے ہمارا چھٹکارا نہ ہوگا' کوئی عمل حق ہم پر آسان نہیں ہو سکتا۔

فيا دارها بالخيف ان مزارها قريب ولكن دون ذالك اهوال (147)

حضرات!

بعض حضرات کا بیان ہے کہ اس سے ممکن ہے کوئی نیا فساد اٹھ کھڑا ہو' میں عرض کروں گا کہ یہ طریقہ احکام شریعت سے ماخوذ ہے' تو ہمارے لیے یقین و برہان

آگیا۔ اب کیا آپ یقین کو شک کی خاطر چھوڑ دیں گے؟ آپ کہتے ہیں کہ ممکن ہے کوئی نیا فساد پیدا ہو جائے۔ میں کہتا ہوں کہ اللہ اور اس کے رسول نے ہمیں یقین دلایا ہے کہ فوزوفلاح حاصل ہوگی۔ پھر کیا شک لے کر آپ یقین کے مقابلے کے لیے اٹھے ہیں؟ وان الظن لا یغنی من الحق شیئا"۔ (148)

حضرات!

سچ یہ ہے کہ یہ تمام مظاہر اس حقیقت کے ہیں کہ مدتوں کی غفلت اور ترک و بعد کتاب و سنت کی وجہ سے ہمتیں مفقود ہوگئی ہیں' عزائم معدوم ہوگئے ہیں اور عزائم امور کی راہ سے ہم سب یک قلم ناآشنا ہوگئے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ سنت الٰہی وقت کی مہم کو سر کرنے کے لیے اپنی عادات جاریہ کے مطابق سرگرم انبعاث و ظہور ہو اور توفیق الٰہی قیام حق اور مقام عزیمت دعوت کے لیے کسی مرد غیب کے قلب کا انشراح فرما دے۔ یہ راہ اصحاب عزم کی ہے اور فاتحین عہد کی۔ ضعفائے طریق اور درماندگان راہ کا یہاں گزار نہیں ہو سکتا۔ آج ایک ایسے عازم امر کی ضرورت ہے' جو وقت اور وقت کے سروسامان کو نہ دیکھے' بلکہ وقت اپنے سارے سامانوں کے ساتھ اس کی راہ تک رہا ہو۔ مشکلیں اس کی راہ میں غبار خاکستر بن کر اڑ جائیں اور دشواریاں اس کے جولان قدم کے نیچے خس و خاشاک بن کر پس جائیں۔ وہ وقت کا مخلوق نہ ہو کہ وقت کے حاکموں کی چاکری کرے۔ وہ وقت کا خالق و مالک ہو اور زمانہ اس کی جنبش لب پر حرکت کرے۔ اگر انسان اس کی طرف سے گردن موڑ لیں' تو وہ خدا کے فرشتوں کو بلا لے۔ اگر دنیا اس کا ساتھ نہ دے' تو وہ آسمان کو اپنی رفاقت کے لیے نیچے اتار لے۔ اسکا علم مشکوٰۃ نبوت سے ماخوذ ہو۔ اس کا قدم منہاج نبوت پر استوار ہو۔ اس کے قلب پر اللہ تعالیٰ حکمت رسالت کے تمام اسرار و غوامض اور معالجہ اقوام اور طبابت عہدوایام کے تمام سرائر و خفایا' اس طرح کھول دے کہ وہ صرف ایک صحیفہ کتاب و سنت اپنے ہاتھوں میں لے کر دنیا کی ساری مشکلوں کا مقابلہ اور ارواح و قلوب کی ساری بیماریوں کی شفا کا اعلان کر دے۔ وما ذالک علی اللہ بعزیز۔ (149)

حضرات!

1914ء کے لیل و نہار قریب الاختتام تھے' جب اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے یہ حقیقت اس عاجز پر منکشف کی اور مجھے یقین ہوگیا کہ جب تک یہ عقدہ حل نہ ہوگا' ہماری کوئی سعی و جستجو بھی کامیاب نہ ہوگی۔ چنانچہ اسی وقت سے میں سرگرم سعی و تدبیر ہوگیا۔ حضرت مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ سے میری ملاقات بھی دراصل اسی طلب و سعی کا نتیجہ تھی۔ انہوں نے پہلی ہی صحبت میں کامل اتفاق ظاہر فرمایا تھا اور یہ معاملہ بالکل صاف ہوگیا تھا کہ وہ اس منصب کو قبول کرلیں گے اور ہندوستان میں نظم جماعت کے قیام کا اعلان کردیا جائے گا۔ مگر افسوس ہے کہ بعض زود رائے اشخاص کے مشورہ سے مولانا نے اچانک سفر حجاز کا ارادہ کردیا' اور میری کوئی منت و سماجت بھی انہیں سفر سے باز نہ رکھ سکی۔ اس کے بعد میں نظربند کردیا گیا۔ لیکن ایام نظربندی میں بھی اس کی فکر و تبلیغ سے غافل نہ تھا۔ چنانچہ صوبہ بہار کے بعض احباب و مخلصین کو اسی زمانے میں اس طرف توجہ دلائی گئی اور وہاں ابتدائی بنیاد اس کی ڈال دی گئی۔ اسی زمانے میں میرے عزیز و رفیق مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد (150) صاحب رانچی میں مجھ سے ملے تھے اور اسی وقت سعی و تدبیر میں مشغول ہوگئے تھے۔ جنوری 1920ء میں جب میں رہا ہوا اور موجودہ تحریک خلافت کی تنظیم شروع ہوئی' تو اس وقت بھی میں نے بار بار کوششیں کیں اور تمام کارکن طبقہ کو اس طرف توجہ دلائی' مگر حالات موافق و مساعد نہ ہوئے اور مجھے مجبوراً انہی اصلاحات پر قناعت کرلینی پڑی' جو اس تحریک کے اندر رہ کر انجام دے سکتا تھا۔

گزشتہ موسم گرما میں جب اس طرف سے مایوسی ہوگئی کہ تمام ملک کے لیے کوئی متفقہ و متحدہ نظم قائم ہو تو پھر یہ ارادہ کیا کہ اولاً" صوبہ وار تنظیم کا کام شروع کردیا جائے۔ چونکہ صوبہ بہار میں تین چار سال سے ابتدائی بنیاد کام کررہی تھی' اس لیے سب سے پہلے اسی کی طرف توجہ کی گئی' اور میں نہیں جانتا کہ کن لفظوں میں حضرات علمائے بہار کو مبارکباد دوں کہ انہوں نے سبقت بالخیرات کا مقام اعلیٰ حاصل کیا اور جمعیتہ العلماء بہار کے جلسہ میں تین سو کے مجمع علماء نے بالاتفاق اپنا امیر شریعت منتخب

کرلیا۔

اس کے بعد ارادہ تھا کہ فوراً دوسرے صوبوں میں بھی کام شروع کر دیا جائے' لیکن بعض حضرات نے اس مسئلہ کی نسبت اخبارات میں قیل و قال شروع کر دی اور بلاضرورت علمائے ملت کا ایک عملی کام انتظار عوام میں بصورت اختلاف و جدل نمایاں کردیا گیا۔ یہ چیز مجھ کو اس کام سے ایک لحہ کے لیے بھی نہیں روک سکتی تھی۔ مگر جب میں نے دیکھا کہ اب یہ مسئلہ منظرعام پر آچکا ہے اور جمعیتہ العلماء اس کا آخری اور قطعی فیصلہ کرسکتی ہے' تو یہی مناسب معلوم ہوا کہ اسے جمعیتہ کے حوالے کرکے بالفعل سبکدوش ہو جاؤں۔ چنانچہ ارکان جمعیتہ کی ایک خاص مجلس شوریٰ منعقدہ دہلی میں یہ مسئلہ پیش ہوکر بالاتفاق منظور ہوا' اور اب اس کا آخری فیصلہ اس اجلاس کے ہاتھ میں ہے۔

حضرات! ارکان جمعیتہ العلمائے کرام! آپ کی جمعیتہ کے لیے شریعت کا مقررہ نظام عمل یہ ہے اور صرف یہی ایک راہ فوز و فلاح کی ہے۔

6

خطبہ صدارت

جمعیتہ العلماء ہند

لاہور' 18 نومبر 1921ء

حضرات!

مجھے اس موقع پر جو معروضات آپ کی خدمت میں پیش کرنا تھیں' خاص طور پر اصرار کیا گیا کہ میں اپنی عادت کے خلاف انہیں قلمبند کروں۔ یہ جس قدر بھی حصہ خطبہ کا تھا' اگرچہ ایک حد تک بے صبری (ا) اور بدذوقی سے سنا گیا' لیکن بہرحال میں آپ کا مشکور ہوں کہ آپ نے یہ تمام حصہ سن لیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان متفرق داستانوں کے سننے کے بعد جو مختلف طرق رہ چکے ہیں' اس کا ایک سرسری خاکہ آگیا ہوگا۔

اب اس کے بعد اس امر کی ضرورت تھی کہ دوسرے ٹکڑوں کی جانب توجہ ہوتی جو اگرچہ جمعیتہ العلماء کے عظیم مقصد میں داخل نہیں ہے۔ لیکن فی الحقیقت وقت کا یہ عظیم الشان مسئلہ ہے' جو نہ صرف جمعیتہ العلماء بلکہ عالم اسلامی کے ہر قائل لاالہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے لیے بلکہ ہر انسانیت دوست اور انسانیت پسند انسان کے لیے جو مسئلہ سب سے زیادہ اہمیت رکھتا تھا' وقت کا مسئلہ تھا اور ضرورت تھی کہ اس کی جانب

میں متوجہ ہوتا' اور اس بارے میں بھی جمعیۃ العلماء کے مقاصد کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسے آپ کے سامنے پیش کرتا' لیکن اب اس وقت جلسے کا زیادہ بہتر' زیادہ مستعد حصہ اس خطبے میں صرف ہو چکا ہے اور جلسے کی موجودہ حالت اس کے لیے متحمل نہیں ہے کہ اب میں اس ٹکڑے کو زیادہ صراحت و تفصیل کے ساتھ عرض کروں' لیکن چند ضروری ٹکڑے ہیں جن کو اختصار کے ساتھ میں چاہتا ہوں کہ گوش گزار کروں۔

اس وقت میری آپ کے اس مجمع میں حیثیت کیا ہے؟ میں اس وقت آپ کے سامنے ایک واعظ' ایک داعی' ایک مقرر نہیں ہوں۔ میں اس لیے یہاں نہیں کھڑا ہوں کہ آپ کے کانوں اور آنکھوں کے لیے تماشا بنوں۔ میرا کام ایک خاص فرض کا ادا کرنا ہے' لوگوں کے حسن ظن نے مجھے اس جگہ پر کھڑا کیا ہے۔ میرا فرض یہ ہے کہ جمعیۃ العلماء کے تعلق کو ملحوظ رکھتے ہوئے جن خیالات کا اعلان ہونا چاہیے' وہ عرض کروں۔ اس وقت اگر آپ واعظانہ صحبتوں کا وقت لے کر آئے ہوئے ہیں' تو اسکا بہترین وقت آپ کے سامنے آنے والا ہے۔ اس وقت جو بیان آئے گا' وہ ادائے فرض ہے۔ سب سے پہلے جو مسئلہ اس سلسلے میں ہمارے سامنے آتا ہے' وہ وہی مسئلہ ہے جو تمہاری زبانوں پر نہیں' بلکہ تمہارے دلوں کے صفحوں پر نقش ہے یعنی مسئلہ خلافت۔ مسئلہ خلافت کا تعلق' اس کی اہمیت' اس کے متعلق عمل میں مسلمانوں کے اوپر وجوب' مسلمانوں کے لیے ان کی ضرورت' نہ صرف ضرورت بلکہ ایمان و کفر کے امتحان گاہ کا ان کے لیے پیدا ہو جانا' ان تمام پہلوؤں کو نہایت تشریح کے ساتھ گزشتہ دو سال کے اندر میں بیان کر چکا ہوں اور میں نہیں چاہوں گا کہ وہ دہرائی ہوئی داستان پھر آپ کے سامنے دہراؤں۔

وقت کے حالات اس امر کا ضرور داعیہ رکھتے ہیں کہ اس امر کو ظاہر کروں کہ خلافت کے متعلق مسلمانان عالم اور علی الخصوص مسلمانان ہند کے مطالبات شرعی کیا تھے' تاکہ ایک مرتبہ ان مطالبات کا اعادہ موجودہ حالت کے اعتبار سے اس امر کا فیصلہ کر دے کہ ہمارے مطالبات کیا ہیں اور ان مطالبات کی نوعیت اور صورت کیا ہے اور وہ دنیا کے ہر طرح کے خیالات سے' ہر طرح کی مفاہمت سے' سمجھوتوں سے بالکل بالاتر

ہے، کسی طرح کی گنجائش باقی نہیں ہے۔

مسئلہ خلافت کے سلسلے میں اس صحبت میں مجھے جو کچھ عرض کرنا ہے، وہ یہ ہے کہ مسئلہ خلافت کے متعلق جو ہمارے مطالبات تھے، ان میں نہ تو کچھ گھٹا سکتے ہیں نہ بڑھا سکتے ہیں، نہ کوئی قدم پیچھے لے جا سکتے ہیں، نہ داہنے لے جا سکتے ہیں نہ بائیں، اس میں کسی طرح کے سمجھوتہ یا مفاہمت کا سوال نہیں ہو سکتا۔

اس بارے میں مسلمانوں کے مطالبات یہ تھے کہ جزیرۃ العرب کو غیر مسلم اثر سے بالکل پاک کر دینا چاہیے۔ جزیرۃ العرب کے متعلق ہمارا یہ اعلان تھا کہ جزیرۃ العرب صرف حرمین کا نام نہیں ہے۔ بلکہ عراق کا دوتہائی حصہ بھی حسب جغرافیہ اس میں داخل ہے، اس لیے عراق کی سرزمین، بصرہ کا علاقہ اور بغداد کا علاقہ، جزیرۃ العرب میں داخل ہے، جس وقت تک انگریزوں کا اثر جزیرۃ العرب کی ایک چپہ زمین پر بھی باقی رہے گا، مسلمانان عالم کے لیے ناممکن ہے کہ وہ ایک لمحے کے لیے صلح و سمجھوتہ کا ہاتھ برٹش گورنمنٹ کی طرف بڑھا سکیں، جب تک ایک چپہ زمین پر، ایک انچ زمین پر، اتنے حصہ پر کہ جتنے حصہ پر عراق کے اڑنے والے گردوغبار کا ایک ذرہ آسکتا ہے، اگر انگریز حکومت کا بلا واسطہ یا بالواسطہ اثر باقی رہے، یہ مسلمانوں کے لیے آسان ہے کہ بچھوؤں کے ساتھ، سانپوں کے ساتھ صلح کرلیں، پہاڑوں کے غاروں اور بھٹوں میں چلے جائیں، وہاں درندوں کے ساتھ صلح کرلیں، مگر یہ ممکن نہیں کہ انگریزوں کے سامنے صلح کا ہاتھ بڑھائیں۔

جزیرۃ العرب کے بعد مسئلہ خلافت کے مطالبات کیا ہیں؟ وہ بھی آپ کو یاد ہیں۔ وقت کی ضرورت کو دیکھتے ہوئے میں اس امر کی ضرورت سمجھتا ہوں کہ وہ بھی آپ کو یاد دلاؤں۔

دوسری اہم چیز ہمارے سامنے فلسطین کی وہ سرزمین ہے، جس کی تحریم ہمارے لیے ویسی ہی ضروری ہے۔ جب تک کہ اس کا ایک چپہ بھی غیر مسلم اثر میں باقی ہے، اس وقت تک محال ہے کہ ہمارے واسطے کسی صلح یا مفاہمت کا دروازہ کھل سکے۔ میں اس وقت ان دفعات کی تشریح نہ کروں گا، جو خلیفۃ المسلمین پر بصورت شرائط عاید

کیے گئے' یا خلافت کے ان حقوق پر' جس وقت تک ان شرائط میں سے کوئی ایک شرط بھی باقی ہے' اس وقت تک مسلمانان ہند کے لیے محال قطعی ہے کہ وہ صلح کا' اتفاق کا کوئی ہاتھ بھی اس گورنمنٹ کی طرف بڑھا سکیں۔ میں یہ بھی کہے دیتا ہوں کہ اب جب کہ حالات نے پلٹا کھایا' واقعات نے اپنا ورق الٹا اور حضرت غازی مصطفیٰ کمال پاشا کی فوجوں نے یقیناً موجودہ جنگ کے میدان ہی کو نہیں' بلکہ وسط ایشیا کے میدان کو ہمیشہ کے لیے فتح کرلیا' تو اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے سامنے بار بار اس طرح کی چیزیں لائی جاتی ہیں' اور ظاہر کیا جاتا ہے کہ آج مسلمانوں کے مطالبات خلافت کے لیے سب سے زیادہ اہم چیز سمرنا ہے۔

لیکن میں اس وقت اس امر کا اعلان کر دینا چاہتا ہوں کہ سمرنا اور تھریس کا میدان' فی الحقیقت وہ دونوں ایسے میدان تھے کہ اس کا فیصلہ ہو سکتا تھا' تو ہندوستان کے مسلمانوں کی آہ و فغاں سے نہیں' بلکہ زندہ انسانوں کے ذریعہ ہو سکتا تھا۔ اس کی بنیاد یہ تھی کہ فی الحقیقت تمام مسئلہ خلافت میں یہ ظلم اتنا نمایاں اور ابھرا ہوا تھا کہ بار بار مقررین خلافت اپنی تقریروں میں اس کا ذکر کیا کرتے تھے' یہ دونوں علاقے یونان کو دلائے گئے۔ حال آنکہ یونان فریق جنگ نہ تھا' جنگ سے ان کا تعلق نہ تھا۔ اس کو بار بار نمایاں کرکے پیش کیا جاتا تھا' لیکن اس سے یہ مقصد نہ تھا کہ مطالبات خلافت میں اس کی اہمیت بمقابلہ دیگر معاملات کے ہے۔ میں اس امر کا اعلان کر دینے کے لیے تیار ہوں کہ سمرنا اور تھریس کو غازی مصطفیٰ کمال پاشا کی تلوار کی نوک کی قسمت پر چھوڑ دیجیے۔ ہمارا مطالبہ جزیرۃ العرب' فلسطین اور شام کے لیے ہے۔ بیت المقدس کے لیے ہے' اور ان شرائط کے لیے ہے' جو پایگاہ خلافت کے لیے عائد کی گئیں۔

مسئلہ خلافت کے متعلق جو عرض کرنا تھا' وہ چند اشارات تھے جو آپ کے گوش گزار کر دیے۔ میرے فرائض میں سے ایک نہایت اہم فرض یہ بھی ہے کہ ایک دوسری جانب بھی کچھ نہ کچھ اشارہ کروں۔

میرا مقصد وہ حادثہ ہے جس حادثہ کو آپ میں سے تقریباً تمام اخبار بین اور باخبر حضرات مختلف اخبارات میں پڑھ چکے ہوں گے۔ میرا مقصد جنوبی ہند یعنی مدراس و

مالابار کے اس حادثے سے ہے، جس کے متعلق طرح طرح کے نتائج و حالات آپ کے سامنے آچکے ہیں۔ اس موقع پر جمعیتہ العلماء کے اس مجمع میں یقیناً اپنا فرض محسوس کرتا ہوں کہ پوری ذمہ داری کے ساتھ اس واقعے کی نسبت احکام شرع کی رو سے جو ہمارا اعلان ہو سکتا ہے، اس اعلان کو اختصار کے ساتھ بیان کر دوں، تاکہ اس کے متعلق نہ کسی طرح کا اخفاء رہے، نہ غلط فہمی اور نہ پیچیدگی باقی رہے۔ اس واسطے آپ مجھے اجازت دیں گے کہ موپلاؤں کے متعلق کچھ عرض کردوں۔

میں اس وقت اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتا کہ جو واقعات ہوئے ان کے علل کیا ہیں اور جو داستانیں اس وقت تک ہمارے کانوں سے ٹکرا چکی ہیں، ان کی صداقت کیا ہے! اب تک وہاں کے حالات تاریکی میں ہیں۔ ان کی روشنی ہم تک نہیں آئی۔ ایک واقعہ ہمارے سامنے آتا ہے اور ایک پہلو کو نمایاں کرتا ہے۔ مدراس میل کا نامہ نگار ایک واقعہ لکھتا ہے، اس سے دوسری صورت ہمارے سامنے نمایاں ہوتی ہے۔ حقیقت میں اور صداقت میں اور ان واقعات میں ایسی صورت حائل ہے کہ وہاں کے اصلی حالات کو ہمارے سامنے آنے نہیں دیتی۔ آپ اس امر کا فیصلہ کرلیں کہ اس حادثے کے متعلق آپ کی رائے کیا ہے۔ میں جو کچھ عرض کروں گا، وہ اس قدر صاف اور واضح ہے کہ آپ میں سے کسی کو اس سے متفق ہوتے تامل نہ ہوگا۔

دو چیزوں کے متعلق میرا فرض ہے کہ میں صاف صاف اعلان کردوں۔ پہلی چیز وہ واقعہ ہے کہ جو وہاں رونما ہوا، یعنی وہ لڑائی، وہ جنگ، وہ فساد، وہ تشدد جو وہاں واقع ہوا ہے اور اس وقت تک اصلیت ہمارے سامنے موجود نہیں ہے۔ یہ خبر بھی بار بار بیان کی گئی ہے کہ موپلاؤں نے وہاں انگریزی حکومت سے لڑائی کی، تلوار اٹھائی، اس کی عدالتوں اور اس کی حکومتوں سے لڑائی کی اور یہ جو انہوں نے شمشیرزنی کی، یہ واقعی انہوں نے خلافت کا نام لے کر کیا اور اس اعلان کے ساتھ کیا کہ خلافت کے مسئلے سے جو فرائض ہم پر عائد ہوتے ہیں ان کی وجہ سے ہم نے تلوار اٹھائی۔ میں نہیں جانتا کہ وہاں کے اصل واقعات کیا ہیں۔ اگر بالفرض یہ واقعہ صحیح ہو اور وہاں کے موپلاؤں نے یہ کیا ہو، تو ہمارے واسطے یہ بالکل صاف اور ہر طرح کے شبہ سے پاک ہے۔

فی الحقیقت اسلام کا نظام شرعی یہ ہے کہ جب مسلمانوں کے تمام علماء' مسلمانوں کے عام اہل الرائے' مسلمانوں کے عام اہل حل و عقد' مجتمع ہو کر ایک فیصلہ کر دیں اور اس فیصلے کا اعلان کردیں' تو بلاشبہ تمام مسلمانوں کے لیے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ اس فیصلے کو جمعیتہ کا فیصلہ سمجھیں' جمعیتہ کے ساتھ رہیں ارو اس سے قدم نہ ہٹائیں۔ ہندوستان میں بدبختی سے کوئی نظام شرعی' جماعت اور قوم کے لیے نہیں ہے۔ ایسی حالت میں فی الحقیقت اگر منصب امامت کے فرض کو ادا کرنے کا کسی جماعت کو حق حاصل ہے'تو وہ علماء کی جماعت ہے' اہل بصیرت کی جماعت ہے' اور ان تمام لوگوں کی جماعت ہے' جن کو اسلام اپنے یہاں ارباب حل و عقد کے نام سے موسوم کرتا ہے' خواہ خلافت کی جماعت ہو یا جمعیتہ العلماء کی مقدس جماعت۔ اس جماعت نے کامل غور و فکر کے بعد' تمام حالات کے دیکھنے کے بعد' اس امر کا فیصلہ کیا اور اعلان کردیا کہ اس وقت ہم نے اپنے فرائض شرعی کے انجام دینے کے لیے مطالبات خلافت کے پورا کردینے کے لیے جو راہ اختیار کی ہے' یہ راہ بلا قتل کیے اور بلاجنگ کیے ہے۔

میں نے وہ لفظ نہیں کہا'جو تمہاری زبان پر جاری ہوتا ہے' یعنی تشدد یا عدم تشدد۔ اس امر کا انہوں نے قطعی فیصلہ کردیا کہ مسلمانوں نے اپنے فرائض شرعی کی انجام دہی کے لیے جو طریقہ اختیار کیا ہے' وہ یہ ہے جس کو سکون کے ساتھ بلا کسی قتل کے' بلا کسی ایسی حرکت کے جو لڑائی کی ہو' سکون اور امن کے ساتھ اس راہ کو طے کرنا چاہیے۔ میں اس کے دلائل پر بحث نہ کروں گا۔ اگر وقت نے موقع دیا' تو سن لو گے کہ اس کی تشریح کیا ہے۔ اب تمام حقیقتیں آپ کے سامنے منکشف ہوگئیں۔ پھر جب مسلمانوں کی بڑی سے بڑی ذمہ دار جماعت جو ہوسکتی تھی' احکام شرع کی رو سے وہ یہی جمعیتہ العلماء ہے۔ اس نے یہ راہ عمل قرار دی کہ مطالبات خلافت پورا کرنے کے لیے مسلمانوں کو جو طرز عمل اختیار کرنا چاہیے' وہ طرز عمل لڑائی کا نہیں ہے' قتال کا نہیں ہے' جنگ کا نہیں ہے' خونریزی کا نہیں ہے' بلکہ اس راہ کو امن و سکون کے ساتھ طے کرنا چاہیے۔

پھر جمعیتہ العلماء کا یہ فیصلہ تھا' اس نے جو بڑی سے بڑی جماعت ملک میں ہوسکتی

ہے' جس وقت اس امر کا اعلان کردیا' تو میں ان کو احکام شرعی کی رو سے بتلانا چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کی کسی جماعت' کسی گوشہ ملک کو خواہ وہ مالابار ہو یا ہندوستان کا کوئی گوشہ' جہاں مسلمان بستے ہوں' بشرطیکہ ان کی جماعت کو اس فیصلہ کی اطلاع ہو چکی ہو' احکام شرعیہ کی رو سے ان احکام کے بعد جائز نہیں ہے کہ اس جماعتی فیصلہ سے اپنے قدم کو باہر نکالے اور اس طرز عمل کو اختیار کرے جس طرز عمل کو مسلمانوں نے بحیثیت جماعت رد کر دیا ہے۔ میں اس امر کا اعلان کر دینا چاہتا ہوں کہ اگر موپلاؤں نے خلافت کے مقصد کو لیکر تلوار اٹھائی اور جنگ کی' تو ان کا یہ عمل اس جماعتی فیصلہ کے خلاف تھا' جو ہندوستان کے علماء نے کیا ہے' اس لیے یقیناً ان کو ملامت کی جا سکتی ہے۔ انہیں کسی حالت میں یہ حق نہ تھا کہ وہ ہندوستان کے جماعتی فیصلہ سے قدم باہر نکالیں' اور ہندوستان کے کسی گوشے کو اس امر کا اختیار نہ ہوگا کہ مسلمانوں کی جماعت نے جو فیصلہ کردیا ہے اس سے روگردانی کریں۔ انفراداً" اس کا اصول تم کو معلوم ہے' اس کا معیار تم کو معلوم ہے۔ بحیثیت جماعت کے جو عمل انہوں نے اختیار کیا' بلا کسی تاویل کے یہ کھلی ہوئی چیز ہے کہ جب جمعیتہ العلماء نے فیصلہ کرلیا' خواہ استطاعت نہ ہونے کی وجہ سے' خواہ سروسامان نہ ہونے کی وجہ سے' جب انہوں نے فیصلہ کیا کہ جو راہ تمہیں اس وقت اختیار کرنا ہے' وہ تلوار کی نہیں ہے' بلکہ اور حقیقتیں ہیں' جن کے ذریعے سے اس مقصد کو ڈھونڈھنا چاہیے۔ جب مسلمانوں کا متفقہ فیصلہ یہ ہوا تو مسلمانوں کے لیے یہ جائز نہ تھا کہ اس سے قدم باہر نکالیں۔ اگر انہوں نے قدم باہر نکالا' تو انہوں نے ترک اجماع کیا۔ اس کے لیے ہم انہیں ملامت کرسکتے ہیں' سرزنش کرسکتے ہیں۔ ان کے اس ترک اجماع سے ہماری اس جماعت کو نقصان پہنچا ہے' تو احکام شرع کی رو سے ان کی تعزیر کی جا سکتی ہے۔ بلاشبہ اس اعتبار سے یہ کھلی ہوئی چیز ہے' یہ حقیقت ہر شخص کو معلوم ہے کہ خلافت کے مطالبات کی رو سے اور خلافت کے مقاصد کو اگر ترک کر دیجیے جب بھی' ہندوستان کے مقتضیات کی رو سے' ہندوستان کے مسلمانوں کا فرض تھا کہ وہ اللہ کی راہ میں قتال کے لیے اٹھتے اور اپنی لاشوں کو تڑپاتے۔ موپلاؤں نے یا کسی مسلمان نے اگر یہ سمجھ کر ہم اس کو احکام شرع

کی رو سے جہاد فی سبیل اللہ کر رہے ہیں' تو یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ ہم اس کو گناہ نہیں کہہ سکتے۔ اس وقت نفس عمل سے کوئی اختلاف نہیں ہے۔ لیکن بحث یہ ہے کہ جن حالات میں وہ عمل کیا گیا' جن وقتوں میں وہ عمل کیا گیا' اس کے اعتبار سے اس کے احکام کیا ہیں؟ بلاشبہ شریعت نے جو روشنی ہمارے سامنے پھیلائی ہے' ہم دیکھ سکتے ہیں کہ علماء کا فیصلہ اس کے خلاف تھا۔ اس وقت جو راہ ہم نے اختیار کی ہے' یہ تلواروں کی نہیں ہے۔ جب انہوں نے یہ فیصلہ کرلیا تو مالابار کے مسلمانوں کو یہ حق نہ تھا کہ وہ جمعیتہ کے التزام کو ترک کر دیں۔ اگر انہوں نے ایسا کیا تھا' تو انہیں سرزنش کی جا سکتی ہے' لیکن حقیقتاً وہاں واقعات کیا رونما ہوئے ہیں' اس کے متعلق میں صحیح حالات نہیں بتا سکتا۔

بعض لوگوں نے بیان کیا کہ موپلا مسلمانوں نے جو کچھ کیا' منجملہ ان کے ایک بات یہ بھی بیان کی گئی کہ انہوں نے اس بستی والے ہندوؤں پر جبر کیا' اور جبراً" ان کو مسلمان بنانا چاہا۔ صحیح واقعات ہمارے سامنے نہیں' یہ چیز جو ہمارے سامنے پیش کی گئی' بیسیوں افسانے ہیں' جو اس کے خلاف ہمارے پاس پہنچ چکے ہیں۔ خود میرے پاس متعدد خطوط مالابار سے آچکے ہیں۔ تھوڑی کے لیے مان لیا جائے کہ یہ واقعات صحیح ہیں' تو ہمیں چاہیے کہ جو ہمارے اعتقادات ہیں' وہ مخفی نہ ہوں۔ ہمارا کھلا ہوا آشکارا مذہب ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم بیان کر دیں کہ ہمارا مقصد کیا ہے' جیساکہ ہمارے بہت سے علماء نے شائع کیا ہے۔ ہر شخص متفق ہوگا کہ اگر وہاں کے مسلمانوں نے محض اپنے دل کا غبار نکالنے کے لیے یا ان سے انتقام لینے کے لیے ظلم و جبر کرکے مسلمان بنانا چاہا ہے' تو ہم میں سے ہر شخص جس کو شریعت کا علم ہے' اس کا اعلان کرے گا' کہ اگر انہوں نے ایسا کیا ہے تو ان کا ایسا کرنا شریعت کا عمل نہیں ہے' بلکہ شریعت کی توہین ہے۔ شریعت نے کبھی حکم نہیں دیا ہے کہ جبراً" مسلمان بنایا جائے۔ جن پر شریعت نے جبر کیا تھا ان کے لیے بھی جزیہ کی راہ رکھی تھی۔ جن حالات میں یہ کیا گیا ہے' اس بے قاعدگی کو دیکھتے ہوئے کسی طرح کوئی شخص نہیں کہہ سکتا کہ ایک لمحہ کے لیے ان کا یہ فعل اسلامی فعل تھا۔ مسلمان اس اعلان کے لیے تیار ہیں کہ ان کے اس

جبر سے، اس ظلم سے، بشرطیکہ جبر ہوا ہو، ہندوستان کے کسی مسلمان کو دلی ہمدردی نہ ہوگی۔ ہماری ہمدردیاں انہی اسباب پر ہیں، جو حق ہیں۔

اس کے بعد اگرچہ مطالبات بیشمار ہیں، لیکن ابھی میں نے ضمناً" ایک چیز کہہ دی ہے۔ قبل اس کے کہ میں اپنے مختصر بیان کو ختم کروں۔ چاہتا ہوں کہ ایک غلط فہمی جو عام طور پر پھیلی ہوئی ہے، الحمدللہ عمل میں نہیں، فعل میں نہیں، لیکن لفظوں میں، اختصار کے ساتھ اس غلط فہمی کا ازالہ کردوں۔

تشدد و عدم تشدد، یہ دوچیزیں ہیں، جو اس وقت ہمارے سامنے آئی ہیں، اور جن کی نسبت کہا جاتا ہے کہ ہم نے عدم تشدد کی راہ اختیار کی ہے۔ نیز یہ بھی بار بار کہا جاتا ہے، بطور ایک مسلم عقیدہ کے کہ اگرچہ بحیثیت مسلمان ہونے کے مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ وہ تشدد کریں، لیکن وقت کی ضرورتوں کو دیکھ کر انہوں نے اس عقیدے کو ملتوی کردیا ہے۔ اس بارے میں چند الفاظ عرض کروں گا، اگرچہ وقت کوتاہ ہے اور جتنی تفصیل کی ضرورت ہے، اتنی گنجائش نہیں ہے۔

سب سے پہلے یہ چیز لوں گا کہ فی الحقیقت تشدد اور عدم تشدد کی لفظی ترکیب جو اختیار کی گئی، یہ ترکیب ہی غلط ہے۔ اگر تشدد سے مقصود ہے تشدد لغوی، تو میں آپ سے کہتا ہوں کہ اسلام نے کسی حالت میں، ایک لمحے کے لیے، مسلمانوں کی کسی جماعت کو، کسی فرد کو، تشدد کا حکم نہیں دیا ہے۔

تشدد کے معنی ہیں ظلم کے، اسراف و اتلاف حق کے۔ پھر کیا ایک لمحہ کے لیے بھی اسلام نے ظلم کا حکم دیا ہے، اسراف کا حکم دیا ہے، بیجا زیادتی کا حکم دیا ہے؟ اسلام نے ان میں سے کسی ایک چیز کا حکم نہیں دیا۔ اب میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ اگر تشدد سے مقصود یہی ہے کہ جو معنی اس کے ہیں، زیادتی کرنا، سختی کرنا، تو میں آپ کو بتلانا چاہتا ہوں کہ ایک منٹ کے لیے بھی، اسلام نے کسی حالت میں زیادتی و سختی کی اجازت نہیں دی۔ ایک اور چیز ہے جس کی اسلام نے اجازت دی ہے۔ وہ تشدد نہیں ہے، زیادتی نہیں ہے، ظلم نہیں ہے، مارپیٹ نہیں ہے، بلکہ وہ دوسری چیز ہے۔ اسکا نام ہے: جنگ و قتال، لڑائی۔ یہ ایک منظم عمل ہے۔ جس کے شرائط ہیں، حالات ہیں، جو

اس لیے نہیں ہیں کہ ظلم کو قائم کرے' زیادتی کرے' سختی کرے' بلکہ اس لیے ہیں کہ حقوق و عدل کو دنیا میں قائم کرے۔ بلا شبہ اسلام نے' شریعت نے جنگ کا حکم دیا ہے جس طرح انسان کی فطرت اور نیچر جائز رکھتی ہے۔ میں ایک منٹ کے لیے بھی تسلیم نہ کروں گا کہ اس نے تشدد کا حکم دیا ہے۔ جنگ دوسری چیز ہے' خونریزی' مارپیٹ' قتل و غارت دوسری چیز ہے۔ اسلام نے اس چیز کا حکم کبھی نہیں دیا ہے' جس کو خونریزی سے تعبیر کرتے ہو' اس واسطے کہ وہ یہ حقیقت پیش کرتا ہے کہ دنیا میں خدا عالمگیر برادری کو قائم کرتا ہے' لیکن دنیا میں ایک لحہ کے لیے خدا کی محبت قائم نہیں رہ سکتی' جب تک محبت مٹانے والے دنیا میں باقی ہیں۔ اس واسطے عدل کے قیام کے لیے' محبت کے قیام کے لیے' نوع انسانی کی عالمگیر اخوت کے قیامت کے لیے ضرورت ہے کہ جنگ کا وجود ہو' لڑائی کا وجود ہو۔ جو خدا کی زمین کو پامال کرنا چاہیں' جن کا وجود دنیا میں ظلم کے لیے ہے' بلاشبہ ان کے وجود کی گندگی سے زمین کو پاک کرنے کے لیے ضرورت ہے کہ تلوار بھی ہو اور وہ سرخی بھی ہو' جو انسانوں کے خون سے تلوار پر جمتی ہے۔

ہم کو اس سے انکار نہیں کہ اسلام نے جنگ کی اجازت دی ہے' لیکن خاص شرائط کے ماتحت۔ جس طرح دنیا کی تمام قوموں نے' دنیا کے کل مذاہب نے قولاً" و فعلاً" تقریباً دنیا کی تمام قوموں اور تمام جمعیت بشری نے' اس چیز کا اعتراف کیا ہے۔ اس بنا پر تشدد اور عدم تشدد کا جو استعمال کیا جارہا ہے' ان معنوں میں کسی طرح یہ استعمال صحیح نہیں ہے۔ تشدد تو اسلام کے نقطہ فکر سے کسی حالت میں جائز نہیں ہو سکتا۔ تشدد کا حکم اسلام نے کسی حالت میں نہیں دیا ہے۔ جنگ کا حکم دیا ہے جب کہ جنگ عدل قائم رکھنے کے لیے ہو۔ تم کو معلوم ہے کہ جج بھی قتل کرتا ہے اور ایک ڈاکو بھی۔ جج قتل کرتا ہے پھانسی کے تختہ پر' ڈاکو قتل کرتا ہے مظلوم انسانوں کے بستروں پر۔ لیکن دنیا جج کی تعریف کرتی ہے اور ڈاکو پر لعنت کرتی ہے۔ حال آنکہ دونوں نے قتل انسان کا کیا ہے۔ لیکن ایک نے جو قتل کیا ہے' زیادتی کے لیے اور دوسرے نے جو قتل کیا ہے وہ دفع تشدد کے لیے۔ خدا نے عدل کے قیام کے لیے' انسانی حقوق کی حفاظت کے

لیے' جنگ کو جائز رکھا ہے' اس کے لیے تشدد کا اطلاق کرنا صحیح نہیں ہے۔

اب یہ دیکھو کہ مان لیا جائے کہ تشدد سے مقصود واقعی جنگ ہے' لڑائی ہے۔ لیکن اب اس بارے میں ہمارا موجودہ طرز عمل کیا ہے؟ اس بارے میں یہ حقیقت واضح کرنا چاہتا ہوں کہ آپ میں سے کوئی عزیز جو یہ سمجھتا ہو کہ اس جمعیۃ العلماء کے اعضاء و اراکین نے اس امر کا اعلان محض کسی شخصی رائے کی بنا پر کیا ہے' کسی وقتی مصلحت کی بنا پر کیا ہے' اگر ایک لحہ کے لیے بھی آپ میں سے کسی کا یہ خیال ہو' تو آپ پر واضح ہو جائے کہ آپ کا خیال ایک لحہ کے لیے بھی درست ہو' تو مسلمانوں کے لیے کسی ایسے عمل کے ترک کا مستحسن ہونا تو درکنار' اس سے بڑھ کر کوئی اور ملحدانہ عمل نہیں ہوسکتا۔ اگر مسلمان شریعت کی کسی تعلیم کو محض چند انسانوں کی خوشنودی کی خاطر ایک لمحے کے لیے بھی چھوڑ دیں' ترک کر دیں' کوئی اس طرح کا سمجھوتہ کرلیں' مفاہمت کرلیں' تو آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ عمل اسلامی عمل نہیں ہے' یہ ایک سخت ملحدانہ عمل ہے' جس سے بڑھ کر ملحدانہ عمل مسلمانوں کے لیے نہیں ہوسکتا۔ کسی حالت میں مسلمانوں کے لیے جائز نہیں ہے کہ اسلام کی چھوٹی سے چھوٹی فرع کو ایک لحہ کے لیے بھی ترک کر دیں۔

اگر مسلمانوں نے تمہاری بولی میں ترک تشدد کی پالیسی اس لیے اختیار کی ہے کہ چند انسانوں کی مصلحتیں اور چند انسانوں کی آراء ان کے سامنے آگئی ہیں تو اول تو یہ حقیقت کے خلاف ہے اور یہ اتنا بڑا سوئے ظن ہے کہ اس سے بڑھ کر سوئے ظن مسلمانوں کے لیے نہیں ہوسکتا کہ اس بڑی جماعت نے وہ عمل کیا ہے' جس کے معنی ہیں خدا کی شریعت سے منہ موڑ لینے کے۔ اس نے گردن نہیں موڑی ہے۔ اس نے جو اعلان کیا ہے اس کی بنا احکام شریعت پر ہے۔ بلاشبہ موجودہ حالت میں احکام شرع کی رو سے ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے جو شرعی عمل ہو سکتا تھا' وہ وہی تھا جو انہوں نے کیا: اور مسلمانوں کے علماء کا اس پر مستقل ہو جانا کہ مسئلہ خلافت کے لیے جن کاموں کو انجام دیں گے' بلا لڑائی لڑے ہوئے ہمیں انجام دینا چاہیے۔ اس کی بنیاد بھی نظام شرعی پر ہے' محض ایک فرد یا ایک جماعت کی رائے نہیں ہے۔ اگر ایسا ہو' تو اس

آسمان کے نیچے کسی بڑے سے بڑے امام و خلیفہ کو' بڑے سے بڑے عالم کو ایک منٹ کے لیے' یہ حق حاصل نہیں ہے کہ اللہ کی شریعت کے خلاف' کسی چھوٹی سے چھوٹی فرع کے خلاف' خدا کے چند بندوں سے سمجھوتہ کرلیں۔ اگر ایسا کیا گیا تو اس سے بڑھ کر کوئی ضلالت نہیں ہوسکتی' لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر سوئے ظن ایک لمحہ کے لیے بھی ممکن ہوتا' تو ہم کو اپنی بدبختی پر شہادت دینی پڑتی۔

جمعیتہ العلماء نے اور ذمہ دار جماعتوں نے جو راستہ اختیار کیا ہے' وہ راستہ لڑائی کا نہیں ہے' جنگ کا نہیں ہے' حرب کا نہیں ہے' قتال کا نہیں ہے' خونریزی کا نہیں ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہم کو جو راہ اختیار کرنا ہے' وہ امن شرعی کی اور پرسکون راہ ہے۔ ان کا یہ فیصلہ کسی شخصی رائے پر نہیں ہے' بلکہ فی الحقیقت اس کی بنیاد شریعت کے نظام پر ہے' اس روشنی پر ہے' جو شریعت کی رو سے ہمارے سامنے آتی ہے اور بتاتی ہے کہ ہمارے لیے وہی صحیح راہ ہوسکتی ہے' جو ہم نے اختیار کی ہے' اور جسے ہمیں آخر تک پہنچانا ہے۔

میرے دوست مولوی حسرت موہانی (2) نے فرمایا کہ اس امر کا اعلان کردیا جائے کہ کیا دفاعی جنگ بھی ممنوع ہے' دفاعی جنگ : ڈیفنس میں لڑنا۔ دفاع کا کیا سوال ہے! میرا اعتقاد ہے کہ قرآن نے جن حالتوں میں مسلمانوں کو جنگ کا حکم دیا ہے' وہ دفاعی ہی نہیں ہے بلکہ ہجوم کی جنگ بھی ہے۔ موپلاؤں اور مسلمانوں کی جماعت کے لیے بعد اس کے کہ مسلمانوں کے اہل الرائے نے' صاحب بصیرت نے' ان سب نے جو متفق ہوکر متحد ہوکر' اس امر کا اعلان کیا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے یہ راہ عمل ہے' تو ہندوستان کے ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اس سے علیحدہ قدم نہ لے جائے۔ مقصد اس وقت یہ ہے کہ اور بلاشبہ یہ کھلی حقیقت ہے۔ اگر موپلاؤں نے ان ایام میں تلوار اٹھائی' تو انکا یہ فعل ہماری اس جماعت کے فیصلے کے خلاف ہے۔ اور اب ان کے اس فعل سے ہمارے تمام مقاصد پر جو اثرات پڑیں گے' ان کی بنا پر ہم ہمیشہ حکم لگائیں گے' اگر ان سے ہم کو مشکلات پیش آئیں' جن کی مصالحت کی ہمیں ضرورت ہے' تو ہم اس سے زیادہ سخت رائے ظاہر کریں گے' اور احکام لگائیں گے کیونکہ ان کا

یہ فعل ایسا فعل ہے کہ انہوں نے جمعیتہ کے فیصلہ کو ترک کرکے کیا' بشرطیکہ انہیں جمعیت کے فیصلہ کا علم ہو۔

کالی کٹ تک میں خود جا چکا ہوں اور ان لوگوں سے مل چکا ہوں۔ یہ چیز کہ خلافت کمیٹی کا اعلان کیا ہے' ہندوستان کے علماء کا اعلان کیا ہے' یہ چیز پہلے ان کی نظروں سے پوشیدہ تھی۔ اگرچہ یہ سچ ہے کہ جس درجہ اعلان ہونا چاہیے تھا' ویسا اعلان نہیں ہوا' لیکن اگر ان کو علم تھا اور انہوں نے باوجود علم کے قدم اٹھایا' تو ان کا قدم جمعیتہ کے قدم' جمعیتہ کے عمل' جمعیتہ کے فیصلے کے خلاف ہے' اس سبیل کے خلاف ہے' جو ہندوستان کے علماء کی جماعت نے اپنے لیے نکالا۔ یقیناً ہم اس کا بھی اعلان کرسکتے ہیں کہ آج کے بعد بھی ہندوستان کے علماء کے خاص جماعتی فیصلے کے خلاف ہندوستان کے مسلمانوں کا کوئی فرد' کوئی جماعت جو کام کرے گی' اگر وہ اس جماعتی فیصلے کے خلاف ہے' تو یقیناً اس کو ملامت کی جائے گی' سرزنش کی جائے گی' شریعت کے احکام ہم کو مجبور کریں گے کہ ہم انگلیاں اٹھائیں۔

موپلاؤں کی حرکات کے متعلق جو رائے میں دے سکتا ہوں' یہ رائے تھی۔ اس وقت بحث یہ ہے کہ جو چیز ہمارے سامنے لائی گئی' جو صورت ہمارے سامنے پیش کی گئی ہے' کہا جاتا ہے کہ بلا حملہ کے انہوں نے مطالبات خلافت کا نام لے کر تلوار اٹھائی۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ واقعات کیا ہیں! ہمارے پاس بہت سے ایسے خطوط ہیں' جن سے اس واقعے کی تکذیب ہوتی ہے۔ میرے پاس اس قسم کا مواد موجود ہے۔ صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ جھوٹے تھے۔ وہاں بھی وہ واقعات کیے گئے جو آج ہندوستان کے گوشے گوشے میں کیے گئے۔ ایک حد تک انہوں نے صبر کیا۔ جب پیمانہ صبر لبریز ہوگیا' تو اس کا قدرتی نتیجہ تھا کہ پیمانہ چھلکے۔ اگر ان پر حملہ کیا گیا' اگر ان پر کسی فوج اور کسی حکومت نے کسی جماعت نے حملہ کیا ہو' یا مثلاً ہم پر اس وقت حملہ ہو' تو اس کی کئی صورتیں ہیں۔ ایک صورت تو متعلق ہے عام حالات حملہ آور کے' اس کے جواب میں قرآن بتلا چکا کہ یقیناً مسلمانوں کو حفاظت کرنا چاہیے' تلوار اٹھانا چاہیے' اور مقابلہ کرنا چاہیے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ہندوستان میں جو ایک خاص طرح کی بدبختانہ زندگی

ڈیڑھ سو برس سے ہندوستان کے مسلمان برداشت کر رہے ہیں اور جس طرح انھوں نے اپنی غفلت کی وجہ سے' نامرادی کی وجہ سے' سرکشی کی وجہ سے' تعلیم الٰہی سے اعراض کی وجہ سے' جو طریقہ اختیار کرلیا کہ وہ اس درجہ اس حالت میں غرق ہو گئے ہیں کہ اس حالت سے ان کو نکالنا یہ معنی رکھتا ہے کہ ایک پوری تعلیم کو الٹ دیا جائے اور ایک انقلاب پیدا کر دیا جائے۔ ہندوستان کے اندر بھی خاص طور پر مظالم کیے گئے۔ خاص طور پر مسلمانوں کے ساتھ بسنے والی حلیف قوموں کا خون بہایا گیا۔ اسلامی حکومت کے مقابلے میں' اسی حکومت کی فوجیں صف آراء ہوئیں۔ ایسی حالت میں اب ہندوستان کے مسلمان جن کی تعداد دس کروڑ تک پہنچتی ہے اور جو دو سو برس سے اس زندگی کو گوارا کیے ہوئے ہیں' اب ہندوستان کے مسلمان کیونکر اپنے فرائض شرعی کو انجام دیں۔ تو اگر ہندوستان کے علماء نے' اہل الرائے نے اس امر کا فیصلہ کرلیا کہ بلاشبہ ایسی منزل عمل میں آگئی ہے' ایسے نتائج موجود ہیں' اس طرح کی بے استطاعتی' اس طرح کی غفلت و بے سروسامانی آج تمہاری کمر میں نہیں ہے' بلکہ تمہارے دلوں میں پیدا ہو گئی ہے۔ تلوار ایک لوہار کے یہاں نہیں' تو دوسری جگہ مل جائے گی۔ ہندوستان کے علماء نے اگر یہ فیصلہ کیا کہ مسلمانوں کے لیے یہ حکم ہے کہ تمام مصائب کو جھیل جائیں' حملہ ہو' تو اس کو بھی جھیل جائیں' قید خانے کے دروازے کھولے جائیں' تو اس کو بھی جھیل جائیں' اگر انہوں نے یہ فیصلہ احکام شرع کے خلاف نہیں کیا ہے' تو مسلمانوں کو چاہیے کہ اس پر عمل پیرا ہوں۔ مقصد یہ تھا کہ موجودہ حالت میں جب ہندوستان کے مسلمانوں نے بحیثیت جماعت کے یہ فیصلہ کرلیا تو ہندوستان کے ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اس کی پیروی کرے' اس سے منحرف نہ ہو۔

موپلا اور مالا بار کے مسلمانوں نے اگر یہ سوچا ہے' تو اس کے کہہ دینے میں ہم کوئی باک نہیں رکھتے کہ انہوں نے ایسا کیا' تو مسلمانان ہند کے متفقہ طرز عمل سے انحراف کیا۔ یقیناً ان کو ملامت کی جا سکتی ہے اور ان کو سرزنش کی جا سکتی ہے' اس عمل کے وہ ذمہ دار ہیں' ہم شریک نہیں ہیں۔

اس امر کے متعلق جو کچھ مجھے عرض کرنا تھا کر چکا۔ تشدد کے متعلق جس چیز کو

ظاہر کرنا چاہتا تھا' یہ تھا کہ ہم نے یہ طرز عمل اختیار کیا ہے تو محض اس لیے کہ چونکہ علمائے دین کا فیصلہ ہے۔ اس طرح کسی انسان کا پیشرو ہونا' کسی قائل لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے لیے جائز نہیں ہے۔ پس' ہمارا یہ بھی فرض ہے کہ معلوم کریں کہ تمہاری زبان کے مطابق مسلمان عدم تشدد پر عامل رہیں گے' تو اس کی کیا وجہ ہے؟ امید ہے کہ آنے والے دو دنوں کے اندر وہ بھی آپ کے سامنے آجائے۔

حضرات!

اب اس کے بعد جو ضروری ٹکڑے ہیں' جن کو میں اس وقت نظرانداز کرتا ہوں' مثلاً ہندو مسلمانوں کا اتحاد ہے۔ اس اتحاد کے متعلق احکام شرعی کیا ہیں؟ اس امر کا قطعی فیصلہ کہ اس بارے میں احکام شریعت کیا ہیں' حالات گزشتہ کی بنا پر' موجودہ حالات کی بنا پر' اور آئندہ آنے والے حالات کی بنا پر' ایک نہایت ضروری موضوع یہ تھا۔ لیکن میں اس کو اس وقت نظرانداز کرتا ہوں' شاید کل یا پرسوں عرض کروں گا۔ اس لیے کہ وقت کی صورت مساعدت نہیں کرتی۔

ایک اور مسئلہ ہے جو ایک ہندی لفظ کے بھیس میں سوراج کے لفظ میں آیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ محض لباس کا تغیر آپ کو حقیقت و معانی سے ناآشنا نہ کر دے گا۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ حقیقت آپ کے لیے کوئی نئی حقیقت نہیں ہے' نیا پیغام نہیں ہے' نہ عمل کا کوئی نیا دروازہ کھلنا چاہتا ہے۔ مسلمانوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس کرۂ ارضی کے نیچے' دنیا کی کوئی جماعت' قوم' فرد نہیں ہے جس کو اس کے خدا اور رسول نے اس حقیقت محبوبہ کو' اس کے دل کے ایک ایک گوشہ میں نہ رچا دیا ہو اور اس کے تمام جسم میں نہ پھیلا دیا ہو۔ یہ حقیقت ہے جو تیرہ سو برس سے آپ کے سامنے موجود ہے۔

(اس موقع پر یکایک بجلی کی روشنی گل ہوگئی اور تمام ہال میں تاریکی چھا گئی۔ رضاکاروں نے گیس لیمپ اور لالٹینیں ہال میں منگائیں۔ لیکن چند منٹوں کے بعد ہی بجلی کی روشنی پھر ہوگئی' جس پر حاضرین نے نعرہ اللہ اکبر بلند کیا۔)

عزیزان من!

آج کی صحبت صرف دس منٹوں کی اور باقی رہ گئی ہے۔ عزیزان من! یہ روشنی ایسی قیمتی نہ تھی جس کے ملنے پر نعرۂ تکبیر بلند کرو۔ ہاں اگر ایمان کی روشنی مل گئی ہو، تو اس کے لیے جس قدر چاہو، نعرۂ تکبیر بلند کرو۔ اگر آپ خاموشی سے کام لیں، تو آج کی صحبت چند منٹوں میں ختم ہو جائے گی۔ بہرحال یہ ضروری مسئلہ تھا، اب اس کا اجمالی ذکر بھی آج کی صحبت میں ملتوی رکھتا ہوں۔ انشاء اللہ بشرط زندگی و توفیق الٰہی کل اور پرسوں کی صحبتوں میں بیان میں آ جائے گا۔

اگر حقیقتاً آپ کے قلب کے اندر وہ شوق معانی، وہ ذوق عرفانی پیدا ہوگیا کہ آپ حق کی صدائیں سننے کے لیے اپنے سینوں کے اندر ایسی لازوال آشفتگی رکھتے ہیں کہ بستر کی آرام وہ کروٹیں قربان کردیں، رات بھر کی تکلیف اور اختر شماری کے لیے، تب بھی آپ اس صدا کے سننے کے لیے تیار ہیں، تو میں بتلانا چاہتا ہوں کہ اس کے خرچ کرنے کے لیے یہ موقع نہیں ہے کہ بہت زیادہ دیر تک میری تقریر سنیں، بلکہ اس کے خرچ کرنے کا اصلی محل یہ ہے کہ اللہ کے عشق میں، اس کے اتباع میں، اس کی پیروی میں، اس کی راہ میں، سب چیز قربان کرنے کے لیے اپنے شوق دکھلاؤ، اپنے دل کے جذبات دکھلاؤ۔ تاہم میں آپ کے ذوق و شوق کا معترف ہوں۔

اور ساتھ ہی اس امر کی بھی معافی چاہوں گا کہ ابھی تھوڑی دیر ہوئی، خطبہ صدارت کے اوراق سنائے جارہے تھے، تو موضوع روکھا پھیکا تھا اور کچھ طرز بیان روکھا پھیکا۔ اگرچہ میرے عزیز سرسری طور پر اسے دیکھ چکے تھے، تاہم پڑھنے میں کچھ رکاوٹ ہوئی اور پبلک میں شور ہوا۔ مجھے مجبور ہو کر اس لب و لہجہ میں کہنا پڑا اور علی الخصوص جب کہ ایسے بزرگوں کا مجمع موجود ہے۔ میں اس لب و لہجہ کا عادی نہیں ہوں۔ مگر میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ ایک حقیقی صورت کے احساس نے مجھ کو مجبور کیاکہ اس لب و لہجہ کو اختیار کروں۔

ہماری مجلسوں میں سب سے بڑا جو جائز مطالبہ ہے، "قولاً" و "شرعاً" ایک نظام ہے، انضباط ہے، صبر ہے، ہم میں اس وقت تک اتنا صبر نہیں پیدا ہوا ہے۔ یہاں ہمارے چند ہزار نفوس موجود ہیں۔ اگر وہ چیز ان کے سامنے آتی ہے اور ان کو بتلایا گیا ہے کہ

وہ سکون کے ساتھ سنیں' تو یقیناً ہمارے اندر اتنا صبر اور قاعدہ ہونا چاہیے اور ان لوگوں کی اطاعت کا جذبہ ہونا چاہیے۔ جن کو ہم مستحق اطاعت سمجھتے ہیں۔ مان لو کہ یہ چیز تمہارے لیے کڑوی کسیلی تھی' لیکن اگر آدھ گھنٹہ کے لیے تم اتنی تلخی گوارا نہیں کرسکتے' تو اللہ کے راستہ میں قربانی کی تلخی کیسے گوارا کرو گے؟ وہ ہنگامہ جو بار بار گزرتا تھا' میری طبیعت کو ناگوار گزرا اور اس لب و لہجہ میں آپ کو مخاطب کیا' جس کا میں عادی نہیں ہوں۔ اگر کسی عزیز کو ناگوار گزرا ہو تو معافی چاہتا ہوں۔ وقت بھی زیادہ ہو چکا ہے اس لیے آج کا جلسہ ختم کیا جاتا ہے۔

میں علمائے کرام کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ ان کا حسن ظن میرے لیے توشہ آخرت ہوگا۔

7

اجلاس خصوصی
انڈین نیشنل کانگریس

دلی، 15 دسمبر 1923ء

نمائندگان قوم، خواتین اور حضرات!

قومی جدوجہد کے ایسے نازک اور فیصلہ کن وقت میں جیسا کہ آج درپیش ہے، آپ حضرات حالات کے تقاضا سے مجبور ہوئے کہ سال کے اختتام سے پہلے اس ایوان قومی میں جمع ہوں، اور وقت کی مشکلات کے لیے حل اور رہنمائی حاصل کریں۔ اگر میں کہوں، یہ وقت کام اور مقصد کی مشکلات کا ایسا اجتماع ہے جس کی اس ایوان کی تاریخ میں کوئی نظیر موجود نہیں، تو میں سمجھتا ہوں، یہ ایسی بات ہوگی، جو آپ میں سے ہر شخص محسوس کررہا ہے۔ تین سال ہوئے جب آپ ایک ایسے ہی خاص اجلاس میں بمقام کلکتہ جمع ہوئے تھے، تو وہ بھی آپ کی تاریخ کا ایک عظیم الشان دن تھا۔ لیکن اس دن کی عظمت قوموں کے ان دنوں کی مانند تھی، جن میں آزادی کی جنگ کا اعلان کیا گیا ہے، اور آج کے دن کی اہمیت میں تاریخ کے ان ایام کی جھلک پائی جاتی ہے، جن میں قوموں کو جنگ کی فیصلہ کن دشواریوں میں سے گزرنا پڑا ہے۔ اس دن آپ جنگ کے آغاز کے لیے فکر مند تھے، آج اس کے انجام کے لیے مضطرب ہیں۔ اس وقت

آپ کو سفر کی جستجو تھی، آج گمرہی کا خطرہ پیش آگیا ہے۔ اس وقت آپ ساحل پر کشتی کے لیے مضطرب تھے، لیکن آج زندۂ جاوید حافظ کے لفظوں میں "کشتی ایک کنارہ سے چل چکی ہے مگر دوسرا کنارہ ابھی دور ہے اور موجیں گھیرا ڈال رہی ہیں۔" حضرات! جب میں دیکھتا ہوں کہ ایسے نازک موقع کی صدارت کے لیے آپ کی نظر انتخاب مجھ پر پڑی، تو مجھے آپ کی جانب سے عزت اور اعتماد کا ایک ایسا عظیم پیام ملتا ہے، جس کو میں اپنے استحقاق کا نہیں، بلکہ صرف آپ کے فیاضانہ حسن ظن ہی کا نتیجہ سمجھ سکتا ہوں۔ اگر میں اپنی ناچیز خدمات کے ذریعہ آپ کا ایسا اعتماد حاصل کر سکا ہوں، تو مجھے یقین کرنا چاہیے کہ یہ میرے وطن و قوم کی جانب سے قبولیت کی ایک بہت ہی بڑی سند ہے۔ میں اس عزت کے لیے آپ کا شکرگزار ہوں، مگر اس ذمہ داری کے لیے جو آپ کے اعتماد کی مقدس امانت ہے، آپ ہی سے ہمرہی و اعانت کی التجا کرتا ہوں۔ بلاشبہ آج ہمیں ایک نہایت مشکل وقت میں، نہایت مشکل کام درپیش ہے۔ لیکن ہمارا یقین متزلزل نہیں ہے، اور گو ہمیں اپنی تدبیروں کی طرف سے شبہات رہے ہوں، لیکن ہمیں اپنے مقصد کی سچائی میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ ہماری عاجزانہ کوششیں حق اور انصاف کے لیے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ ایسا ہو۔ پس، یہ تو ضرور ہے کہ ہمیں اپنی درماندگیوں اور کمزوریوں کا اقرار ہو، ہم وقت کی آزمائشوں اور راستے کے کھٹکوں کی طرف سے فکرمند ہوں۔ ہمیں مشکلوں اور رکاوٹوں کی سختیوں سے پورا پورا اندیشہ رہے، لیکن ہمیں نتیجہ کی طرف سے کبھی ہراساں نہ ہونا چاہیے۔ ہمیں یقین رکھنا چاہیے کہ خدا کی جس رحمت نے ابتدا کی بے سروسامانیوں میں ہمارا ساتھ دیا تھا، وہ درمیان کی اس آزمائش میں بھی ہماری دستگیری کرے گی اور بالاخر انجام کی فتح مندی بھی ہمارے ہی لیے ہے۔

ایک وقفہ نظر

حضرات!

میں آج اپنے بحث و نظر کے محدود دائرے سے بے خبر نہیں ہوں۔ خیالات کا

ہجوم اور مطالب کی وسعت کتنی ہی میرے لیے ضبط آزما ہو' لیکن میں ان حدود کی طرف بڑھنے سے اپنی نگہبانی کروں گا' جو آپ کے سالانہ اجلاس کے صدر کے لیے محفوظ رہنا چاہئیں۔ علی الخصوص ایسی حالت میں جب کہ آپ اس کی صدارت کے لیے ایک بہتر انتخاب کرچکے ہیں۔ میں اس سے آگاہ ہوں کہ یہ ایک انقلابی دور ہے اور منجملہ انقلابات کے ایک انقلاب اس خیال میں بھی ہو چکا ہے' جو کبھی اس ایوان کی ادبی روایات میں بمنزلہ رسم و قاعدہ کے تھا۔ اب آپ صدر مجلس سے متمنی نہیں ہیں کہ وہ آپ کے سیاسی لٹریچر میں کوئی ضخیم اضافہ کرے' یا اپنی تھکا دینے والی فصاحت سے آپ کے حوصلہ سماع کا امتحان لے برخلاف اس کے آپ کی خواہش یہ ہے کہ وہ جلد سے جلد آپ سے کہہ دے کہ کام شروع کیجئے۔ آپ کے جذبات کا یہ تغیرفی الحقیقت اس بنیادی انقلاب کا نتیجہ ہے کہ ہندوستان کی قومیت بحث و نظر کا ابتدائی دور طے کرکے عمل کی زندگی میں گامزن ہو چکی ہے اور اس لیے قدرتی بات ہے کہ آپ کے ذوق عمل پر بحث و نظر کی طوالت گراں گزرتی ہے اور اب آپ کی پسندیدہ چیز فصاحت نہیں رہی' بلکہ عمل کی سادگی ہے۔

پس اگر آج میں اس اجلاس کے اصلی مقصد کے سوا اور تمام ضمنی اور نواحی افکار سے چشم پوشی کرلوں' اور جو کچھ عرض کروں' اس میں سادگی و اختصار ملحوظ رکھوں' تو میں امید کرتا ہوں یہ ایسی بات ہوگی جس میں اپنی خواہش سے زیادہ آپ کی خواہش کی تعمیل کروں گا۔

وقت کے مسائل

لیکن اگر میں وقت کے حالات و مسائل پر نظر بھی ڈالتا' جب بھی میرے لیے گویائی پر خاموشی ہی کو ترجیح تھی۔ ہمارے لیے اب وقت کی کونسی بات ہے' جو نئی ہو سکتی ہے؟ اور جس کا ہم اس لیے ذکر کرسکتے ہیں کہ اس سے ہماری معلومات یا محسوسات کے لیے کوئی نئی صورت حال پیدا ہوگئی ہے؟ ایک زمانہ تھا جب ہندوستان کی قومیت کا احساس صرف اس حد تک پہنچا تھا کہ دفتری اقتدار کی ناانصافیوں پر نکتہ چینی کرے۔ پھر

نکتہ چینی شکایت میں مبدل ہوئی اور شکایت نے احتجاج اور سوال کی صورت اختیار کرلی۔ ایک مدت تک ہمارا طرزِ عمل یہ رہا کہ ہر نئی ناانصافی پر ایک نئی چیخ ہمارے منہ سے نکل جاتی تھی، لیکن اب معاملہ اس حد سے گزر چکا ہے کہ کام اور فیصلہ کے سوا کسی بات کی بھی گنجائش رہی ہو۔ ہم ناانصافی دیکھتے دیکھتے اس کے عادی ہوگئے ہیں، گویا یہ ہماری روزانہ زندگی کا ایک معمولی واقعہ ہے۔ اب ناانصافیوں کا ذکر نہ صرف غیرضروری ہے، بلکہ اپنے عمل و یقین میں شک کرنا ہے۔ ہمارے سامنے حقیقت اپنے آخری درجہ یقین تک آچکی ہے، اس میں تو مزید اضافہ ہو سکتا ہے، نہ کسی نئے پردے کے ہٹنے کا انتظار باقی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ہمارے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے، وہ برابر ہوتا رہے گا، جب تک ہم اسے خود نہ بدل دیں گے۔ ہمارا سابقہ افراد اور اوقات سے نہیں ہے، جن کی تبدیلی حالات پر موثر ہو، ہمارا سابقہ ایک نظام سے ہے، جس کی نسبت ہمیں یقین ہے کہ وہ اپنی خلقت ہی میں نامنصفانہ ہے اور اگر یہ اس وقت تک قائم رہا ہے، تو اس لیے نہیں کہ اس کے اندر اس کی ذاتی مضبوطی موجود ہے، بلکہ صرف اس لیے کہ ہماری غفلت نے اس کے لیے ستون بہم پہنچا دیے ہیں۔ پس ناانصافی جب کہ اس کا عمل نہیں ہے، بلکہ خاصہ ہے، تو ہمیں نہ متعجب ہونا چاہیے اور نہ شاکی، بلکہ صرف یہ کوشش کرنی چاہیے کہ وہ قائم نہ رہے۔

قدیم حقیقت اور نیا اعتراف

البتہ میں حقیقت کہنہ کے ان تازہ اعترافات کا پوری کشادہ دلی کے ساتھ خیرمقدم بجا لاتا ہوں، جو ہمارے ان بھائیوں کی زبانوں پر بھی جاری ہوگئے ہیں، جنہیں ہمارے طریق عمل سے مایوسی کی شکایت تھی۔ بلاشبہ نام نہاد اصلاحی کونسلوں کے سہ سالہ تجارب، محصول نمک، پبلک سروس کمیشن اور مختلف محکموں کے ہندوستانی بنانے کے معاملات میں ہمارے لیے کوئی نئی بات نہیں ہوئی ہے۔ کینیا کے فیصلہ میں بھی ہم کوئی نئی ناانصافی نہیں پاتے، بلکہ یہ ایک قدیم اور متوقع ناانصافی کا صرف تازہ اعادہ ہے۔ اس میں نسلی اور قومی تعصب کا جذبہ ہے اور وہ اب سے پہلے کب نہ تھا؟ اس میں برطانی

مواعید کی شکست ہے اور گزشتہ پانچ سال کے واقعات کے بعد کم از کم برطانیہ کے "مواعدوں" کی شکست میں کوئی ندرت باقی نہیں رہی ہے۔ اس میں ہندوستان کی عزت سے انکار ہے، لیکن ہماری معلومات میں کوئی نظیر اس کے عزت و احترام کے اقرار کی بھی موجود نہیں۔ تاہم ان حضرات کے لیے ان معاملات میں ایسے انکشافات ہوئے ہیں، جن کی تجربہ کی تکمیل اور حقیقت کے اعتقاد کے لیے ضرورت تھی۔ اب ان میں سے اکثر معترف ہیں کہ "نام نہاد اصلاحات محض دھوکے کی ٹٹی ہیں۔" اور "ہندوستان کی خودداری کی حفاظت موجودہ حالات میں ناممکن ہے۔" نیز "برطانیہ کے ٹوٹے ہوئے وعدوں پر اب کوئی بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔" وہ یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ بائیکاٹ کے سوا چارۂ کار نہیں ہے اور یہ کہ امپریل نمائش کا ہندوستان کو پوری قوت کے ساتھ بائیکاٹ کرنا چاہیے۔

حضرات! ہم اس موقعہ پر ہرگز اس بات کی شکایت نہیں کریں گے کہ انہوں نے حقیقت کے اعتراف میں دیر کی۔ ہم یہ بھلا دیں گے کہ حقیقت اس تین سال سے پہلے بھی اتنی ہی بے نقاب تھی، جس قدر فیصلہ کینیا کے بعد آج نظر آرہی ہے کیونکہ حقیقت کا اعتراف جلد کیا یا بدیر، لیکن بہرحال اعتراف ہے اور اس تحسین کا مستحق ہے جو اعتراف حقیقت کے لیے ہونی چاہیے۔ ہم ان سے صرف یہ کہیں گے کہ آپ کے وطن کو اب بھی آپ کی اسی طرح ضرورت ہے، جس طرح تین سال پہلے تھی۔ اگر واقعی ہم سب کا اعتقاد ہے کہ ہندوستان کی عزت کی حفاظت کا وقت آگیا، تو کیوں نہ ہم اپنے اختلافات کے باوجود بھی اس ایک مقصد میں متحد ہو جائیں کہ ہندوستان کی عزت بچائی جائے۔

ترکی کی فتح عظیم

حضرات!

مجھے یقین ہے کہ آج آپ سب سے پہلے جس بات کے متوقع ہونگے، وہ یہ ہے کہ میں آپ کے ایک پرجوش جذبہ تہنیت کی ترجمانی کی عزت حاصل کروں، جو آپ

کی قومی جدوجہد کی تاریخ سے ایک عجیب مگر پر فخر وابستگی رکھتا ہے اور جس میں آپ کی تاریخ کی ایک شاندار داستان عمل پنہاں ہے۔ خدا کی مرضی یہی تھی کہ مشرق کے دو دور دراز ملکوں کو انصاف اور آزادی کے نام پر ایک دوسرے سے اس طرح جوڑ دے کہ ایک کی مصیبت پر دوسرے کی زبان سے آہ نکلے' اور ایک کی فتحمندی میں دوسرے کے لیے فتح و مراد ہو۔ یہ مشرق کے دو بعید گوشے جنہیں انصاف اور آزادی کی یگانگت نے اس قدر قریب کردیا ہے' کون ہیں؟ یہ ہندوستان ہے' جس نے عین اس وقت جب کہ اسے خود اپنی آزادی کا دشوار گزار مرحلہ درپیش تھا' خلافت اسلامی اور حکومت ترکی کی آزادی و خودمختاری کو بھی اپنی آزادی کی طرح اپنا قومی مطالبہ قرار دیا' اور یہ ٹرکی ہے اور اس کی جدید قومیت کا ظہور ہے' جس کی انقلاب انگیز فتحمندیوں کا دنیا نے ایک زندہ جاوید معجزہ کی صورت میں مشاہدہ کیا ہے' اور جس کی فتح مند حب الوطنی کی روح تمام سرزمین مشرق کے لیے زندگی اور عمل کا ایک نیا پیغام لے کر نمودار ہوئی ہے۔

حضرات!

ساڑھے آٹھ مہینے ہوئے' جب آپ نے اسی ایوان میں انگورہ کے محب الوطنوں کو ان فتوحات پر مبارکباد دی تھی' جو ترکی فوجوں نے میدان جنگ میں حاصل کی تھیں۔ فی الحقیقت یہ فتوحات ایک آنے والی فتح عظیم کا پیش خیمہ تھیں' لیکن ان میں میدان سیاست کی ذہنی اور معنوی فتوحات کا پیغام مضمر تھا۔ یہ اس بے نقص اور بے داغ فتح کی ابتدائی قسط تھی' جس کی تکمیل میں دنیا ایک گری ہوئی عظمت کے سنبھالے کی جگہ ایک نئی عظمت کی تعمیر دیکھنے والی تھی۔ یہ گویا دنیا کے نام ایک اعلان تھا کہ قوموں کی صفیں ایک نئی فتحمند قوم کے استقبال میں چشم براہ ہو جائیں۔ یہ فتح و ظفر کا ایک بے روک کوچ تھا' جس کی راہ میں اگرچہ کرۂ ارضی کی سب سے بڑی طاقتیں اپنے بے پناہ منصوبوں اور اٹل رکاوٹوں کے ساتھ حائل تھیں' لیکن وہ اپنے جذبہ حب الوطنی کے اچنبھوں اور ہوشربائیوں سے تاریخ کے لیے ایک پیام اعجاز لیے ہوئے بے خوف بڑھتا رہا۔ بالآخر وہ وقت آگیا' جب کوچ نے منزل پہ دم لیا۔ اور تاریخ نے بڑھ کر اپنے دروازے کھول دیے۔ تاکہ ایک نئی فتحمند قوم کا خیرمقدم بجا لائے۔ گزشتہ جولائی کی

چوبیسویں تاریخ کو جب لوزان میں ترکی صلح نامہ پر دستخط ہوئے' تو فی الحقیقت یہ ایک نئی قومی عظمت کی پیدائش کا دن تھا۔ یہ ان تمام فتح مندیوں کی تکمیل تھی' جن کی ایک قوم کو زندگی اور عزت کے لیے ضرورت ہو سکتی ہے۔ اس میں فوجی فتح مندی سے زیادہ سیاسی فتح تھی۔ اور دونوں سے بڑھ کر وہ فکری اور معنوی فتح' جن کے بغیر جنگ اور سیاست کی فتح مندیاں بھی ہیچ ہیں۔

ایک عالمگیر مبارکباد

حضرات!

اس فتح عظیم پر ہندوستان اپنی گرمجوشی اور مخلصانہ مبارکباد پیش کرتے ہوئے جس قدر بھی نازاں ہو' کم ہے۔ ہندوستان اس واقعہ کی صورت سے زیادہ' اس کے معانی کی وسعت کا راز شناس ہے۔ وہ ترکی کی فتح میں نہ صرف اپنے مطالب کی فتح' بلکہ تمام سرزمین مشرق کی فتح کا نظارہ کررہا ہے۔ میں سب سے پہلے حضرت خلیفۃ المسلمین کی خدمت میں ہندوستان کا یہ ہدیہ ارادت پیش کرنے کی عزت حاصل کرتا ہوں' پھر انگورہ کی قومی مجلس کو اس کے نئے جمہوری دور کی فتح مندیوں پر مبارکباد دیتا ہوں' اور الاخر ہم سب کی نگاہیں بے اختیار موجودہ عہد کی اس عظیم ترین شخصیت کی طرف اٹھ جاتی ہیں' جس کا وجود فی الحقیقت ان تمام مبارکبادیوں کا اولین مخاطب ہے۔ میں غازی مصطفیٰ کمال پاشا کو ہندوستان کی طرف سے مبارکباد دیتا ہوں۔

حضرات!

میں نے ہندوستان اور ترکی کا ذکر کیا۔ مگر میں محسوس کرتا ہوں کہ اس مبارکباد کے اصلی مطالبہ سے ابھی عہدہ برآ نہیں ہوا ہوں۔ یہ فی الحقیقت اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے کہ کسی سرزمین یا قوم کی نسبت محدود کی جائے۔ یہ کشمکش جو پانچ برس سے دنیا کی صلح عام کو ملتوی کر رہی تھی' محض قوموں اور حکومتوں کی جنگ نہ تھی۔ عصمت پاشا (1) کے فتح مند تدبر اور لارڈ کرزن (2) کی دھمکیوں میں صرف ترکی اور برطانیہ یا مغرب و مشرق ہی کی نمائندگی نہ تھی' بلکہ اس سے بھی زیادہ کوئی چیز مضمر تھی۔ یہ

دراصل اصولوں کی جنگ تھی اور متقابل عقیدوں کا معرکہ تھا۔ ایک طرف طاقت کا گھمنڈ تھا' دوسری طرف حق اور انصاف کی بے سروسامانی تھی۔ طاقت کا دعویٰ تھا کہ کمزور قوتوں کو زندگی کا کوئی حق نہیں۔ انصاف کا عاجزانہ اعلان تھا کہ زندگی کا حق ہر اس قوم کو ہے' جو زندہ رہنے کا ارادہ کرلے۔ جیساکہ قاعدہ ہے' عرصہ تک کشمکش جاری رہی۔ بالآخر خدا کی مرضی نے فیصلہ کا اعلان کردیا۔ طاقت کو باوجود اپنے تمام سروسامان کے شکست ہوئی اور انصاف نے اپنی ساری بے سروسامانیوں اور مایوسیوں کے ہوتے ہوئے فتح پائی۔ پس فی الحقیقت ترکی کی فتح اس سے زیادہ تر ہے کہ اسے ایشیا یا مشرق کی فتح سے تعبیر کیا جائے۔ وہ انصاف کی جیت ہے اور انصاف مغرب و مشرق کے امتیاز سے بالاتر ہے۔ انصاف کا نہ تو کوئی وطن ہے' نہ کوئی قومیت' اس کی قومیت اگر ہوسکتی ہے' تو وہ صرف بالاتر اور عالمگیر انسانیت ہے۔ پس مجھے اجازت دیجئے کہ میں عالم انسانیت کی اس فتح پر تمام عالم انسانیت کو مبارکباد دوں' میں مغرب اور مشرق کے ہر اس انسان کو مبارکباد دوں' جو انصاف اور انسانی آزادی کا احترام کرتا ہے۔

ناکام ناانصافی

لوزان کے صلح نامہ سے وہ تمام مقاصد بہ استثنائے آزادی عرب حاصل کرلئے گئے' جن کا ترکی اور ہندوستان نے انصاف اور حق کے نام پر مطالبہ کیا تھا۔ اس میں ڈاکٹر ولسن (3) کی ان فراموش شدہ شرطوں اور برطانیہ کے ان مشہور مگر شکستہ وعدوں کا بھی مفاد موجود ہے' جو 1918ء میں کیے گئے تھے۔ ڈاکٹر ولسن کی بارھویں شرط یہ تھی کہ ترکی کی سلطنت محفوظ رکھی جائے گی۔ چنانچہ آج ترکی کی سلطنت موجود ہے۔ برطانی وزیراعظم نے کہا تھا کہ ترکی کو تھریس اور ایشیائے کوچک کے زرخیز اور شہرۂ آفاق علاقوں سے محروم نہیں کیا جائے گا۔ اب ترکی ان علاقوں سے محروم نہیں ہے۔ اس سے بھی زیادہ یہ کہ اس میں نہ صرف ان "وعدوں" کا مفاد ہی موجود ہے' بلکہ وہ باتیں بھی موجود ہیں' جو ان میں نہ تھیں۔ ان میں ترکی کی خودمختارانہ عظمت کا کوئی ذکر نہ تھا لیکن اسے یہ بھی حاصل ہوگئی ہے۔ ان میں اجنبی امتیازات (کیپی چولیشنز) (4) اور

غیر ترکی ڈاک خانوں کے اٹھا دینے کے لیے کوئی ذمہ داری نہیں لی گئی تھی' جو قبل از جنگ بھی عثمانی شہنشاہی کی کامل خودمختاری کی نفی کرتے تھے' اب وہ بھی اٹھا دیے گئے ہیں۔ ان میں ہم کہیں اس کا اشارہ نہیں پاتے کہ ترکی سے ایک ہارے ہوئے حریف کی طرح نہیں' بلکہ ایک مساوی طاقت کی طرح معاملہ کیا گیا۔ برخلاف اس کے ہم ان "وعدوں" میں درۂ دانیال کے بین الاقوامی کر دینے کا ذکر موجود پاتے ہیں' لیکن صلح نامہ نے وہاں بھی ترکی کا اقتدار تسلیم کرلیا ہے۔ بلاشبہ یہ جو کچھ ہوا" وعدوں کا منشا ہے اور انصاف کی تعمیل ہے' لیکن واقعات کی تکمیل کے لیے مجھے اتنا اضافہ اور کرنے دیجئے کہ یہ سب کچھ اس لیے نہیں ہوا کہ وعدے پورے کیے گئے بلکہ اس لیے ہوا کہ وعدے فتح کیے گئے اور طاقت کے وعدے اگر بزور شمشیر فتح کرلیے جائیں' تو وہ وعدوں سے بھی زیادہ دے دینے میں فیاض ہے۔ وہ فاتح کو سب کچھ دے دیتی ہے' لیکن انصاف کے لیے اس کے پاس کچھ نہیں ہوتا۔

حضرات!

یہ صلح فی الحقیقت ایک سوال ہے جس کے جواب میں عنقریب تاریخ عبرت کی داستانیں ترتیب دے گی۔ بلاشبہ انصاف پورا ہوا' اور حق حقدار کو مل گیا' لیکن ان طاقتوں کو کیا ملا جنھوں نے انصاف کی پامالی کے لیے اپنی اٹل اور بے روک ٹوک سرکشی کی قسمیں کھالی تھیں؟ برطانیہ کو کیا ملا' جو کامل چار سال تک اپنے لوٹتے ہوئے وعدے کے ٹکڑے روندتی رہی اور ایک ایسے مضبوط ارادہ کے ساتھ جو اس نے انصاف کے لیے کبھی نہیں کیا' ظلم و جبر کی تکمیل کے لیے وقف ہوگئی۔ اس نے ترکی کو پامال کرنا چاہا' مگر وہ اس کے سارے منصوبوں اور فیصلوں کے خلاف طاقتور ہوگئی۔ اس نے انصاف کے آگے جھکنے سے انکار کیا' لیکن وہ تلوار کے آگے سر بسجود ہوگئی۔ اس نے بار بار قلم سے فیصلے لکھے' لیکن وہ سب تلوار سے پارہ پارہ کر دیے گئے۔ اس نے قوموں کے حاکم اور قسمتوں کے مالک کی طرح جب صلح نامے ترتیب دیئے' تو ہندوستان نے حق اور انصاف کے نام پر فریاد کی' مگر اس نے حقارت کے ساتھ انکار کردیا۔ لیکن جب مصطفیٰ کمال (5) نے تلوار کی نوک سے خود اپنا صلح نامہ لکھ دیا' تو وہ ایک مفتوح

کی طرح جھکی اور اس کے استقبال سے انکار نہ کر سکی۔ ہمیں مورخ کے جواب کا انتظار نہیں ہے کیونکہ دنیا نے جواب دے دیا ہے۔ فی الحقیقت اس نے ترکی کو سب کچھ دے کر خود جو کچھ حاصل کیا ہے' وہ ناکام ناانصافی کا داغ ہے جو پہلے اس کی پشت پر تھا مگر اب اس کی پسند کے مطابق اس کی پیشانی پر نمودار ہو گیا ہے۔

جدید مشرق

ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ حوادث عالم کی جو عظمت ہمیشہ تاریخ کے صفحات پر نمایاں ہوتی ہے وہ کبھی ان کے تماشائیوں کو نظر نہیں آئی ہے۔ ہم دراصل ایک ایسے عہد انقلاب سے گزر رہے ہیں' جو ٹھیک ان وقتوں کے مانند ہے' جن میں مورخین عالم نے کرۂ ارضی کے بڑے بڑے انقلابات کی بنیادیں تلاش کی ہیں۔ دنیا تیزی کے ساتھ ایک نئے پلٹے کے لیے جھک رہی ہے۔ اس کی ساری باتیں جو کل تک غیر متزلزل حقیقت سمجھی جاتی تھیں' اب جنبش میں آیا ہوا تزلزل ہے۔ اس کے اصولوں اور عقیدوں کی طرح اس کے نقشے کے حدود اور خطوط بھی ہل رہے ہیں۔ کتنی ہی بلندیاں ہیں جو گر گر کر پست ہو رہی ہیں اور کتنی ہی پستیاں ہیں جو اٹھ اٹھ کر بلند ہو رہی ہیں۔ عروج اپنے انتہا سے زوال کی ابتدا کر رہا ہے اور مایوسیوں کی تاریکی بڑھتے بڑھتے وہاں تک پہنچ چکی ہے' جس کے بعد سے صبح شروع ہو جاتی ہے۔ کون دیکھ سکتا ہے کہ مستقبل قریب کے دامن میں کیا ہے! تاہم جو کچھ ہو رہا ہے' اس میں ایک نئے مشرق کے انقلاب کا منظر تو بالکل ہی صاف ہے' جس کے لیے کسی کی کہانت کی ضرورت نہیں۔ مشرق کی وہ بیداری جو چوتھائی صدی سے صرف بیداری ہی تھی' اب بیداری کے بعد کی منزلیں طے کر رہی ہے اور جنگ عظیم کی پھیلائی ہوئی ہلاکتوں نے زندگی اور حرکت کی ایک نئی روح مہیا کر دی ہے۔ غازی مصطفیٰ کمال پاشا کے سحرکار ہاتھوں نے صرف ترکی کے بخت خفتہ ہی کو بیدار نہیں کیا' بلکہ مشرق کے دروازہ پر بھی دستک دے دی۔ اب اس کی گونج ایک طرف وسط ایشیا کے میدانوں میں پھیل رہی ہے' تو دوسری طرف افریقہ کے صحراؤں اور ساحلوں پر سے گزر کر بحر ہند کی لہروں کو

عبور کررہی ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اس کی بازگشت عنقریب مشرق کے ایک ایک گوشے سے بلند نہ ہوگی!

حضرات!

ہندوستان مشرق کی اس عام جدوجہد سے اپنی قدرتی اور جغرافیائی وابستگی فراموش نہیں کرسکتا۔ وہ اپنی جدوجہد کو اس سے منسلک کرتا ہوا ربط و یگانگت کے وہ تمام جذبات محسوس کررہا ہے' جو ایک سرزمین کی مختلف جماعتوں میں وقت' حالات اور مقصد کی یکسانی' قدرتی طور پر پیدا کردیتی ہے۔ پس وہ مشرق کی ہر اس قوم کا خیر مقدم کرتا ہے' جو انصاف اور آزادی کے لیے جدوجہد کررہی ہے' اور ہر اس قوم پر افسوس کرتا ہے' جو اس راہ میں اپنے ساتھیوں سے پیچھے ہے۔ وہ مصر' شام' فلسطین' عراق' مراکش اور دیگر اقطاع مشرق کے تمام محب الوطنوں کو یقین دلاتا ہے کہ ہندوستان کے کروڑوں دل ان کی کامیابی کے لیے مضطرب ہیں۔ وہ ان کی آزادی کو بھی اس سے کم محبوب نہیں رکھتے' جس قدر خود اپنے وطن عزیز کی آزادی کو۔

جزیرۃ العرب

علی الخصوص وہ جزیرۃ العرب کے استقلال و حفاظت کے لیے اپنے عہد قدیم کو آج پھر تازہ کرتا ہے۔ یہ مطالبات خلافت کی سب سے زیادہ اہم اور غیر مبدل دفعہ تھی' جس کا 1920ء میں اس ایوان نے اعلان کیا۔ ہندوستان کے لیے یہ مطالبہ صرف اسی لیے اہم نہیں ہے کہ مسلمانوں کا ایک بہت بڑا مذہبی اعتقاد اس سے وابستہ ہے' بلکہ ہندوستان خود اپنی آزادی کے لیے بھی اسے نظرانداز نہیں کرسکتا۔ ہندوستان' مصر اور عرب کی جغرافیائی اور طبیعی حالت کچھ اس طرح واقع ہوئی ہے کہ ان کی سیاسی قسمت ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے وابستہ ہوگئی ہے اور ان میں ہندوستان کا وجود زنجیر کی پہلی کڑی کی طرح اپنے دونوں ہمسایوں کے لیے ہر چیز کی ابتدا ہے۔ یہ ہندوستان ہی کی غلامی ہے جس کو دائمی بنا دینے کے لیے ضروری ہوا کہ نہر سویز برطانیہ کے قبضہ سے باہر نہ ہو اور اب عرب کا استقلال بھی صرف ہندوستان ہی کی بدقسمتی پر

قربان ہو رہا ہے۔ عرب، جس کی آزادی ہندوستانی فوجوں ہی کے ذریعہ پامال کی گئی ہو، اگر برطانوی اقتدار کا ایک نیا ایشیائی مرکز بن گیا، تو پھر ہندوستان کی غلامی کی سرحدیں بحر ہند ہی سے شروع نہ ہوں گی، بلکہ ایک طرف شام کے ساحلوں پر اس کی دیوار کھڑی ہو جائے گی، دوسری طرف خلیج فارس سے گزر کر موصل اور دیار بکر کے حدود سے اس کا آغاز ہوگا۔ ہندوستان عرب کے تمام باشندوں کو یقین دلاتا ہے کہ ان کا استقلال اور اجنبی اقتدار سے تحفظ اس کی جدوجہد کا اب بھی ویسا ہی مقصد ہے، جیسا کہ 1920ء کے اعلان میں تھا۔ وہ اس وقت تک اپنی جدوجہد جاری رکھے گا، جب تک عربی ممالک کا کوئی ایک گوشہ بھی اجنبی اقتدار سے آلودہ رہے گا۔

قسطنطنیہ اور یرودا جیل

حضرات!

جب کہ ہم ترکی کی فتح عظیم کی مبارکباد پیش کرتے ہوئے قسطنطنیہ کے عالیشان ایوان خلافت کی طرف دیکھ رہے ہیں، تو بے اختیار ہمارا خیال ہندوستان کے ایک قید خانہ کی طرف بھی رجوع ہو جاتا ہے جس کی ایک کوٹھڑی کے اندر ہندوستان کی سب سے بڑی شخصیت محبوس ہے۔ میں یقین کرتا ہوں کہ اگر ترکی سے باہر کوئی انسان اس کا مستحق ہے کہ ترکی کی فتح پر اسے مبارکباد دی جائے، تو وہ ہندوستان کے قائداعظم مہاتما گاندھی (6) ہیں۔ مہاتما گاندھی نے اس مقصد کی حمایت میں اس وقت آواز اٹھائی جب کہ خود ترکی کے اندر قومی دفاع کی کوئی صدا بلند نہیں ہوئی تھی۔ یہ ان ہی کی حقیقت شناس نگاہیں تھیں، جنھوں نے اول نظر ہی میں اس مسئلہ کی ساری وسعتوں اور گہرائیوں کا اندازہ کرلیا اور تمام ہندوستان کو دعوت دی کہ یہ صرف مسلمانوں ہی کا نہیں، بلکہ تمام ملک کا قومی مطالبہ ہے۔ حضرات! ہندوستان نے مہاتما گاندھی کی رہنمائی میں مطالبات خلافت کے لیے جو جدوجہد کی، وہ فی الحقیقت موجودہ عہد کا ایک خاص اور اہم واقعہ ہے جس کے نتائج پر تاریخ بحث کرے گی۔ شاید یہ ابھی قبل از وقت ہے کہ ہم اس کے تمام نتائج کا اندازہ کرنا چاہیں۔ تاہم بعض نتائج تو ایسے ہیں، جو بلا کسی بحث

و نظر کے ہم سب محسوس کر رہے ہیں' اور جن میں سے ہر نتیجہ اس درجہ عظیم ہے کہ صرف اسی کے لیے یہ جدوجہد ظہور میں آسکتی تھی۔

ہندو مسلم اتحاد کا مسئلہ جس کے بغیر ہندوستان کی آزادی ایک خواب پریشاں سے زیادہ نہیں' اسی کی بدولت ان مشکلات پر غالب آگیا جو عرصہ سے اس کی راہ میں حائل تھیں۔

ہندوستان کا تمام مشرق میں وہ بین القوی وقار جس نے مشرق کے جدید بیدار حلقہ میں اسے ایک وقیع جگہ دے دی' اسی کا نتیجہ ہے۔ اگر یہ جدوجہد وقوع میں نہ آتی' تو آج ہندوستان کی تمام ایشیا اور افریقہ میں کیا حیثیت ہوتی؟ ترکی اور عرب کی آزادی اسی کی فوجوں کے ذریعہ پامال کی گئی تھی۔ اس لیے ظاہر ہے کہ تمام مشرق کی متفقہ نفرت اور حقارت اس کے حصہ میں آتی۔ جہاں کہیں بھی ایک ہندوستانی نظر آجاتا' انگلیاں اٹھتیں کہ یہ ایک بدبخت ملک کا باشندہ ہے۔ یہ صرف اپنی بدبختی پر قانع نہیں ہے' بلکہ مشرق کی آزاد قوموں کے لیے بھی بدبختی کا ذریعہ ہے۔ لیکن آج حالت بالکل پلٹ چکی ہے۔ آج ہندوستان سر اٹھا کر یہ کہہ سکتا ہے کہ اس کے دامن پر اس کی بے بسی نے جو دھبہ لگا دیا تھا' اس کی مرضی اور اختیار نے اسے دھو دیا ہے۔ اگر ایسا ہوا تھا کہ بلا اپنی مرضی اور خواہش کے ہزاروں ہندوستانی میدان جنگ میں گئے' تاکہ ترکوں اور عربوں کی آزادی کے خلاف تلوار اٹھائیں' تو یہ بھی ہو چکا ہے کہ خود اپنی مرضی اور خواہش سے ہزاروں ہندوستانی جیل خانوں میں گئے' تاکہ ترکوں اور عربوں کے ساتھ انصاف کیا جائے۔ آج مشرق کے ایک ایک گوشہ سے ہندوستان کے لیے عزت و احترام کی صدائیں اٹھ رہی ہیں۔ قسطنطنیہ میں اس کا نام اس طرح لیا جاتا ہے' گویا وہ مشرق کی آزادی کا علمبردار ہے۔ قاہرہ کے بازاروں سے صدائیں اٹھ رہی ہیں کہ اللہ ینصرک یاغاندی (اے گاندھی' خدا تجھے فتح مند کرے) یہ فی الحقیقت آزاد قوموں کی سی عزت ہے' جو محکوم ہندوستان نے حاصل کر لی ہے اور یہ بلاشبہ اسی تحریک خلافت کا نتیجہ ہے۔

پھر ان دونوں نتائج سے بھی بڑھ کر جو چیز ہمارے سامنے آتی ہے' وہ ہندوستان کا

وہ حریت طلبانہ ذہنی ارتقاء ہے' جو اس جدوجہد کے ذریعہ اس نے حاصل کرلیا۔ کسی قوم کے آزاد ہونے کے لیے پہلی چیز یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو آزادی کا پورا قدر شناس ثابت کردے۔ جس وقت ہندوستان نے یہ مطالبہ کیا کہ ترکی اور عرب آزادی سے محروم نہیں رہ سکتا' اس نے اپنی قدر شناسی کا ثبوت مہیا کردیا۔ محکوم قوموں کی نہ تو کوئی خواہش ہوتی ہے' نہ مرضی۔ اگر ہندوستان کی ترکی کے لیے کوئی مرضی ہے جس کے حصول کے لیے وہ جدوجہد کرسکتا ہے' تو پھر وہ اپنی آزادی کے کام سے بھی فارغ ہوگیا' کیونکہ آزادی کا حصول دراصل قوم کی مرضی کے نشوونما ہی کا نام ہے۔

حضرات!

میں آپ سے یہ کہنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ گزشتہ چار سال کے اندر مطالبات خلافت کے لیے میں نے جو سعی کی' اس کی نسبت میرا ذاتی احساس ہمیشہ یہ رہا ہے کہ نہ صرف بحیثیت مسلمان ہونے کے' بلکہ بحیثیت ہندوستانی ہونے کے' یہ میرا قومی فرض ہے۔ میں یقین رکھتا ہوں کہ ہندوستان کی تحریک خلافت ہندوستان کی بڑی سے بڑی خدمت تھی' جو تاریخ ہند کی اس عظیم شخصیت یعنی مہاتما گاندھی نے انجام دی ہے۔

وقت کی مشکلات

حضرات!

میں نے آغاز تقریر میں آپ سے وقت کی مشکلات کا ذکر کیا تھا۔ ہر جماعتی جدوجہد کی کامیابی کے لیے اتحاد عمل شرط ہے اور تفرقہ خطرہ۔ اس وقت ہم میں شرط کمزور ہوگئی ہے اور اس لیے ہمیں خطرہ پیش آگیا ہے۔ لیکن میں سب سے پہلے آپ کو توجہ دلاؤں گا کہ ان مشکلات کی نوعیت اور مقدار کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کرلیجئے۔ اگر اس میں ذرا بھی کمی بیشی ہوئی' تو عجب نہیں' ہم ایک دوسرے خطرہ سے دوچار ہو جائیں۔ آج ہم ایک ایسے وسط میں کھڑے ہیں جس کی ایک انتہاء غفلت ہے اور دوسری مایوسی۔ اگر ہم نے مشکلات کو اصلیت سے زیادہ سمجھا' تو یہ غفلت کی طرف اقدام ہوگا۔ اور

اگر کم کرکے دیکھا' تو اس میں مایوسی کی طرف بڑھ جانے کا اندیشہ ہے۔ ہمیں نہ تو غافل ہونا چاہیے' نہ خائف' ہم کو مقابلہ کرنا چاہیے اور غالب آنا چاہیے۔ لیکن یہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ ہم مشکلات کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کرلیں۔ راہ میں ہتھیار سے پہلے ترازو کی ضرورت ہے۔

قوانین اجتماع کی وحدت

ہمیں چاہیے کہ اس موقع پر دنیا کی اجتماعی زندگی کے وہ قدرتی قوانین یاد کرلیں' جو اگرچہ ہماری معلومات میں موجود ہیں' لیکن بسااوقات جذبات کا غلبہ دماغ کی معلوم کی ہوئی حقیقتوں کو نظرانداز کر دیتا ہے۔

ہم حرکت اور زندگی کے اس حیرت انگیز کرہ کی ایک ویسی ہی مخلوق ہیں' جیسی ان گنت اور نامعلوم مخلوقات اس یکساں گردش کے ساتھ ظہور میں آتی رہی ہیں' اور آج بھی اس کی آغوش میں پھیلی ہوئی ہیں۔ وہ خود بھی اس کائنات ہستی کا ایک چھوٹا سا جزو ہے' جس کی نسبت ہم نہیں جانتے کہ کتنا ہے اور کہاں تک ہے۔ لیکن ہم نے جان لیا ہے کہ وہ اپنی ساری باتوں میں کامل طور پر یکساں ہے اور اگرچہ اس میں زندگی اور حرکت کے بے شمار مظاہر ہیں' لیکن ان سب کے لیے ان کے خالق کی مرضی کی طرح قانون حیات بھی ایک ہی ہے۔ اس لیے اس میں نہ تو کوئی نئی بات ہوتی ہے' نہ اس کی کوئی ایک چیز دوسری چیز سے الگ اور مختلف ہے۔ جو کچھ ایک مرتبہ ہو چکا ہے' وہی ہمیشہ ہوتا ہے اور جو ایک کے لیے ہوا ہے' وہی سب کو پیش آتا ہے۔ وہ یکساں ہے' ہمہ گیر ہے' باہم مشابہ ہے اور اٹل ہے۔ ایران کے فلسفی شاعر عمرخیام (7) کے لفظوں میں "اس کی زندگی کی کہانی ایک ہی ہے جو ہمیشہ نئے نئے ناموں اور نئی نئی شکلوں میں دہرائی جارہی ہے۔" اور فرانس کے مشہور شاعر وکٹر ہیوگو (8) کے زیادہ مختصر لفظوں میں "حوادث عالم کی داستان اگرچہ مسلسل ہے مگر محض تکرار ہے۔"

حوادث عالم کی اس کامل یکسانیت اور قوانین حیات کی اس غیرمبدل یگانگت کی جلوہ طرازی پر جس طرح شاعر کے وجدان نے وجد کیا ہے' اسی طرح مورخ کی نگاہوں

نے مطالعہ کیا ہے' اور فلسفی نے اس سے نتائج اخذ کیے ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ بحیثیت ایک سیاسی عامل کے اس کے لیے آنکھیں کھول دیں۔ یہ یکسانیت کا قانون جس طرح افراد اور اجسام کے لیے ہے' ٹھیک ٹھیک اسی طرح اور عصروں کے لیے بھی ہے جس طرح افراد کا جسم ہے' دماغ ہے اور وہ تمام قوئی اور خواص ہیں جو جسم و دماغ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسی طرح جماعتوں اور عصروں کا بھی جسم ہے' دماغ ہے' نفسیاتی (سائیکولوجیکل) کیفیات ہیں' جو ان کے ترکیبی مزاج سے پیدا ہوتی ہیں۔ اور ضرور ہے کہ ایک طرح کی طبیعت اور ایک طرح کے گردوپیش میں ایک ہی طرح کے حالات ہمیشہ پیش آئیں اور ایک ہی طرح کے نتائج پیدا ہوں' جس طرح افراد کے اعمال و نتائج کا تعلق ان کی شخصیت سے نہیں ہے' بلکہ ان کی دماغی و جسمانی حالات سے ہے۔ ایک طرح کی دماغی و جسمانی حالات میں ہر فرد سے ایک ہی طرح کے افعال کا صدور ہوگا' اسی طرح جماعتوں کے اعمال و احوال میں بھی جماعت کا تشخص و تعین بالکل غیرموثر ہے۔ حالات و نتائج ایک خاص طرح کی طبیعت اور گردوپیش سے تعلق رکھتے ہیں۔ جب کبھی کسی جماعت کی ویسی طبیعت ہوگی اور ویسا ہی گردوپیش' پیش آئے گا' ضرور ہے کہ وہ ظہور میں آئیں۔ قوموں کا آغاز و انجام' عروج و زوال' غفلت و بیداری' آزادی و محکومیت' فتح مندی و ناکامی سب پر یہی قانون نافذ ہے اور جو کچھ ایک قوم پر گزرا ہے اور جسکے لیے ہوا ہے بعینہ وہی ہر قوم پر گزرتا اور ہر قوم کو پیش آتا ہے۔ جماعتی زندگی کا یہی حیرت انگیز توافق ہے' جس کو تیرہویں صدی عیسوی کے ایک فلسفی مورخ عبدالرحمٰن ابن خلدون (9) نے (جس نے سب پہلے فلسفہ تاریخ کے مبادیات و اصول مدون کیے ہیں) ان لفظوں میں تعبیر کیا ہے: اگر ہم زمانوں اور ناموں کی قید نکال دیں' تو ایک قوم اور ایک زمانہ کی تاریخ بجسہ ہر قوم اور ہر زمانہ کے لیے کام دے سکتی ہے کیونکہ ناموں اور صورتوں کے تغیر کے سوا اقوام کے حالات میں اور کوئی تغیر نہیں ہوتا۔ اس حقیقت کو موجودہ زمانہ کے مشہور فرنچ مصنف ڈاکٹر گستاولی بان (10) نے زیادہ جامع اور علمی پیرایہ میں بیان کیا ہے: جب ہم جماعتی زندگی کی سائیکولوجی (11) اسی طرح مدون کرلیں گے' جس طرح ہم نے انفرادی زندگی کرلی ہے' تو پھر ہمارے لیے

ممکن ہو جائے گا کہ ہم ایک قوم اور تمدن کی تاریخ لکھ کر اسے ہر قوم اور تمدن کے لیے استعمال کر سکیں۔ ہزار سالہ تقویم کی طرح وہ ہمیں ہر سال یکساں طور پر کام دے سکے گی۔

قومی جدوجہد کا سفر اور اس کی منزلیں

حضرات!

آج ہمارے لیے بہت ضروری ہے کہ قومی زندگی کے اس قانون کے قطعی اور اٹل احکام سے غافل نہ ہوں۔ صرف یہی بات ہمارے تمام بے جا عجبوں اور بے جا اندیشوں کو دور کر سکتی ہے۔ ہمیں آگاہ رہنا چاہیے کہ آج جو کچھ پیش آ رہا ہے' وہ نہ تو نیا ہے نہ معمول کے خلاف' بلکہ قومی جدوجہد کے اس مرحلہ کی جس سے ہندوستان گزر رہا ہے' ایک بالکل قدیم' معمولی اور ناگزیر حالت ہے۔ دراصل ہم وہ کر رہے ہیں' جو ہمیشہ گزر چکا ہے اور وہ دیکھ رہے ہیں' جو ہم سے پہلے دیکھا جا چکا ہے۔ ہم کچھ نہیں ہیں' مگر تاریخ اقوام کا ایک صفحہ ہیں' جو اس قانون اجتماع کی یکسانیت کی بیشمار نظیروں پر ایک نئی نظیر کا اضافہ کرتا ہے۔

دنیا میں ہمیشہ یہ ہوا ہے کہ قومیں غفلت کے بعد بیدار ہوئی ہیں اور جب ان کی دماغی اور فکری حالت کا انقلاب پورا ہو چکا ہے تو ان کی خارجی حالت پر بھی یکے بعد دیگرے تغیرات طاری ہوئے ہیں۔ اگر میں ایک قدیم جرمن حکیم ہرمن (12) کا استعارہ مستعار لوں' تو کہہ سکتا ہوں کہ قومیت کی روح ہمیشہ افراد کی غفلت میں سوتی ہے' ذہن و دماغ کے تغیرات میں خواب دیکھتی ہے' جذبات کے ہیجان میں کروٹ بدلتی ہے' اور بالآخر جدوجہد کے میدان میں اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ پھر یہ جدوجہد بھی ایک ایسا سفر ہے' جس کی بندھی ہوئی منزلیں ہیں' اور ٹھہرائے ہوئے رسم و راہ ہیں' جو ضرور ہے کہ ہر قوم کو پیش آئیں اور ضرور ہے کہ ہر کامیاب قافلہ ان میں سے گزرے۔ جس طرح اس کی کامیابیاں عظیم ہیں' اسی طرح اس کی رکاوٹیں بھی بیشمار ہیں اور جس طرح اس کی فتح مندی اٹل ہے' اسی طرح اس کی مشکلات بھی ناگزیر ہیں۔

اس کی مشکلات داخلی بھی ہیں اور خارجی بھی۔ اس میں دماغ کے لیے بھی آزمائشیں ہیں اور جسم کے لیے بھی۔ اس میں اندر کے طوفان بھی اٹھتے ہیں اور باہر کے سیلاب بھی بہتے ہیں۔ اس میں جا بجا ٹھوکریں بھی ہیں اور قدم قدم پر لغزشیں بھی۔ اس کا سفر کبھی یکساں رفتار میں جاری نہیں رہ سکتا۔ وہ ہمیشہ رک رک کر چلتا ہے اور تھم تھم کر بڑھتا ہے۔ اس میں گر گر کر اٹھنا پڑتا ہے اور ٹھوکر کھا کھا کر دوڑنا پڑتا ہے۔ اس کی کامیابیاں مسلسل نہیں ہیں' مگر ضروری ہیں۔ اس کی فتح مندی قدم قدم پر نہیں ہے' مگر آخر میں ہے اور اٹل اور یقینی ہے۔

حضرات!

خدا کا یہ قانون حیات ہماری تن آسانیوں کی خاطر معطل نہیں ہو سکتا۔ ہم چلے ہیں' تو ہمارے لیے بھی اس کی تمام منزلیں چشم براہ ہیں' اور ناگزیر ہے کہ ہم ان سب میں سے گزریں۔ اگر ہماری تیزرفتاری رک گئی' تو ہمیشہ رکا کرتی ہے' ہمیں تیزی سے پھر روانہ ہو جانا چاہیے۔ اگر ہماری حرکت میں ایک دفعہ وقفہ سا پڑ گیا تو پڑا ہی کرتا ہے' ہمیں ازسرنو کوچ کر دینا چاہیے۔ اگر ہم ایک خاص مسئلہ میں متفق نہ ہو سکے' یا ہمارے اتحاد کے رشتہ میں ایک گرہ پڑ گئی' تو کوئی مضائقہ نہیں' ہم کیوں نہ متفق ہو جائیں۔ بلاشبہ یہ ایک آزمائش ہے' جو سب کی طرح ہمیں بھی پیش آگئی ہے اور اس پر اسی طرح غالب آنا چاہیے' جس طرح باہمت قومیں غالب آتی ہیں' لیکن اس سے زیادہ نہ اس میں کوئی ہراس ہے نہ مایوسی۔ یہ کوئی نرالی بجلی نہیں ہے جو ہمیں پر گری ہو' یہ تو اس راہ کا ایک معمولی حادثہ ہے' جو ہماری طرح نہیں معلوم کتنوں کو پیش آچکا ہے' اور ہمارے بعد کتنوں کو پیش آئے گا۔

ایک آزمائشی منزل

آیئے! ایک لمحہ کے لیے ٹھہر کر دیکھ لیں کہ آج جو مشکلات پیش آئی ہیں' جماعتی اعمال کی نفسیات میں ان کی حقیقت کیا ہے؟ یہ کہنا ضروری نہیں کہ فرد کی طرح قوم کے اعمال کا اصلی سرچشمہ بھی دماغ ہے۔ قوم کے افراد کا دماغی نشوونما جب اس حد

تک پہنچ جاتا ہے کہ وہ خارج میں بھی اپنا اثبات کرے' تو وہ مناسب حالات کا انتظار کرتا ہے۔ مناسب حالات میں اسے سب سے زیادہ ضرورت کسی ایسے قومی موثر کی ہوتی ہے' جو فکر و رائے کے تمام انتشار و اختلاف پر غالب آکر قوم کے بکھرے ہوئے عناصر کے لیے ایک نقطہ اجتماع پیدا کر دے۔ افراد کے دماغ جا جماعت کے ترکیبی دماغ میں منقلب ہو جاتے ہیں' تو ان میں عقل و ادراک سے زیادہ جذبات کا عنصر کام کرتا ہے۔ پس یہ مرکز بھی جذبات سے پیدا ہوتا ہے' نہ کہ ادراک سے۔ جب ایسی حالت مہیا ہو جاتی ہے' تو عملی جدوجہد ظہور میں آتی ہے اور بقدر اپنی قوت کے ابھرتی اور مخالف قوتوں سے ٹکراتی ہے۔ پھر یا تو کسی معین حد تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتی ہے' یا راستہ کے قدرتی قوانین کے ماتحت اسے رک رک کر جانا پڑتا ہے۔ اس رکاوٹ کی بھی مختلف حالتیں ہیں اور مختلف احکام ہیں۔ لیکن ہر حال میں یہ ضروری ہے کہ کسی نہ کسی حد تک ردعمل (ری ایکشن) کا قانون اپنا اثر دکھلائے۔ اس وقت اچانک ایک افسردگی اور اضمحلال کے آثار طار ہونے لگتے ہیں۔ سب سے زیادہ اس کا اثر خیالات کی جمعیت پر پڑتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا ایک ایندھن میں بیشمار بکھرے ہوئے اوراق بندھے ہوئے تھے' یا تو اس کی گرہ ڈھیلی پڑ گئی ہے یا کھل گئی ہے۔ اب اختلافات شروع ہوتے ہیں' انتشار کی ہوائیں چلنے لگتی ہیں' اور قومی جدوجہد کو ایک سخت آزمائش پیش آجاتی ہے۔ چونکہ جماعت کے تمام حالات کی طرح یہ حالت بھی طبعی ہے۔ اس لیے علم و ادراک اس میں بہت کم تبدیلی پیدا کر سکتا ہے۔ افراد کتنے ہی ہوشمند اور دنیا کے پچھلے تجربوں سے باخبر ہوں' لیکن اپنے جذبات کو ان حالات و نتائج سے نہیں روک سکتے' تاہم اگر جدوجہد کا دماغ اور پھیپھڑا محفوظ ہو' تو یہ جو کچھ ہوتا ہے' جسم کے عوارض ہوتے ہیں۔ جدوجہد کی زندگی کے لیے ان میں کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔ یہ اکثر حالتوں میں ایک عارضی وقفہ ہوتا ہے۔ بعض حالتوں میں ایک مشکل عقدہ' اور کبھی کبھی ایک خطرناک التواء کی بھی صورت اختیار کر لیتا ہے' لیکن جونہی وہ مدت ختم ہوتی ہے جو اس نشہ کے خمار کے لیے ضروری تھی۔ معاً افسردگی کا یہ وقتی حجاب دور ہو جاتا ہے اور جدوجہد پھر اپنی اصلی سرگرمی کے ساتھ رونما ہو جاتی ہے' بلکہ

اکثر حالتوں میں پہلے سے زیادہ مضبوط اور دیرپا ہوتی ہے کیونکہ یہ وقتی وقفہ محض سطح کا تھا' گہرائیوں کی قوتیں برابر کام کر رہی تھیں۔ اب دوسرے ظہور میں تازہ قوت کے ساتھ پچھلی قوتوں کی مقدار بھی موجود ہوتی ہے۔

دنیا کے تمام تغیرات و حوادث کی طرح جماعتوں کے اعمال بھی یا ختم ہو جاتے ہیں' یا جاری رہتے ہیں' بار بار پیدا نہیں ہوتے۔ البتہ اتار چڑھاؤ رہتا ہے۔ ہم غلطی سے اتار کو خاتمہ اور چڑھاؤ کو پیدائش سے تعبیر کرنے لگتے ہیں۔ کسی قومی جدوجہد کے وقفہ کو خاتمہ سمجھ لینا ایسی غلطی ہوگی جیسے سمندر کا اتار دیکھ کر سمجھ لیں کہ وہ پھر کل نہیں چڑھے گا۔

ہماری اس قومی جدوجہد کو بھی ایک حرکت کے بعد ایک وقفہ پیش آگیا ہے۔ جدوجہد پوری تیزی کے ساتھ دوڑی جارہی تھی یکایک باردولی (13) کے فیصلہ نے اشارہ کیا کہ تھم جاؤ۔ وہ اچانک تھم گئی۔ لیکن یہ قدرتی بات تھی کہ اس نے صدمہ محسوس کیا اور اسے وہ تمام نتائج پیدا ہوئے' جو ایسے وقفہ کا قدرتی مقتضا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہماری جمعیت جنبش میں آگئی ہے۔ ایسا دکھائی دیتا ہے' گویا ایک بندھی اور لپٹی ہوئی چیز تیزی کے ساتھ کھلتی اور بکھرتی جارہی ہے۔ جدوجہد کا عام سکون' کانگرس کا اختلاف' ہندو مسلم اتحاد میں فتور' اتحاد کی کوششوں کی درماندگیاں' یہ سب اسی حالت کے برگ و بار ہیں۔

حضرات!

یقیناً یہ ایک آزمائش ہے جس پر ہمیں فتح مند ارادوں کے ساتھ غالب آنا پڑے گا اور عجب نہیں کہ بڑی کشمکش کرنی پڑے۔ تاہم امید کروں گا کہ آپ اس سے زیادہ کوئی اثر اپنے دل و دماغ کے لیے قبول نہ کریں گے۔ ایک ایسے شخص کے لیے جو اقوام کی نفسیات اور تاریخ کا شناسا ہو' یہ حالت بالکل ایک ایسی معمولی بات ہے جیسے اک آدمی کا دوڑتے دوڑتے رک جانا کہ دم لے کر پھر دوڑے۔

ہمیں اس کی بالکل پروا نہیں کرنی چاہیے کہ ہمارے مخالفین اور نکتہ چیں ہماری اس حالت سے دھوکا کھانا پسند کرتے ہیں۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ وہ ایک ایسی حالت

میں ہیں جس میں طاقت کا صرف اسی وقت اقرار کیا جاتا ہے، جب وہ بالکل سامنے آئے، لیکن خود ہم کو نہیں چاہیے کہ اپنی حقیقت حال کی نسبت کسی قسم کا شبہ قبول کریں۔ کیا ہے، جو ہم نے کھو دیا ہے؟ ہماری جدوجہد کے تمام دماغی قویٰ پوری طرح مضبوط ہیں۔ اس کی جڑوں میں اب تک کوئی جنبش نہیں آئی۔ ہم اس کے قدموں کی سستی محسوس نہیں کرتے؟ کیا ہم کو خود اپنے محسوسات میں بھی شبہ ہو سکتا ہے۔ کیا ہم محسوس نہیں کر رہے ہیں کہ وہ ایک عقیدہ کی طرح ہمارے دلوں میں ہے، ایک مقصد کی طرح ہماری نگاہوں میں ہے، اور روح کی طرح ہمارے جسم کی ایک ایک رگ میں دوڑ رہی ہے۔

حضرات!

مجھے اجازت دیجئے کہ میں آج آپ سب کی جانب سے ایک ایسا اعلان کروں، جو فی الحقیقت آپ کے یقین و احساس کی ترجمانی ہے۔ میں پورے اطمینان کے ساتھ اعلان کرتا ہوں کہ ہماری جدوجہد قائم ہے، بدستور جاری ہے، اور ہم ایک ایسے وقفہ کی حالت میں ہیں جس نے فیصلہ کن معرکہ میں التوا ڈال دی ہے، مگر جنگ کے لیے التوا نہیں۔ ہمارے لیے ہشیاری، سرگرمی اور کوشش کے مسائل پیدا ہو گئے ہیں۔ مگر ہم ان سے قطعی انکار کرتے ہیں کہ التوا یا ناامیدی کا کوئی سوال درپیش ہے۔ لیکن جب میں نے آپ کو اس طرف توجہ دلائی کہ مایوسی کی کوئی وجہ نہیں، تو مجھے یہ بھی عرض کرنے دیجئے کہ غفلت کے لیے بھی کوئی وجہ نہیں ہے، ہمیں اپنی روزانہ زندگی کی یہ حقیقت فراموش نہیں چاہیے کہ بیماری کتنی ہی بے حقیقت ہو، لیکن غفلت اور بدپرہیزی سے فوراً مہلک بنا دی جا سکتی ہے۔ آج جو آزمائش ہمیں پیش آئی ہے، فی الواقع یہ ایک عارضی وقفہ ہے، بشرطیکہ ہم اس کو زیادہ بڑھنے نہ دیں۔ ہم ایسا کیونکر کر سکتے ہیں؟ وقت کی مشکلات کا علاج کیا ہے؟ اس سب کا جواب ہم سب کو معلوم ہے، لیکن اس پر عمل دشوار ہو رہا ہے۔ ہم کو صرف اتحاد کی ضرورت ہے اور ہم اسی کی ڈھونڈ میں آج یہاں اکٹھے ہوئے ہیں۔

حضرات!

آج کا یادگار دن اسی لیے آیا ہے کہ ہمیں اس آزمائش سے کامیاب گزر جانے کی نہایت قیمتی مہلت دے۔ ہم نے آج تمام دنیا کی نگاہوں کو دعوت دی ہے کہ وہ ہماری آزمائش کے نتیجہ کا تماشا کریں۔ کیا ہم اس کی یادگاروں کا بہترین استعمال کریں گے؟ اس کا جواب ہمیں چند گھنٹوں کے اندر دینا ہے۔

لاتعاون سلمی

حضرات!

میرے لیے ناگزیر ہے کہ میں اپنی گزارش کسی ابتدائی سرحد سے شروع کروں۔ ہم نے حصول مقصد کے لیے' عام تشدد اور ترک تعاون کا اصول اختیار کیا ہے۔

نون کوآپریشن (14) کی بنیاد دراصل دنیا کے اس سادہ' مگر عالمگیر اعتقاد پر ہے کہ ہمیں برائی کا ساتھ نہیں دینا چاہیے' اور اسے اکیلا چھوڑ دینا چاہیے تاکہ وہ پھول پھل نہ سکے۔ دنیا کے تمام مذہبوں اور اخلاقی تعلیمات کی یہ ایک مشترک سچائی ہے۔ اگر اس اصولی تعریف میں برائی کا لفظ نقصان سے بدل دیا جائے (اور میرے خیال میں دونوں کو مترادف ہی ہونا چاہیے)' تو پھر یہ نوع انسانی کا نہ صرف عالمگیر اعتقاد بلکہ حیوانی فطرت کا ایک قدرتی رجحان ہو جاتا ہے۔ اور یہاں بھی مذاہب کی صدائیں ہمارے کانوں میں پہنچتی ہیں۔ اسلام نے اپنے پیرووں کو "ترک موالات" کا حکم دیا ہے' جس کا منشا یہی ہے کہ جن لوگوں کے کاموں میں تمہارے لیے قومی نقصان ہے' تم کسی طرح ان کی مدد اور مضبوطی کا ذریعہ نہ بنو۔ دوسرے مذہبوں میں بھی ایسی ہی تلقین موجود ہے۔ قوموں کی سیاسی جدوجہد کے میدان میں دیکھا جائے' جب بھی یہ نہ صرف ایک متفقہ اعتقاد ہے' بلکہ متفقہ عمل ہے' یہ بالکل ظاہر ہے کہ دنیا میں کوئی قوم اور جماعت اپنے آزادانہ حقوق کو آپریشن (15) کے ذریعہ حاصل نہیں کر سکی ہے۔ ہر قوم نے اپنے حقوق جدوجہد کرکے حاصل کیے ہیں اور جدوجہد مقابلہ اور کش مکش ہے' کواپریشن نہیں ہے۔

مقاطعہ اور مقاومت سلبی یا سول ڈس اوبیڈ ئنیس (16) بھی جو اس کے سب سے

زیادہ قوی ہتھیار ہیں کوئی نئی تعلیم نہیں ہے۔ کمزور افراد اور جماعتیں جب کبھی مسلح مقابلہ سے مجبور ہوئی ہیں' تو انہوں نے اسی طریقہ کو اپنے مقاصد کی حفاظت کا تنہا ذریعہ پایا ہے۔ مذہب' اخلاق اور قومیت کی یہ متفقہ آواز دنیا کی بہت پرانی چیز ہے کہ معیبت برداشت کرلو' مگر حق سے منہ نہ موڑو۔ کہا جا سکتا ہے کہ ہر مذہب اور تعلیم کی ابتدائی کمزوری اور بے بسی میں صرف یہی اصول ثبات و قرار کا ذریعہ ہوا ہے۔ ہم اس کا عکس سقراط (17) کے جام زہر میں دیکھتے ہیں۔ یروشلم کی صلیب (18) پر نقش پاتے ہیں اور مکہ کی گلیوں (19) میں بھی اس کا غلغلہ سنائی دے چکا ہے۔ مسیحی مذہب کی ابتدائی دو صدیاں تمامتر اسی کا افسانہ ہیں۔ روم کے قیصر سیویرس (20) کے زمانہ میں جب کہ مسیحی چرچ کی ابتدائی بنیادیں ظلم و ستم کے طوفان سے ہل رہی تھیں' یہی اصول تھا جس کی غیر مسخر قوت اسے تھامے رہی۔ اسی عہد کے ایک مسیحی خدا کا ترتولین (21) کی ایک تحریر آج تک محفوظ ہے' جو اس نے رومی عدالتوں کے سامنے بطور اپنے تحریری بیان کے پیش کی تھی۔ اس کے یہ الفاظ امریکن مصنف ڈریپر کی کانفلکٹ بٹوین ریلیجن اینڈ سائنس (22) میں پڑھ سکتے ہیں :

> اگرچہ ہماری جماعت کو بنے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا لیکن وہ کونسی جگہ ہے' جہاں ہم موجود نہیں۔ شہر' جزیرے' صوبے' قلعے' فوجی بارکیں' دربار کے محلات' سینٹ کے اجلاس' غرضکہ ہر اس مقام پر جو تمہارے اقتدار کی علامتیں ہیں' ہم لوگ برابر پائے جاتے ہیں۔ بجز تمہاری عبادت گاہوں کے' ہم نے تمہارے قبضہ میں کوئی جگہ نہیں چھوڑی ہے۔ غور کرو' اگر ہم چاہیں تو جنگ کا کیسا طوفان بپا ہو جائے' لیکن ہمارا مذہب ہم کو سکھاتا ہے کہ مارنے سے مارا جانا بہتر ہے۔ اس لیے ہم جھیلتے ہیں' مگر مقابلہ نہیں کرتے۔

اس سے زیادہ مکمل اور موثر اسپرٹ مقاومت سلبی کی کیا ہو سکتی ہے؟ ہم چاہیں تو سترہ سو برس کے ان پرانے لفظوں کو بعینہ آج بھی استعمال کر سکتے ہیں۔

کاؤنٹ لیو ٹالسٹائی

البتہ یہ بات کہ سیاسی حقوق کے حصول اور نامنصفانہ حکومت کے نظاموں کو شکست دینے کے لیے اسے بطور ایک دستورالعمل کے اختیار کیا جائے' اور مسلح انقلاب کی جگہ صرف اسی پر قناعت کرلی جائے' ایک ایسا خیال ہے جو غالباً موجودہ زمانہ میں سب سے پہلے روس کے سچے مسیحی معلم کاؤنٹ ٹالسٹائی (23) نے اپنی شہرۂ آفاق تعلیمات میں ظاہر کیا ہے۔ اور اس قابل تعظیم کا دماغ دراصل مغربی تمدن کی بے روح مادیت' نظام ہائے معاشرت کی بے حد ناہمواری سرمایہ داری (کیپسل ازم) کی بے روک' بے اعتدالی اور روس کے ارتھوڈکس چرچ کے مذہبی استبداد اور جمود کے برخلاف ایک انتہائی پروٹسٹ (24) تھا۔ اور اسی انتہائیت کا اثر ہے کہ اس کے انقلابی نظریات کی نسبت ہمیں امریکہ کے گزشتہ پریذیڈنٹ روز ویلٹ (25) کے نکتہ چین لفظوں میں (جو اس نے ایک مرتبہ امریکن اوٹ لک میں لکھے تھے) ماننا پڑتا ہے کہ "وہ بلا کسی جھجک کے عملیت اور اعتدال کی سرحد عبور کرگئی ہیں۔" تاہم اس کی تمام تعلیمات میں یہ تعلیم ایک ایسی معتدل تعلیم ہے جس کی سادہ عملیت بالکل آشکارا ہے اور وہ بلاشبہ دنیا کو اس کی سب سے بڑی جستجو کا نہایت صاف اور آسان سراغ بتلا دیتی ہے۔ ٹالسٹائی کی تعلیم کی اصلی روح یہ تھی کہ قتل انسانی اور جنگ کا خاتمہ ہونا چاہیے۔ جو قوتیں انصاف اور انسانی حقوق کی راہ میں حائل ہیں۔ ان کا نہ تو اسلحہ سے مقابلہ کرنا چاہیے اور نہ اس کی ضرورت ہے۔ ان کی طاقت ان کے کارخانوں سے ہے' جو انہوں نے ہر طرف پھیلا رکھے ہیں۔ اگر لوگ اپنی شرکت اور اعانت سے ان کے پھولنے پھلنے کا باعث نہ ہوں' تو وہ ایک منٹ کے لیے بھی ٹک نہیں سکتے۔

ٹالسٹائی نے یہ دعوت بیشمار تحریروں میں دی ہے۔ اس کے مضامین کا مجموعہ "سوشل ایول" کے نام سے مرتب ہوا ہے اس میں جابجا اس کی صدائیں موجود ہیں۔ 1900ء میں جب انارکسٹوں نے ہمبرٹ (26) شاہ اٹلی کو قتل کیا' تو اس نے ایک پیام تمام ان جماعتوں اور قوموں کے نام شائع کیا' جو حقوق اور انصاف کے لیے انقلاب

چاہتے ہیں۔ اس میں وہ لکھتا ہے کہ ظلم اور استبداد کا یہ علاج نہیں ہے کہ انسانوں کو قتل کیا جائے۔ یہ تو ایک مرض دور کرنے کے لیے دوسرا مرض لگا لینا ہے۔ حقیقی علاج صرف یہ ہے کہ سوسائٹی کے اس نظام کی تائید ترک کر دی جائے' جس سے تمام ناانصافیاں پیدا ہوتی ہیں۔

یہ طریقہ عمل بالکل صاف اور سہل ہے مگر اس پر عمل کیوں نہیں ہوتا! وہ خاتمہ میں خود جواب دیتا ہے' اس لیے کہ حکومتوں نے اپنے قیام و دوام کے لیے نہایت ہوشیاری سے پبلک کو مسحور بنا رکھا ہے۔ وہ اس طرح سوئی ہوئی ہے کہ نہ کچھ دیکھتی ہے نہ سمجھتی ہے۔ پس اب ہمارا کام یہ نہ ہونا چاہیے کہ حکومتوں کا استبداد دور کرنے کے لیے قتل و خونریزی سے کام لیں' بلکہ چاہیے کہ اس جادو کو توڑ دیں اور لوگوں کو ان کی طلسمی نیند سے بیدار کر دیں۔

مہاتما گاندھی

دنیا کو ہمیشہ تعلیم سے زیادہ عملی رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ حقیقت اور سچائی کی کوئی بات بھی اس کے لیے نئی نہیں ہے لیکن جو بات نئی عظمت اور کامیابی بخشتی ہے' وہ سچائی کا یقین اور عمل ہے۔ یہ بات کہ آزادی کے لیے لڑنا ہمارا فرض ہے' ہر آدمی کو معلوم ہے' لیکن یہ بات کہ آزادی کے لیے لڑنا چاہیے۔ واشنگٹن (27) جیسے چند آدمیوں ہی کو معلوم تھا۔

پس اگرچہ ٹالسٹائی نے دنیا کو اس اصول کی طرف بلایا' لیکن اس کے قدم ایک دوسری ہی شخصیت کے انتظار میں رکے ہوئے تھے۔ ایک ایسی عظیم شخصیت جس کو قدرت نے خاص اس کام کے لیے چن لیا ہو۔ یہ شخصیت مہاتما گاندھی کے وجود میں نمایاں ہوگئی۔ ٹالسٹائی سے پہلے بھی دنیا کو نون کوآپریشن کی سچائی معلوم تھی۔ لیکن مہاتما گاندھی سے پہلے اس کی عملی طاقت کا راز اسے معلوم نہ تھا۔

نون کوآپریشن کا پروگرام

ہندوستان نے مہاتما گاندھی کی رہنمائی میں نون کوآپریشن کا جو طریقہ اختیار کیا۔

اس کے مبادیات اگرچہ وہی ہیں جو اوپر بیان کیے گئے' تاہم بہت سی باتوں میں اس سے مختلف بھی ہوگیا ہے۔ پہلے وہ ایک اخلاقی وعظ تھا' اب وہ ایک سیاسی پروگرام ہے۔ ٹالسٹائی کی دعوت میں عقائد اور اصول کی ایسی انتہائی وسعتیں موجود تھیں' جو ایک طرف لوگوں کے موجودہ افکار و عقائد اور بہت سے نظام ہائے عمل سے ٹکراتی تھیں۔ دوسری طرف' ان کی عملی دشواریوں پر بھی غالب آنا بہت مشکل تھا۔ لیکن موجودہ شکل نے پوری طرح دامن سمیٹ لیے ہیں۔ اب اس میں کوئی بات ایسی نہیں ہے' جو کسی جماعت کے مذہبی یا سیاسی عقیدہ کو تبدیل کرنا چاہتی ہو۔ یا ایسی دشواری رکھتی ہو جس کو ایک محدود وقت کے اندر قابو میں نہیں لایا جا سکتا۔ عدم تشدد اس کی اصلی روح ہے' لیکن یہ اس امر پر قانع ہے کہ اگر اسے بطور اعتقاد کے تسلیم نہیں کیا جا سکتا' تو بطور ایک مضبوط پالیسی کے اختیار کرلیا جائے۔ ان تمام تعلقات کو ترک کر دینا جو ہندوستان کے دفتری اقتدار کے قیام کا باعث ہیں' بلاشبہ اسکا اصل اصول ہے' لیکن اس کا دائرہ نفاذ بھی اس نے بہت محدود کر دیا ہے اور جس قدر بھی ہے' اسے اس طرح عمل میں لانا چاہتا ہے کہ اس کی سختیاں کم سے کم صورت میں باقی رہ جائیں۔ ایثار' ضبط نفس اور اخلاقی روح کی بلندی اس کی جنگ کے اصلی ہتھیار ہیں' تاہم وہ اس بارے میں بھی پوری رواداری برتتا ہے اور بجز ایک مرکزی اور ملک کے لیے نمونہ بننے والی جماعت کے اور کسی سے ایسا مطالبہ نہیں کرتا جس کا پورا کرنا ملک کی عام استعداد کے لیے بہت دشوار ہو۔ موجودہ شکل میں پورے وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ وہ تمام حقوق طلب جماعتوں کے لیے ایک ایسا سیاسی دستورالعمل بن گیا ہے' جو زیادہ سے زیادہ واضح' سادہ اور اس لیے عملی ہو سکتا ہے' اور دنیا کی قوتوں کی غیر مسلح فتح مندی کا یقین دلاتا ہے۔ ان میں نہ صرف اصول کی سچائی ہی ملحوظ ہے' بلکہ عمل کی بھی تمام دشواریوں پر نظر رکھی گئی ہے۔

ترتیب عمل

حضرات!

نون کوآپریشن کے پروگرام کی بعض دفعات کی نسبت ہم میں جو اختلاف پیدا ہوگیا

ہے' وہ اگرچہ فی الحقیقت صرف اس کے ایک جزوی طریق عمل سے تعلق رکھتا تھا' لیکن جب اس نے بحث و مباحثہ کی صورت اختیار کرلی' تو جیسا کہ قاعدہ ہے' طرح طرح کے نئے نئے سوالات پیدا ہوتے گئے۔ اب سب سے پہلے جو سوال ہمارے سامنے آتا ہے' وہ ہمارے موجودہ پروگرام کی نوعیت کا ہے۔ یہ پروگرام ایک مرتبہ عمل میں لایا گیا اور جس قدر نتائج اس وقت حاصل کرسکتا تھا' اس نے حاصل کیے۔ لیکن جنگ کسی فیصلہ کن نتیجہ تک نہ پہنچ سکی۔ اس کے تمام معرکے ابھی باقی ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ موجودہ حالت میں اس پروگرام کی نوعیت کیا ہے؟ کیا یہ ایک ایسا پروگرام تھا' جو صرف ایک ہی مرتبہ عمل میں لایا جا سکتا تھا۔ اگر یہ چل گیا تو چل گیا' نہیں تو پھر کسی دوسرے پروگرام کی جستجو کرنی چاہیے۔ یا یہ اخلاق اور مذہب کی دعوت کی طرح ایک دائمی اور غیر متغیر دعوت ہے' جسے کسی غیر معلوم وقت تک کے لیے ہمیں کہتے رہنا چاہیے اور ہمارا مقصد اس دن حاصل ہوگا' جس دن تمام ملک یا ملک کا غالب حصہ اس پر پورا پورا عمل کرلے گا' اگرچہ ایسا وقت کتنی ہی مدت کے بعد آئے۔

میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں سب سے پہلے اس سوال پر غور کرلینا چاہیے۔ میں سوال کے ان دونوں پہلوؤں کا جواب نفی میں دینا چاہتا ہوں۔ وہ نہ تو اس معنی میں محض ایک ہنگامی اور ایک ہی مرتبہ تجربہ میں آنے والا عمل تھا۔ جو سوال کے ایک پہلو میں نظر آتا ہے اور نہ اس معنی میں دائمی اور غیر تغیر پذیر' جس کا رجحان دوسرے پہلو میں پایا جاتا ہے۔ دونوں میں دو انتہائی پہلو اختیار کرلیے گئے ہیں اور اصلیت دونوں کے درمیان ہے۔ اس میں اعتقاد کا استحکام بھی ہے اور دستورالعمل کی تغیرپذیری بھی۔ وہ فرض اور ضرورت دونوں کو ملحوظ رکھتا ہے۔

لیکن اس کے صاف صاف فیصلے کے لیے ضروری ہے کہ ایک مرتبہ اس پروگرام کے طریق عمل کی ترتیب پر غور کرلیا جائے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس بارے میں اپنے وہ خیالات آپ کے سامنے رکھ دوں' جو نون کوآپریشن پروگرام کے اولین دن سے آج تک بلا تغیر میرے سامنے رہے ہیں۔ نون کوآپریشن کا پروگرام قبل اس کے کلکتہ کے

اسپیشل اجلاس میں منظور ہو کر پوری طرح مرتب ہو چکا تھا۔ سب سے پہلی مرتبہ جس کمیٹی نے اس پر غور کیا وہ اسی دہلی میں مارچ 1920ء میں منعقد ہوئی تھی۔ اس میں مہاتما گاندھی کے ہمراہ لالہ لاجپت رائے جی، حکیم اجمل خان صاحب اور میں غور و مشورہ میں شریک تھے۔ میں آپ سے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس تاریخ سے لے کر آج تک مجھ پر کوئی وقت ایسا نہیں گزرا ہے، جب مجھے اس کا خیال بھی ہوا ہو کہ یہ اس سوال کے دونوں انتہائی پہلوؤں میں سے کسی ایک پہلو کا نام ہے۔

پروگرام کی نوعیت

اس پروگرام کی بنیاد اصل یہ ہے کہ ہم ہندوستان کی موجودہ مسلح بیوروکریسی (28) کے مقابلہ میں غیر مسلح اور سلمی (نون وائیلنٹ) (29) جدوجہد کے ذریعہ ایسی فتح مندی حاصل کرسکتے ہیں کہ وہ ہندوستانی قوم کی مرضی کے آگے ہتھیار ڈال دینے پر مجبور ہو جائے۔ ہم نے "ہندوستان کی مرضی" کو خلافت، پنجاب اور سوراج سے تعبیر کیا ہے لیکن فی الحقیقت ہمارا معاملہ ان بہت سے لفظوں میں نہیں، بلکہ اسی ایک لفظ میں مضمر ہے۔ ہر ملک کی طرح ہندوستان کے لیے بھی آج جس سوال کا فیصلہ درپیش ہے، وہ صرف یہ ہے کہ کیا قوم کی مرضی کی نمائندہ اس ملک کے باشندوں کی آزاد حکومت ہوگی یا کوئی ایسی حکومت جو فوجی طاقت کے ذریعہ منوائی گئی ہو۔

یہ غیر مسلح جدوجہد کیونکر عمل میں لائی جائے؟ تو بلاشبہ اس سوال کے جواب میں وہ ہمیں ایک ایسی بات کی طرف بلاتا ہے جو محض ضرورت اور وقت کا مسئلہ ہی نہیں ہے، بلکہ ایک مستحکم اعتقاد بھی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہمیں موجودہ نظام حکومت کی شرکت عمل سے کنارہ کش ہو جانا چاہیے، اس لیے کہ ہمیں ایسے اقتدار کا ساتھ نہیں دینا چاہیے، اور اس لیے کہ ہم کنارہ کش ہو کر اسے اس طرح گرا دے سکتے ہیں کہ وہ ہمارے مقابلہ کے ناقابل ہو جائے۔ اس کا یہ مطالبہ فرض اور ضرورت دونوں پر مشتمل ہے۔ وہ مذہب، اخلاق، تجربہ، اور تاریخ سب کی متفقہ صداقت ہے۔ ہمیں اس ناانصافی کے لیے آلہ عمل نہیں بننا چاہیے، جو ہمارے ساتھ کی جا رہی ہے۔ اس اعتقاد سے

کس انسان کو انکار ہو سکتا ہے! تجربہ اور تاریخ کی قطعی شہادت ہے کہ دنیا میں کسی قوم نے کسی اجنبی اقتدار سے کواپریشن کرکے اپنی آزادی حاصل نہیں کی ہے اور نہ کسی کو یہ متاع بطور عطیہ کے ملی ہے۔ یہ حاکمانہ اقتدار کی فطرت ہی کے خلاف ہے' اس سے بھی کون انکار کرسکتا ہے؟

شرکت عمل کی یہ علیحدگی اگر بیک وقت پوری طرح عمل میں آجائے تو کسی عقل کو بھی اس میں شک نہیں ہوسکتا کہ سورج کے ایک طلوع و غروب کے اندر ہندوستان کی تاریخ پلٹی جاسکتی ہے۔ لیکن کیونکر عمل میں آئے۔ اس آسانی کی ساری وشواری اسی سوال میں پنہاں ہے۔ اس جنگ میں' جو جنگ ہونے کے ساتھ بھی جنگ نہیں ہے' اگر جنگ کی سی کوئی تیاری ہے' تو یہی ہے۔

میں دشواریوں کی تفصیل میں نہ جاؤں گا لیکن مجھے یہ کہنا ہے کہ انہی دشواریوں کا لحاظ رکھ کر اس نے ایسا طریق کار اختیار کیا ہے' جو تمام دشواریوں کو حل کر دیتا ہے۔ وہ اپنی کامیابی کے لیے کسی ایسے وقت کا انتظار بالکل ضروری نہیں سمجھتا۔ جب ملک کے تمام کواپریٹرز نون کواپریٹرز (30) ہو جائیں' ایک ایک بڑی اکثریت اس کے پروگرام پر عمل کرلے' بلکہ اس نے ایسا طریقہ اختیار کیا ہے' جس کے لیے صرف ایک خاص مقدار کا عمل کفایت کرتا ہے' اگر اتنی مقدار مہیا ہو جائے' تو وہ گو بقیہ کا بھی خواہشمند رہے گا' لیکن اس کے انتظار میں رکے گا نہیں۔

صورت اس کی یہ ہے کہ اس نے اپنے عمل کو دو قدرتی حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک جنگ کے لیے مواد کا مہیا کرنا اور ایک خود جنگ کا۔ معرکہ جنگ کے سروسامان کے لیے اسے آدمیوں کی ضرورت ہے اور اس اسپرٹ (31) کی' جو وہ اپنی غیر مسلح جنگ کے لیے ضروری سمجھتا ہے۔ جنگ کے میدان کے لیے اسے ایسے مناسب تصادم کی ضرور ہے' جو اس کی سلبی (پازیٹو) (32) قوت اور دفتری اقتدار میں پیدا ہو جائے اور جو بالاخر ایک فیصلہ کن معرکہ کی طرح نتیجہ خیز ثابت ہو۔

پہلی غرض کے لیے اس نے وہ پروگرام اختیار کیا ہے' جس میں وہ سرکاری درباروں' تعلیم گاہوں اور عدالتوں سے نون کواپریشن کی دعوت دیتا ہے' کیونکہ اس کو

یقین ہے کہ کواپریشن کی انہی بستیوں میں کئی ایسے آدمی موجود ہیں جو دفتری اقتدار اور قومی جدوجہد دونوں کے لیے بہترین سپاہی ہوسکتے ہیں۔ پس وہ ان کو بلاتا ہے تاکہ ایک طرف حریف کے قبضہ سے اس کی بہترین فوج نکل سکے' دوسری طرف اس کی جنگ کے لیے بہترین سپاہی مہیا ہو جائیں۔ جب اس دعوت کے ذریعہ ایک تعداد فراہم ہوگئی تو گویا اس نے اپنی پہلی فوج تیار کرلی۔ اب یہی فوج اس کی تمام جدوجہد کے لیے اصلی اور مرکزی فوج ہے۔ اس کی تمام آئندہ امیدیں ملک سے نہیں' بلکہ اسی جماعت سے وابستہ ہیں۔

یہ پہلی فوج ایک طرف بلاانتظار جنگ شروع کر دے گی۔ دوسری طرف اپنی دعوت اور عملی نمونہ کی تاثیر سے وقتاً" فوقتاً" نئی نئی جماعتوں کو بھی اپنے میں جذب کرتی جائے گی۔

دوسری غرض کے لیے اس نے مقاومت سلبی یا سول ڈس اوبیڈ ئنیس کا پروگرام اختیار کیا ہے۔ یہی اس کی اصلی جنگ ہے اور اسی پر اس کے مقصد کا فیصلہ موقوف ہے۔

پس اس طریق عمل نے اس سوال کو بالکل غیرضروری کردیا ہے کہ تمام ملک نون کواپریشن پر ایک معین وقت کے اندر عمل کرسکے گا یا نہیں؟ اور اگر ایک بڑی تعداد اس پر عمل کرکے عدالتوں اور کالجوں سے نکل بھی آئی تو ہم اسے اپنی جاری جنگ میں یکساں استقامت کے ساتھ اپنے ساتھ رکھ سکیں گے یا نہیں؟ اگر تمام ملک عمل نہیں کرسکتا' تو نہ کرے۔ اگر بہت سے لوگ اس پر عمل کرکے قائم نہیں رہ سکتے تو کچھ مضائقہ نہیں۔ نون کواپریشن کو اس پر افسوس ہوگا' مگر ہراس نہ ہوگا۔ بلاشبہ وہ بطور ایک اعتقاد اور فرض کے سب کو بلاتا ہے۔ لیکن بطور ایک جدوجہد کے پروگرام کے وہ کسی ایسی مکمل اور یکساں حالت کا بالکل محتاج نہیں ہے۔ وہ اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہے کہ جماعت کے اعمال' عقل و استدلال کے تابع نہیں ہیں' تمامتر جذبات کی مخلوق ہیں۔ جماعت یاتو دوڑتی ہے' یا بیٹھ جاتی ہے۔ لیکن ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ یکساں رفتار سے چلتی رہے۔ پس یہ ناگزیر ہے کہ اتار چڑھاؤ ہوتے رہیں۔ جب کبھی

ایک خاص طرح کی فضا پیدا ہو جائے گی' ایک اشارے پر ہزاروں قدم دوڑتے آئیں گے۔ پھر جب وہ بدلے گی' تو بار بار کے بلاوے پر بھی ایک قدم جنبش نہ کرے گا۔

ایک فضا کیوں کر پیدا ہو سکتی ہے؟ صرف جنگ سے۔ اس کی جنگ سول ڈس اوبیڈئینس ہے۔ پس اگر وہ کسی بات کے لیے فکرمند ہے' تو وہ صرف اس کی پہلی اور مرکزی فوج ہے۔ اس کے میدان کی فتح و شکست کا دارومدار اس کی اخلاقی فتح و شکست پر ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ یہ پہلی فوج خواہ کتنی ہی کم تعداد میں ہو' لیکن اپنے اندر کمیت کی نہیں' بلکہ کیفیت کی طاقت پیدا کرلے۔ وہ نون کواپریشن کا اپنے آپ کو مجسم عملی نمونہ بنا لے۔ پہاڑ کی طرح اٹل اور سمندر کی طرح لبریز ہو جائے۔ وہ قربانیوں پر قربانیاں کرتی جائے اور عملی نمونہ کی کشش اور گیرائی سے ملک کی غفلت اور اعراض کو شکست دے دے۔ اس کو یقین ہے کہ اگر ایسی جماعت ملک میں قائم ہوگئی' اور اس نے اپنی جنگ جاری رکھی' تو یہ اس طرح کی کشمکش کے نفسیات کا قانون ہے کہ بہت جلد جنگ کے معرکوں کا موقع حاصل ہو جائے گا۔ اور جونہی ایسے معرکوں کی فضا پیدا ہوئی' پھر خود بخود ہزاروں لاکھوں قدم اس کی طرف بن بلائے دوڑیں گے' اس کے لیے سپاہیوں کی کمی نہیں رہے گی۔

اگر پہلے مقابلہ میں وہ نتیجہ حاصل نہ کر سکی تو کوئی مضائقہ نہیں۔ وہ اس سے ذرا بھی ہراساں نہ ہوگی کہ اب سپاہی اپنے بستروں پر واپس جا چکے ہیں۔ وہ اپنا کام جاری رکھے گی اور اس وقفہ کو اس طرح خرچ کرے گی' تاکہ جلد از جلد دوسرے مقابلہ کے لیے فضا مہیا ہو جائے۔ پھر جب ایسی فضا پیدا ہو جائے گی' وہ مقابلہ کا اعلان کر دے گی' اور اس کو یقین ہے کہ وہ سب جو بستروں پر لیٹ چکے ہیں' اچانک میدان میں کھڑے نظر آئیں گے۔

البتہ اس کا پروگرام بالطبع ایک محدود وقت کے اندر نتیجہ حاصل کرلینا چاہتا ہے۔ لمبے لمبے وقتوں کا نہیں ہے۔ اسی لیے اس نے اندازہ کیا تھا کہ پہلے مقابلہ کا نتیجہ سال بھر کے اندر نکل آنا چاہیے۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس ترتیب عمل کے واضح ہو جانے کے بعد اس سوال کا

جواب خودبخود مل جاتا ہے' جو موجودہ مباحثہ نے پیدا کردیا ہے۔ سوال کے دونوں پہلو اصلیت سے منحرف ہیں۔ نہ تو یہ پروگرام کوئی ایسا پروگرام تھا' جو صرف ایک مرتبہ عمل میں لاکر ترک کر دیا جائے۔ اور نہ یہ صحیح ہے کہ نتائج اور حالات سے بالکل آنکھیں بند کرکے محض ایک اخلاقی اصول کی طرح اس کا وعظ کرتے رہنا چاہیے۔ اس کا نصف حصہ' خود جنگ نہیں ہے' بلکہ جنگ کے لیے سپاہیوں کی طلب ہے۔ اور وہ ہمیں اس طرح بار بار کام دے گا' جس طرح بار بار ہم فیصلہ کن معرکے گرم کریں گے۔ بقیہ نصف' اصل جنگ کا میدان مہیا کرتا ہے اور اس کے لیے ضروری نہیں ہے کہ ایک ہی مرتبہ فیصلہ کن ہو۔

نون کواپریشن کی ذہنیت

یہاں سے یہ بات بھی ضمناً" واضح ہوگئی کہ نون کواپریشن کی ذہنیت کی نسبت جو غلط فہمیاں پھیلائی گئی ہیں' وہ کس قدر دوراز کار ہیں۔ کہا گیا ہے کہ وہ مغربی تہذیب و علوم کے برخلاف ایک چیلنج ہے۔ وہ سیاسی جدوجہد کی جگہ ایک نئے مذہب اور اخلاق کا وعظ ہے۔ وہ ترک دنیا اور رہبانیت کی تعلیم دے کر دنیا میں تقدم کی جگہ واپسی کی خواہش پیدا کرنا چاہتا ہے۔ لیکن میں پورے وثوق سے کہتا ہوں کہ یہ ہمارے خیالات کی ایسی تعبیر ہے' جسے ہم تسلیم نہیں کرتے۔

دراصل تمدن' تعلیم اور معیشت کے سوالوں سے اسے براہ راست کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ بلاشبہ ہندوستان میں مغربی تہذیب و تمدن کے محاسن اور نقائص کی نسبت مختلف قسم کی رائیں موجود ہیں۔ خود یورپ اور امریکہ کا ذہنی سکون جنبش میں آچکا ہے۔ اور نئے نئے اصولوں اور خیالات کے سیلاب امنڈ آئے ہیں۔ یہ بھی صحیح ہے کہ ٹالسٹائی کی طرح خود مہاتما گاندھی کے بھی اس بارے میں خاص خیالات ہیں' لیکن نون کواپریشن اپنے مقصد کے سوا اور کوئی رائے نہیں رکھتا۔ وہ اپنے پیروؤں کو نہ تو کوئی مذہبی اعتقاد سکھاتا ہے' نہ ترک دنیا اور زہد و عبادت کی ایک نئی خانقاہ تعمیر کرنی چاہتا ہے۔ وہ ہر طرح ایک سیاسی دستورالعمل ہے' جس کی بنیاد حقیقت اور سچائی پر ہے۔

اس لیے مذہب، اخلاق، تاریخ سب کی نگاہیں یکساں طور پر اسے پہچانتی ہیں اور اپنی اپنی زبان میں پکارتی ہیں۔ اگر وہ کہتا ہے کہ سرکاری تعلیم گاہیں اور قانون کی پریکٹس چھوڑ دو، تو اس لیے نہیں کہ وہ یورپین علوم اور قانون کی پریکٹس کا مخالف ہے۔ بلکہ صرف اس لیے کہ وہ اس اقتدار کا مخالف ہے، جس کے ماتحت وہاں رہنا اور اس کی اعانت کا ذریعہ بننا پڑتا ہے۔ اگر وہ کہتا ہے کہ کھدر پہن لو، تو یہ اس لیے نہیں ہے کہ وہ قیمتی لباس یا کسی خاص وضع قطع کا مخالف ہے، بلکہ صرف اس لیے کہ وہ غیر ملکی لباس پر ملکی لباس کو ترجیح دیتا ہے، اور نیز اس لیے کہ اسے یقین ہے کہ ملک کو اپنی آزادی اور نجات کے لیے طرز معیشت کی سادگی اور ضبط نفس کی اخلاقی روح کی ضرورت ہے۔

پہلا تجربہ

آیئے، اب غور کریں۔ ہماری موجودہ حالت کیا ہے؟ ہم نے پروگرام کے پہلے حصے کے مطابق لوگوں کو بلایا۔ وہ آئے اور ایک پہلی اور مرکزی جماعت تیار ہوگئی، پھر اس کے دوسرے حصہ کے مطابق حالات نے جلد تصادم کی فضا بھی مہیا کردی اور مقابلہ شروع ہوگیا۔ یہ دسمبر 1921ء کی بات ہے، اب نہ صرف ہمارے لیے بلکہ دنیا کے لیے یہ سوال نہایت اہم ہے کہ یہ پروگرام کہاں تک کامیاب ہوا؟ لیکن کامیابی کی جانچ کا ٹھیک معیار کیا ہے؟ دو چیزیں ہیں۔ دونوں کی کامیابی کا ایک معیار نہیں ہوسکتا۔ ایک نون کوآپریشن کا دستورالعمل ہے۔ ایک ہماری وہ جدوجہد ہے، جو اس پر عمل پیرا ہو کر ہم نے حاصل کی ہے۔ اگر ہم اپنی جدوجہد میں آخری مقصد حاصل نہ کرسکے، تو ضروری نہیں ہے کہ اس کی ذمہ داری دستورالعمل کے سر عائد ہو۔ بحیثیت ایک عملی پروگرام کے اس کی کامیابی یہ ہے کہ تجربہ سے اس کے قابل عمل، موثر اور نتیجہ خیز ہونے کی شہادت مل جائے، اگر ایسی شہادت مل جائے، تو پھر اس کی کامیابی کے لیے کوئی بات نہیں رہ جاتی، اگرچہ ہمارے لیے کامیاب ہونا باقی رہ جاتا ہے۔

باقی رہی ہماری جدوجہد کی کامیابی، تو مجھے اس سے بھی انکار ہے کہ اس کے لیے آخری مقصود کا پالینا معیار ہوسکتا ہے۔ آخری مقصود کا پالینا صرف کامیابی ہی نہیں

ہے' بلکہ آخری کامیابی ہے' اور ضروری ہے کہ اس سے پہلے متعدد کامیابیاں حاصل کرلی جائیں۔ ہمیں دیکھنا یہ چاہیے کہ وہ کامیابیاں ہم حاصل کرسکتے ہیں یا نہیں؟

تجربہ کی کامیابی

حضرات!

میں بلا کسی تامل کے یہ کہنے کی جرات کرتا ہوں کہ میرے یقین میں پروگرام کامیاب ہوا بلکہ اس نے وہ زیادہ سے زیادہ کامیابی حاصل کی ہے' جو کسی ایسے پروگرام کے لیے ہو سکتی ہے۔ اگر اب سے تین برس پہلے وہ ایک اصول تھا' جس کی کامیابی استدلال سے واضح تھی' تو اب ایک تجربہ میں آیا ہوا یقین ہے' جس کی کامیابی مشاہدہ نے ثابت کردی ہے۔

ایک منٹ کے لیے ان تمام رکاوٹوں اور دشواریوں کو اپنے سامنے لایئے جو اس کی راہ میں حائل تھیں اس تھوڑے سے وقت کا بھی خیال کیجئے جو اس کو تعلیم' تیاری اور عمل تینوں منزلیں طے کرنے کے لیے ملا۔ اس حقیقت کو بھی فراموش نہ کیجئے کہ راہ آزادی میں یہ ملک کا پہلا عملی قدم تھا۔ پھر دیکھئے کہ کیسے حیرت انگیز نتائج کا کیسا عظیم سلسلہ آپ کے سامنے موجود ہے؟ کیونکر ممکن ہے کہ ہم اس کی ناکامی کا خیال بھی کرسکیں؟ اس کی کونسی بات ہے جس پر عمل نہ ہوسکا اور کون سا عمل ہے جس نے کامیاب اثر نہیں دکھایا؟ کیا بیشمار آدمیوں نے سرکاری انسٹی ٹیوشنوں (33) کو نہیں چھوڑا؟ کیا وہ ان تمام دنیوی فائدوں اور راحتوں سے دست بردار نہیں ہوگئے' جو انہیں حاصل ہورہی تھیں؟ کیا تمام ملک میں ایثار اور قربانی کا عام ولولہ نہیں پیدا ہوگیا؟ کیا ہزاروں آدمی خوشی خوشی جیل خانوں میں نہیں چلے گئے؟ کیا حکومت کا پورا مسلح نظام اس سے عاجز نہیں آگیا کہ پرنس آف ویلز کے دورہ کے موقع پر ہڑتال کی ایک دوکان کا تختہ بھی نہ کھلوا سکے؟ کیا 1921ء کی ہر صبح اور شام نے اس کی شہادت نہیں دے دی' کہ ہندوستان میں بھی قوم کی مرضی ہے' اور وہ میدان میں نمایاں ہوسکتی اور مقابلہ کے لیے کھڑی ہوسکتی ہے۔

قوموں کا انقلاب پہلے سطح پر نہیں' بلکہ دل و دماغ کی گہرائیوں میں پیدا ہوتا ہے۔ اس نے بارہ مہینے کے اندر ہندوستان کا دماغ پلٹ دیا۔ قوم کے تمام طبقوں اور جماعتوں کی استعداد دفعتاً" بلند کردی۔ براعظم کے ایک ایک فرد تک آزادی اور وطن پرستی کا پیغام پہنچا دیا۔ ہزاروں انسانوں کی زندگیوں پر انقلاب طاری کردیے۔ راہ آزادی کی سزاؤں اور تکلیفوں کا خوف ملک کے دل سے اس طرح نکال دیا کہ قید ہونا کھیل اور سزا دینے والی عدالتیں تماشا گاہ بن گئیں۔ غرضیکہ آزادی کی جدوجہد کی کوئی بات ایسی نہیں ہے جس کا دروازہ اس نے ملک پر نہ کھول دیا ہو۔ اگر یہ تمام باتیں کل تک کے واقعات ہیں' تو پھر اس بات کے لیے اور کیا چاہیے کہ پروگرام صحیح ہے' عملی ہے' اور اپنی تاثیر میں بے خطا ہے۔ نون کواپریشن نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا تھا کہ وہ قدیم روایتوں کے معجزے دکھلائے گا۔ اس کا عاجزانہ اعلان یہ تھا کہ اس پر چل کر ملک بلا اسلحہ کے ایسی طاقت پیدا کرسکتا ہے' جو دفتری اقتدار کے لیے ناقابل تسخیر ہوگی۔ پھر کیا یہ تمام نتائج اس کا قطعی ثبوت نہیں ہیں؟

پہلا معرکہ

اگر سوال کیا جائے کہ ہماری جدوجہد میدان جنگ میں کہاں تک کامیابی حاصل کرسکی؟ تو اس کے جواب کے لیے ہمیں دسمبر1921ء کے واقعات پر نظر ڈالنی چاہیے۔ جب دفتری اقتدار نے کریمیل لا امنڈمنٹ ایکٹ (34) نافذ کرکے ڈیفنس و سول ڈس اوبیڈینس (35) کی راہ صاف کردی تھی۔ فی الحقیقت یہی جدوجہد کا اصلی معرکہ تھا۔ میں اس کی تاریخ کا یہ واقعہ یہاں ثبت کرتا ہوں کہ 2 دسمبر کو مقابلہ شروع ہوا اور ابھی دو ہفتے پورے نہیں گزرے۔ تھے کہ دفتری اقتدار پر شکست کے آثار طاری ہوگئے' حتیٰ کہ اسے مجبوراً جدوجہد کی طاقت کا کھلا اعتراف کرنا پڑا۔ اور اس کے سوا کوئی چارہ نظر نہ آیا کہ التوائے جنگ یا صلح کے لیے آمادہ ہو جائے۔ چنانچہ وہ بالکل تیار تھا کہ جدوجہد سے ایک مستقل حریف کی طرح معاملت کرے' دونوں میں سے کسی فریق کے ہارے جیت کا سوال نہ ہو' دونوں عارضی طور پر اپنی اپنی کارروائیوں کو ملتوی کردیں۔

گورنمنٹ کریمنل لا امنڈمنٹ ایکٹ کا نفاذ اٹھا لے اور قیدیوں کو رہا کر دے۔ کانگریس پرنس آف ویلز کے ورود کا مقاطعہ ملتوی کر دے۔ اس کے بعد راؤنڈ ٹیبل کانفرنس منعقد ہو اور وہ جدوجہد کے مطالبات پر غور کرے۔ ہز ایکسیلنسی وائسرائے نے 21 دسمبر کو کلکتہ میں ایک وفد کا جواب دیتے ہوئے انہی شرائط پر زور دیا تھا اور بار بار طلب و تمنا اور صلح و صفائی کے لیے ایسے لب و لہجہ میں، جس کا دفتری اقتدار کبھی عادی نہیں ہوا، اپنی انتہائی خواہش ظاہر کی تھی کہ التوا اور صلح کی صورت نکل آئے۔

میں نے اس واقعہ کا ذکر اس لیے نہیں کیا کہ میں اسے جدوجہد کی کوئی بہت بڑی فتح مندی سمجھتا ہوں۔ ہمارا مقصد بلند ہے اور ضروری ہے کہ اسی مناسبت سے ہماری کامیابی کا معیار بھی بلند ہو۔ یہ بات ہمارے لیے بڑی چیز نہیں ہے کہ ہم سے صلح کی ایک ایسی خواہش پیدا ہوئی، جس کے ساتھ کوئی وعدہ نہ تھا۔ البتہ میں اسے جدوجہد کی ابتدائی کامیابی ضرور یقین کرتا ہوں، اس نے دکھا دیا کہ ہمارا طریق عمل کس قدر زود اثر اور بے خطا ہے اور کس طرح وہ دو ہفتہ کے اندر اغماض اور گھمنڈ کی جگہ اعتراف اور طلب کی تبدیلی پیدا کر دینے کی قدرت رکھتا ہے۔

انقلاب حال اور جدوجہد کے لیے وقفہ

حضرات!

ہر قومی جدوجہد کی تاریخ میں جہاں اس کی بہت سی باتیں یادگار ہوتی ہیں، وہیں چند غلطیوں کا بھی ذکر ضرور ملتا ہے۔ ان غلطیوں کا ہونا گویا اس طرح کی حالت کی ایک قدرتی بات ہے۔ میں یقین کرتا ہوں کہ باردولی کا فیصلہ ہماری جدوجہد کے لیے ایک ایسی ہی غلطی تھی۔ ہم اس پر اپنے تاسف کو تو نہیں روک سکتے، لیکن ہم اسے اس طرح محسوس کرتے ہیں۔ گویا ایک ہونے والی بات تھی۔ اس سے ہم کسی طرح بچ نہیں سکتے تھے۔ دراصل باردولی کے فیصلہ پر ہمارا جدوجہد کا پہلا فیصلہ کن معرکہ ختم ہو گیا اور اس وقت سے ہم ایک ایسے وقفہ جنگ کی حالت میں ہیں جس میں جنگ تو قائم ہے لیکن مقابلہ کے لیے وقفہ پیدا ہو گیا ہے۔

کونسل کا اختلاف

حضرات!

گزشتہ جنوری میں جب میں جیل سے رہا ہوا تو میں نے محسوس کیا کہ میرے لیے سب سے زیادہ ضروری خدمت یہ ہے کہ اس اختلاف کے دور کرنے کی کوشش کروں۔ چونکہ اس کے لیے ضروری تھا کہ میں اپنے ذاتی خیالات ظاہر کر کے کوئی خاص جانب اختیار کرنے سے پرہیز کروں' اس لیے مجھے اس وقت تک کوئی موقع نہیں ملا کہ اصلی مسئلہ کی نسبت اپنی ناچیز رائے ظاہر کرتا۔ آج یہ پہلا موقع ہے کہ اس بارے میں زبان کھولتا ہوں۔ اس اختلاف نے جو دو جماعتیں قائم کر دی ہیں' ان دونوں میں میرے ایسے محترم احباب موجود ہیں' جن کی قابلیت اور خدمت کی میرے دل میں ویسی ہی عزت ہے' جیسی ہر باشندۂ ہند کے دل میں ہونی چاہیے۔ تاہم یہ بات اس سے مانع نہیں ہو سکتی کہ میں اپنے خیالات صاف صاف عرض کروں کیونکہ اگر میں ایسا نہ کروں' تو علاوہ ادائے فرض کی کوتاہی کے یہ اس اعتماد کا بھی صحیح استعمال نہ ہوگا' جو آج آپ نے مجھ پر ظاہر فرمایا ہے۔

سب سے پہلی بات جو اس اختلاف کی نسبت میں عرض کروں گا' وہ یہ ہے کہ اول روز سے جس قدر اہمیت اس مسئلہ کو فریقین کی جانب سے دی گئی ہے' مجھے "کلیتہً" اس سے اختلاف ہے۔ میں یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ دراصل ہماری تمام موجودہ مشکلات کی اصل بنیاد اسی غلطی میں پنہاں ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ جب کبھی کوئی اختلاف رائے پیدا ہو' ہمارا پہلا فرض یہ ہے کہ ہم دیکھیں یہ اصول کا اختلاف ہے یا فروع کا۔ اس کا اثر کسی جڑ پر پڑتا ہے یا محض شاخ پر۔ اگر وہ اختلاف' اصول کا اختلاف ہے' تو بلاشبہ ہمارا فرض ہے کہ ہم زیادہ سے زیادہ ثبات و استقامت اس میں ظاہر کریں' نرمی اور درگزری کی اس میں کوئی گنجائش نہیں ہو سکتی۔ کثرت و قلت رائے کا سوال اس کے لیے خارج از بحث ہے۔ ڈسپلن (36) کا سوال بھی اس پر موثر نہیں ہو سکتا۔ لیکن اگر وہ محض ایک شاخ کا اختلاف ہے' تو پھر

صورت حال بالکل بدل جاتی ہے۔ یہاں بھی ہمیں اپنی رائے میں کمزور ہونے کی کوئی وجہ نہیں' لیکن عمل میں اتنا سخت نہ ہونا چاہیے کہ کسی طرح کی لچک قبول نہ کریں۔ ضرورت ہوگی تو ہم اس سے قطع نظر بھی کرلیں گے' کوئی بڑی مصلحت سامنے آجائے گی تو اس چھوٹی چیز کو اس پر قربان بھی کردیں گے۔ جماعت کا ساتھ' مجارٹی (37) کا اتباع' نظام کا ڈسپلن' سب اس سے اوپر رہیں گے' اس کے لیے چھوڑ نہیں دے جائیں گے۔ عزم اور ثبات یقیناً انسان کے لیے اول درجہ کے اوصاف ہیں' مگر اسی حال میں جب کہ اپنے صحیح محل پر خرچ کیے جائیں اور صحیح تعداد میں خرچ کیے جائیں۔ میں بلا کسی تامل کے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس مسئلہ کا اختلاف نون کواپریشن کے لیے قطعاً" کوئی اختلاف نہ تھا۔ نون کواپریشن بحیثیت ایک اصول کے کیا ہے؟ میں یقین کرتا ہوں کہ کوئی شخص اس کے جواب میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ پروگرام کی دفعات ہیں' جن میں کالج' عدالت اور کونسلوں کے نام ہمیں ملتے ہیں۔ یقیناً وہ سرکاری کالجوں کو چھوڑ دینے' یا کونسلوں کے ووٹروں کو وٹ دینے سے روکنے ہی کا نام ہے۔ وہ ان سب سے بالاتر کوئی چیز ہے اور وہی نون کواپریشن ہے۔ لیکن ہمیں معلوم ہے کہ یہ اختلاف نون کواپریشن میں نہ تھا۔ اس بارے میں نہ تھا کہ ہمیں کونسلوں میں اشتراک عمل کے لیے جانا چاہیے یا نہیں؟ صرف یہ تھا کہ ہمیں اصلاحی کونسلوں کے دوسرے انتخاب کے موقع پر بھی وہی طرز عمل اختیار کرنا چاہیے جو پچھلی دفعہ اختیار کیا تھا' یا اس میں تبدیلی کرنی چاہیے؟ میں بالکل یہ سمجھنے سے عاجز ہوں کہ نون کواپریشن کی مضبوط سے مضبوط پابندی کے ساتھ کیوں اس بارے میں دورایوں کی گنجائش نہیں ہے؟ یہ تو صرف پروگرام کی تبدیلی و عدم تبدیلی کا سوال بھی نون کواپریشن کے لیے ایک اصولی سوال سمجھا جائے۔ نون کواپریشن کی اصل صرف یہ ہے کہ ہم موجودہ دفتری اقتدار سے اشتراک عمل نہیں کرسکتے۔ پس' جب ایک شخص نے اس سے اتفاق کیا تو وہ نون کواپریٹر ہے۔ اب رہی یہ بات کہ کس طرح یہ بات بطور ایک قومی حرکت کے عمل میں لائی جائے؟ تو اس کے لیے جو کچھ بھی ہم طے کریں گے' وہ ضرور واجب العمل ہے لیکن بہرحال اصل نہیں ہے' فرع ہے' مقصود نہیں ہے' وسیلہ ہے اور اگر اس میں

اختلاف رائے ہو' تو وہ کبھی اس اہمیت کا مستحق نہیں ہو سکتا' جو اصولی اختلاف کو دی جا سکتی ہے۔

آزادی ہمارا مقصد ہے۔ عدم تشدد اور نون کواپریشن ہمارا اصول ہے اور حصول مقصد کے لیے ہم نے ایک پروگرام اختیار کیا ہے جس کی ہر دفعہ ایک وسیلہ ہے' مقصد ہے ہم اعتقاد نہیں بدل سکتے۔ ہم اصول نہیں ترک کر سکتے لیکن ہم وسائل میں ہر آن اور ہر لمحہ تبدیلی کر سکتے ہیں۔ اگر اس تبدیلی سے ہمیں انکار ہو گا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم جنگ سے انکار کر دیں۔

لیکن افسوس ہے کہ اس اختلاف نے ایسی اہمیت فریقین میں حاصل کر لی' گویا یہ ایک اصولی اختلاف ہے اور دونوں طرف سے اس پر اس قدر قوت خرچ کی گئی' گویا قومی جدوجہد کا جینا مرنا اسی پر موقوف ہے۔ ایک طرف سے کہا گیا کہ یہ خود نون کواپریشن کا اختلاف ہے' حال آنکہ اگر نون کواپریشن کا اصول اس قدر تنگ مان لیا جائے' تو پھر میں نہایت ادب سے عرض کروں گا کہ دنیا میں نون کواپریشن کا کوئی عمل چند دنوں سے زیادہ نہیں جی سکتا۔ دوسری طرف سے اس بات پر اس قدر زور دیا گیا کہ اس کی وجہ سے کانگریس کی متحدہ قوت کا تفرقہ گوارا کر لیا جائے' حال آنکہ اگر اس طرح کے جزوی اختلاف کی بنا پر تفریق اور جماعت بندی درست کر لی جائے' تو مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑے گا کہ دنیا میں کوئی نظام قائم نہیں رہ سکتا۔

بہرحال جو اہمیت اس معاملہ کو دی گئی' مجھے اس سے اختلاف ہے۔ یہ مسئلہ ہرگز ایسا نہ تھا' جس کی خاطر ہم اپنا اتحاد' اپنی سرگرمی' اور اپنا وہ سب کچھ جو ہم نے حاصل کیا ہے' خطرہ میں ڈال دیں۔ میں وثوق کے ساتھ یہ رائے رکھتا ہوں کہ گیا کانگریس میں آپ نے خواہ یہ فیصلہ کیا ہوتا' لیکن اگر آپ متفق رہتے' تو آج ان مشکلات کا نام و نشان بھی نہ ہوتا' جن کی وجہ سے جدوجہد کا ایسا قیمتی برس جیسا کہ 1923ء ہے' بالکل ضائع ہو گیا۔

ہندو مسلم اتحاد کے فتور کا بھی اصلی باعث کیا ہے؟ میں عرض کروں گا' صرف آپ کا یہ اختلاف اور اختلاف کی وجہ سے ملک کی بیکاری۔ لوگوں کے لیے جب وہ

اصلی کام باقی نہ رہا، جس میں سب کے دل اٹک گئے تھے، تو اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ آپس میں ٹکرانے لگیں۔ آپ جب کہ طریق عمل کی ایک خاص صورت کے لیے اس قدر طاقت خرچ کر رہے ہیں، تو ایک لحہ کے لیے اس حقیقت کو بھی یاد کر لیجیے کہ کامیابی کا دارومدار محض ہتھیاروں اور راستوں کی نوعیت پر نہیں ہے، بلکہ خود فوج کی طاقت پر ہے۔ یہ بات کہ ہتھیار کیسے ہوں؟ ایک دوسرے درجہ کا سوال ہے۔ اصلی سوال یہ ہے کہ سپاہی کیسے ہوں؟ اور ان کی اخلاقی حالت کیسی ہو؟ ہتھیار کے لیے صرف اتنا دیکھ لینا بس کرتا ہے کہ کاٹ رکھتا ہو۔ اگر وہ بہتر قسم کا نہیں ہے، تو مضائقہ نہیں۔ فوج میں ایکا اور مضبوطی ہونی چاہیے۔ ایک متحدہ فوج خراب ہتھیاروں کے ساتھ بھی کامیاب ہو سکتی ہے، لیکن اچھے سے اچھے ہتھیار بھی منتشر اور بے دل سپاہیوں کو جیت نہیں دلا سکتے۔ ہم سب ایک برس سے صرف اتنی بات پر لڑ رہے ہیں کہ ہتھیار کیسا ہو؟ لیکن اس کی کچھ پروا نہیں کرتے کہ آج فوج کا کیا حال ہو رہا ہے۔ اگر فوج ہی منتشر ہو گئی، تو پھر آپ کو اچھی سے اچھی بندوق بھی کیا کام دے گی؟ مان لیجیے کہ کونسلوں کا بائیکاٹ ہی سب سے بڑا کام ہے، یا کونسلوں پر قبضہ کر لینے میں دنیا جہان کی فتح ہے۔ تاہم جب آپ کی متحدہ طاقت نہ رہی، آپ کا نظام الٹ گیا، کسی قومی مرکز کا ڈسپلن قائم نہ رہا، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہندو مسلم اتحاد میں رخنے پڑ گئے، تو فرمائیے؟ آپ بائیکاٹ کیونکر کریں گے؟ کونسلوں کی نشستوں پر کیونکر قابو پائیں گے۔

افراط و تفریط

حضرات!

ہمارے سامنے محافظت کی اصلی چیز جزئیات نہیں ہیں، اصول ہیں۔ پس یہ کسی طرح صحیح طرز عمل نہ ہوگا کہ ہم کسی جزوی مسئلہ کے جوش میں اس قدر دور چلے جائیں کہ اس کی وجہ سے نئے نئے اصولوں کے قائم ہو جانے کا اندیشہ پیدا ہو جائے اور وہ آگے چل کر ہمارے لیے اصولی مشکلات پیدا کر دیں۔ اس اختلاف نے جب دو جماعتیں قائم کر کے فریقانہ بحث و نزاع کی شکل اختیار کر لی تو یہ ناگزیر تھا کہ افراط و

تفریط کی طرف میلان پیدا ہو۔ لیکن ہمارا فرض ہے کہ ہم اس سے اپنے دل و دماغ کی نگہبانی کریں۔ ہمیں کبھی کورانہ تقلید کی دعوت نہیں دینی چاہیے' لیکن ہمیں ہمیشہ اطاعت (ڈسپلن) میں مضبوط رہنا چاہیے۔ تقلید سے مقصود ایسی دماغی حالت ہے جب کہ انسان کسی بڑے آدمی کی پیروی کرتا ہوا حد اعتدال سے گزر جاتا ہے۔ اور بجائے اس کے کہ اپنے ذہن و دماغ سے کام لے' محض ایک شخص کا قول اس کے لیے حق و باطل اور صحیح و غلط کا معیار بن جاتا ہے۔ مذہب اور علم' دونوں کے راستہ میں اس طرح کی تقلید انسانی ترقی و سعادت کے لیے سب سے بڑی روک ثابت ہوئی ہے اور ہمیں کبھی نہیں چاہیے کہ سیاست کو بھی اس سے آشنا کریں' برخلاف اس کے اطاعت سے مقصود ایسی پیروی ہے' جو ایک سپاہی اپنے کمانڈر کی کرتا ہے۔ جس طرح تقلید ہر طرح کی ترقی و کامیابی کے لیے روک ہے' اسی طرح اطاعت ہر جماعتی عمل کے لیے پہلی شرط ہے۔ ممکن ہے کہ کمانڈر نے حکم دینے میں غلطی کی ہو لیکن سپاہی اس کے خلاف رائے رکھ سکتا ہے' مگر اس کے خلاف قدم نہیں اٹھا سکتا۔ اگر ہمارے کمانڈر کا حکم غلط بھی ہو' جب بھی ہمیں چاہیے کہ سباسٹوپول کی اس انگریز رجمنٹ کی طرح جس کی بربادی کا مرثیہ ٹینی سن نے لکھا ہے' کٹ جائیں' لیکن اطاعت سے باہر نہ ہوں۔ ایک حکم کی غلطی کا جھیل لینا اس سے بہتر ہے کہ پوری فوج کا ڈسپلن غارت جائے۔

آج انڈین نیشنل کانگریس ہماری تنہا حکمراں جماعت ہے۔ ہم جنگ کی سی حالت میں ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ خواہ کانگریس کا فیصلہ ہو' یا ہمارے بڑے بڑے لیڈر کی رائے' ہمیں ایک لمحہ کے لیے بھی اس کی کورانہ تقلید نہیں کرنی چاہیے' لیکن ساتھ ہی ہمیں اطاعت سے باہر بھی نہ ہونا چاہیے۔ جو جماعت تبدیلی کی مخالف ہے' وہ اس میں احتیاط نہیں کرتی کہ کہیں تقلید و جمود کی طرف قدم نہ بڑھا جائیں اور جو جماعت تبدیلی پر مصر ہے' وہ اس بات پر توجہ نہیں کرتی کہ ایک جزوی اختلاف کی وجہ سے ہمیں اپنے نظام کے ڈسپلن سے باہر نہ ہونا چاہیے۔

ہمارا آئندہ پروگرام

حضرات!

مجھے اب اجازت دیجئے کہ میں موجودہ حالات اور آئندہ طریق عمل کی نسبت اپنے خیالات آپ کی خدمت میں پیش کروں۔ میرا یقین ہے کہ ہندوستان کے لیے مہاتما گاندھی کی رہنمائی ایک سچی رہنمائی ہے اور اگر ہندوستان آزادی اور نجات حاصل کرسکتا ہے، تو صرف ان ہی کی رہنمائی سے۔ ہندوستان کے لیے آج صرف تین راہیں ہیں : یا موجودہ حالت پر قانع رہے، یا مسلح انقلاب کرے، یا نون کواپریشن پر عمل کرے۔ ہم موجودہ حالت پر قانع نہیں رہ سکتے۔ ہم مسلح انقلاب نہیں کرسکتے اور نہ کرنا چاہتے ہیں۔ پس ہمارے لیے صرف تیسری راہ رہ جاتی ہے اور وہ نون کواپریشن ہے۔

باقی رہا اس کا پروگرام، تو اس وقت تک کوئی بات ہمارے سامنے ایسی نہیں آئی ہے، جس کی وجہ سے کسی اصولی تبدیلی کی ضرورت محسوس کرتے ہوں۔ البتہ ہمیں تسلیم کر لینا چاہیے کہ ہمارا پہلا مقابلہ ہو چکا۔ ہمارا فیصلہ کن مقابلہ بجز سول ڈس اوبیڈینس کے اور کچھ نہیں ہوسکتا۔ اگر ہم اس سول ڈس اوبیڈینس سے بالفعل قطع نظر بھی کرلیں، جب ڈیفنس و سول ڈس اوبیڈینس کی طاقت پر پورا اعتماد ہے۔

البتہ اس کے لیے ایسے حالات کی ضرورت ہے، جن میں بعض تو ہماری تیاریوں سے تعلق رکھتے ہیں بعض کا تعلق تمامتر دفتری اقتدار کے طریق عمل سے ہے۔ ایک خاص طرح کا طریق عمل وہ اختیار کرے، جب کہیں وہ صورت پیدا ہو سکتی ہے جو ہمیں مطلوب ہے۔ مثلاً وہ جبر و تشدد کے ذریعہ ہماری سرگرمیوں کو روکے، یا قوانین کا غلط استعمال کرے، جیساکہ پچھلے موقعوں پر اس نے کیا تھا۔ بلاشبہ یہ ایک ایسی چیز ہے جو ہمارے اختیار میں نہیں ہے۔ لیکن ساتھ ہی مطمئن رہنا چاہیے کہ موجودہ حالات کے قدرتی قوانین ہمارے حق میں ہیں۔ ہمیں صرف یہی معلوم نہیں ہے کہ ہم صحیح راستہ پر ہیں، بلکہ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ہمارا مقابل فریق گمراہ ہے۔ اور یہ ایسے مقابلہ کی طبیعت ہے کہ گمراہ حریف کو ٹھوکریں لگیں۔ ہندوستان میں آج دفتری اقتدار کے افراد اور ہندوستانیوں کے دماغ کا مقابلہ نہیں ہے۔ بلکہ ایک غلط نظام اور صحیح مطالبہ میں مقابلہ ہے۔ پس یہ ضروری ہے کہ اس سے غلطیوں پر غلطیاں ہوں اور ضروری ہے کہ

قومی جدوجہد نئی نئی طاقتیں اور صلحتیں حاصل کرے۔ ہمیں یقین کرنا چاہیے کہ اگر ہم نے اپنی تیاریاں قائم رکھیں تو تھوڑے ہی عرصہ کے اندر ایسی فضا پھر پیدا ہو جائے گی کہ ہم اپنا دوسرا فیصلہ کن معرکہ شروع کر سکیں گے۔ جونہی معرکہ شروع ہوگا' پھر ازسرنو سپاہیوں کے لیے کشش پیدا ہو جائے گی۔ ہم دیکھ لیں گے کہ بستر خالی ہو گئے ہیں' اور میدان پھر سے بھر رہا ہے۔

کونسلوں کا مقابلہ

لیکن یہ وقفہ کیونکر اس طرح بسر کیا جائے کہ جلد سے جلد مقابلہ کے لیے مناسب فضا مہیا ہو جائے؟ اور ساتھ ہی ہماری موجودہ مشغولیت کے لیے بھی مفید ہو؟ اس وقفہ کے لیے یہ بہتر ہوگا کہ ہم موجودہ انتخاب کا بائیکاٹ کریں۔ یا یہ کہ جہاں کہیں اکثریت کے ساتھ کونسلوں میں جا سکتے ہیں' جائیں' اور انھیں بھی نون کوآپریشن کی سرگرمیوں کا ایک عارضی گوشہ بنا لیں۔

حضرات!

حالات کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد میں جو رائے قائم کرسکا ہوں' وہ یہ ہے کہ موجودہ حالت میں ہمارے لیے باہر رہ کر بائیکاٹ کرنا کچھ بہتر نہیں ہو سکتا' جس طرح گزشتہ انتخاب کے موقعہ پر ہمارے لیے بائیکاٹ ضروری تھا' اسی طرح آج ہمارے لیے یہ مفید ہے کہ جہاں تک ممکن ہو' ہم نشستوں پر قبضہ کرلیں۔ اور کونسلوں اور اسمبلیوں میں جائیں اور ایسا طرزعمل اختیار کریں کہ یہ مقامات بھی ہماری جدوجہد کا ایک گوشہ بن جائیں۔

میری ناچیز رائے میں ہمارا آئندہ طرزعمل یہ ہونا چاہیے کہ ایک طرف ہماری ایک جماعت کونسلوں میں چلی جائے' دوسری طرف کونسلوں سے باہر بھی سرگرمیاں جاری رہیں۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی دونوں جگہ کی نگرانی کرے اور ایک نظام کے ماتحت دونوں جگہ کام ہو۔ یہ بات قطعی طور پر طے کر دی جائے کہ کونسلوں میں جانا ایک مقررہ پروگرام کے ماتحت ہے' جو کانگریس قرار دے دے۔ اس پروگرام میں صاف

طور پر وہ تمام باتیں موجود ہیں' جو ہمارے طرز عمل کو شرکت عمل کی آلودگی سے محفوظ رکھیں۔ یہ قطعی ہے کہ وہاں جاکر کوئی زیادہ مدت تک کا کام جاری نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ ہمارا مقصود کسی حال میں بھی شرکت عمل نہیں ہے' اگرچہ بظاہر اچھے کاموں کے لیے ہو۔ یہ بات بھی بالکل صاف کر دینی چاہیے کہ کسی چھوٹی سے چھوٹی مدت کے لیے بھی وہاں کسی عہدہ کی ذمہ داری نہیں لی جا سکتی' خواہ کسی نیت و مقصد سے ہو۔

اب رہی یہ بات کہ کونسلوں میں جاکر کیا طرز عمل اختیار کریں؟ تو اس کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں اور بہت کچھ یہ وقت کے حالات پر موقوف ہے۔ تاہم ایک بات تو بالکل واضح اور ضروری ہے اور یہ ہے کہ کسی مناسب موقعہ پر نون کواپریٹر ممبروں کو کونسلوں سے باہر آنا پڑے گا اور باہر کی جماعت کے ساتھ مل کر سول ڈس اوبیڈینس سے مقابلہ کرنا پڑے گا۔

کونسلوں کا داخلہ ہم صرف اس لیے اختیار کرتے ہیں کہ اس مقابلہ کی تیاری کے لیے بمقابلہ بائیکاٹ کے' اسے بھی گوشہ جنگ بنا لینا زیادہ مفید ہے۔ اگر آج ہمیں ظن غالب پیدا ہو جائے کہ ہم وقفہ کی جگہ مقابلہ کی حالت میں ہیں' تو کم از کم میں ایک لمحہ کے لیے بھی یہ رائے نہ دوں گا کہ کونسلوں میں جانے کا خیال بھی کریں۔ یہی وجہ ہے کہ گو میں گیا پروگرام کی طرف سے بالکل مایوس تھا' تاہم جب تک ذرا بھی امید اس کی کامیابی کی' کی جا سکتی تھی' میری کوشش یہی رہی کہ سب مل کر اسے کامیاب بنانے کی سعی کریں' اور کونسلوں میں جانے کا کوئی خیال سامنے نہ لائیں۔ بہرحال اگر ہم چاہیں' تو انتخاب کے بعد کا پروگرام آج ہی بنا لے سکتے ہیں۔ چاہیں' تو اسے آئندہ سالانہ اجلاس پر موقوف کریں۔ یہ آخری صورت شاید زیادہ بہتر ہوگی۔ باہر کا کام کیا ہو؟ یہ سب سے زیادہ اہم چیز ہے اور اسی پر اس نئے گوشہ جنگ کا مفید ہونا موقوف ہے۔

اس بارے میں حسب ذیل امور پر آپ کو توجہ دلاؤں گا:

1- تعمیر پروگرام میں ہندو مسلم اتحاد کی تبلیغ کا کام ازسرنو شروع کرنا چاہیے۔ تفصیلات کی طرف میں ابھی آپ کو توجہ دلاؤں گا۔

2- ملک کی مزدور جماعتوں کی تنظیم جن سے غافل رہ کر ہم آئندہ کوئی کام نہیں

کر سکتے۔

3- عوام کی سیاسی تعلیم' تحریر و تقریر کے ذریعہ سے ہم کو اپنی جدوجہد کی گزشتہ سرگرمی میں تیاری' اتحاد اور مقابلہ سب کام بیک وقت کرنا پڑے' لیکن موجودہ وقفہ میں ہمیں اس سے غفلت نہیں کرنی چاہیے۔ ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ قومی اتحاد' نون کواپریشن' عدم تشدد اور سول ڈس اوبیڈینس کے اصول اور مقاصد عوام کے دلوں پر نقش کردیں۔ وہ اسے محض کسی مذہبی خوش اعتقادی کی بنا پر نہیں' بلکہ خالص جذبہ حب الوطنی سے اپنا فرض سمجھیں۔

بکثرت ہندوستانی زبانوں میں لٹریچر تیار کرکے تقسیم کرنا چاہیے۔ کانگریس کمیٹیوں کے ورکر (38) اور والسیر (39) قصبوں اور دیہاتوں میں دورہ کریں۔ ہر جگہ جم کر اسی طرح تعلیم دیں' گویا عارضی سیاسی تعلیم گاہیں ہر طرف کھل گئی ہیں۔ اس کام کا ایک پروگرام تین مہینے کا یا چھ مہینے کا بنالیا جائے۔ ہم اتنے عرصہ کے اندر تمام ملک کو ایک خاص مقصد کی تعلیم دے سکتے ہیں۔ اگر حکومت کی جانب سے اس میں رکاوٹیں ڈالی گئیں تو وہ ہمارے لیے اور زیادہ مفید ہوگا۔ عجب نہیں کہ اسی کے ذریعہ سے ہماری مطلوبہ فضا پیدا ہوجائے۔

4- تعمیری پروگرام کا بقیہ حصہ!

البتہ میں یہ بات بالکل صاف صاف عرض کردینا چاہتا ہوں کہ ہمارے لیے کونسلوں میں داخلہ کی صرف ایک ہی صورت صحیح ہوسکتی ہے اور وہ یہ ہے کہ کانگریس نہ صرف اس کی اجازت دے' بلکہ خود اس کی باگ اپنے ہاتھ میں لے۔ اگر آج آپ کا فیصلہ اس کے برخلاف ہو' تو جیسا کہ میں یہ تفصیل عرض کرچکا ہوں' پھر ہم میں سے کسی فرد یا جماعت کو بھی نہیں چاہیے کہ اس کے خلاف قدم اٹھائے۔ میں اس سے بالکل انکار کرتا ہوں کہ یہ کوئی ایسا معاملہ ہے' جس کے لیے ہم قومی نظام کی اطاعت سے باہر ہونے پر مجبور ہوسکتے ہیں۔ اگر آج بھی آپ کا فیصلہ یہ ہو کہ کونسلوں کے لیے نہیں کھڑا ہونا چاہیے' تو اس صورت میں میری رائے یہ ہوگی کہ بائیکاٹ کو داخلہ پر ترجیح ہے۔ کیونکہ ہمارے کام کے لیے اصلی چیز متحدہ جدوجہد ہے جو راہ ہم سب مل کر

اختیار کرسکتے ہیں' وہ متفرق قدم سے بہتر ہوگی۔ اور جب تک اصول اور اعتقاد کا سوال نہ آئے' ہمیں اپنے نظام کی اطاعت سے باہر نہ ہونا چاہیے۔

حضرات!

گیا کے موقعہ پر علمائے اسلام کی کانفرنس نے یہ رائے قائم کی تھی کہ مسلمانوں کو کونسلوں کے لیے کھڑے ہونے سے احتراز کرنا چاہیے۔ دراصل مذہبی نقطہ خیال سے ان کے سامنے ترک موالات کی اصل تھی اور جہاں تک طریق عمل کا سوال ہے' قدرتی طور پر انہیں ان تمام طریقوں سے انکار ہونا چاہیے' جن سے اصل کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ یہ بات کہ کونسلوں میں جانا اس کے لیے مفید ہے یا مضر' ایک ایسا معاملہ ہے' جس پر وہی لوگ رائے قائم کرسکتے ہیں' جنہیں ان معاملات کا تجربہ ہے' لیکن اس وقت خود ان لوگوں میں اختلاف تھا۔ پس ضرور تھا کہ حضرات علماء اسی پہلو کو اختیار کریں' جس میں احتیاط ہو۔ بصورت اختلاف احتیاط اسی میں تھی کہ احتراز کیا جائے۔ لیکن میں آپ کو اطمینان دلاتا ہوں کہ اگر آج آپ اس بارے میں ایک مطمئن فیصلہ کرلیں گے' تو پھر کوئی وجہ نہیں ہے کہ ان کی جانب سے اس معاملہ میں اصرار ہو۔

ہندو مسلم اتحاد

حضرات!

میں نے آپ کا اس قدر وقت درودیوار کی فکر میں لے لیا' حال آنکہ ابھی یہ بات باقی ہے کہ ہماری جدوجہد کی بنیاد کا کیا حال ہے۔ میرا اشارہ ہندو مسلم اتحاد کی طرف ہے۔ یہ ہماری تعمیرات کی وہ پہلی بنیاد ہے جس کے بغیر نہ صرف ہندوستان کی آزادی بلکہ ہندوستان کی وہ تمام باتیں جو کسی ملک کے زندہ رہنے اور ترقی کرنے کے لیے ہوسکتی ہیں' محض خواب و خیال ہیں' صرف یہی نہیں ہے کہ اس کے بغیر ہمیں قومی آزادی نہیں مل سکتی' بلکہ اس کے بغیر ہم انسانیت کے ابتدائی اصول بھی اپنے اندر نہیں پیدا کرسکتے۔ آج اگر ایک فرشتہ آسمان کی بدلیوں سے اتر آئے اور قطب مینار پر

کھڑے ہوکر یہ اعلان کردے کہ سوراج 24 گھنٹے کے اندر مل سکتا ہے' بشرطیکہ ہندوستان ہندو مسلم اتحاد سے دستبردار ہو جائے تو میں سوراج سے دستبردار ہو جاؤں گا' مگر اس سے دستبردار نہ ہوں گا' کیونکہ اگر سوراج کے ملنے میں تاخیر ہوئی' تو یہ ہندوستان کا نقصان ہوگا' لیکن اگر ہمارا اتحاد جاتا رہا' تو یہ عالم انسانیت کا نقصان ہے۔

ملک کی موجودہ حالت کیا ہے؟ کون ہے جو ہندوستان کے عشق و محبت کا ایک ذرہ بھی اپنے دل میں رکھتا ہو اور اسے صبر اور برداشت کے ساتھ دیکھ سکے۔ چار سال ہوئے کہ ہم نے قومی عزت و شرف کا ایک بڑے سے بڑا اعلان کیا اور دنیا سے کہا کہ وہ ہماری آزادی کا انتظار کرے۔ لیکن عین اس وقت جب کہ وہ ہماری آزادی کی داستان سننے کے لیے گوش بر آواز ہے' ہم آمادہ ہوگئے ہیں کہ اپنی غلامانہ شرمناکی اور اپنے مجنونانہ کشت و خون کی اس کے لیے کہانی ترتیب دیں۔ موجودہ حالت یہ ہے کہ سوراج اور خلافت کی جگہ شدھی کی تحریک' اس کی مدافعت اور سنگھٹن کا غلغلہ ہر طرف بپا ہے۔ ایک طرف سے کہا جارہا ہے کہ ہندوؤں کو مسلمانوں سے بچاؤ۔ دوسری طرف سے کہا جارہا ہے کہ اسلام کی لاج کی ہندوؤں کے حملہ سے حفاظت کرو۔ جب ہندوؤں اور مسلمانوں کی حفاظت کی پکار بلند ہورہی ہے' تو ظاہر ہے کہ یہ بدنصیب ہندوستان کی حفاظت کا ولولہ کب قائم رہ سکتا ہے۔ ایک طرف جلسوں اور اخباروں میں لوگوں کے اندر مجنونانہ مذہبی تعصبات ابھارے جارہے ہیں' دوسری طرف نادان اور فریب خوردہ عوام ہندوستان کی سڑکوں پر بیدریغ اپنا خون بہا رہے ہیں۔ اجمیر' میرٹھ' سہارن پور' آگرہ' پلول اور کہاں کہاں سخت فسادات ہو چکے اور کون کہہ سکتا ہے کہ آگے چل کر اس کے نتائج کس قدر افسوسناک ہوں گے۔

حضرات!

میں آج ان تمام لوگوں سے جو ان جذبات کی تبلیغ کررہے ہیں' صاف صاف کہنا چاہتا ہوں کہ یہ حالت ناقابل برداشت ہے۔ میں ایک قدم اور آگے بڑھتا ہوں۔ میں کہتا ہوں کہ ہم آزادی کی طرف جارہے ہیں' آپ ہمارا راستہ نہ روکیے! اگر آپ روکیں گے تو ہمارا فرض ہے کہ رکاوٹوں سے راستہ صاف کریں۔ میں آپ تمام

حضرات سے جو ملک کے گوشہ گوشہ سے آئے ہیں اور اپنے اندر ہندوستان کا دماغ اور ہندوستان کی زبان دونوں رکھتے ہیں' یہ عرض کروں گا کہ اگر آج آپ اس مسئلہ کا فیصلہ نہیں کرسکتے کہ نون کواپریٹرز کونسلوں میں جائیں یا نہیں' تو مضائقہ نہیں' لیکن خدارا آج اس کا فیصلہ کرکے یہاں سے اٹھیے کہ ہندوستان اپنی آزادی و نجات کی زخمی امیدوں کو بچائے رکھے' یا آگرہ اور سہارن پور کی خون آلود سرزمین میں دفن کردے! آج آپ کو صاف صاف اس بارے میں اپنا فیصلہ صادر کرنا چاہیے اور اپنی تمام قوتیں اس کے لیے صرف کردینی چاہئیں۔ اگر آپ ایک دن کے لیے بھی اسے برداشت کریں گے تو یقین کیجئے کہ برسوں کے لیے آپ کا سفر پیچھے پڑ جائے گا۔

فرقہ وار تنظیم

حضرات!

ابھی کچھ زیادہ مدت نہیں گزری کہ مسلمان بہ حیثیت ایک قوم کے کانگریس کی سیاسی حرکت میں شریک نہ تھے۔ مسلمانوں میں یہ جذبہ عام تھا کہ ہندوستان میں ان کی تعداد ہندوؤں سے بہت کم ہے' تعلیم اور دولت میں بھی ان سے پیچھے ہیں' اگر وہ کسی متحدہ حرکت میں شریک ہونگے' تو ان کی ہستی پامال ہو جائے گی' اسی خیال کا نتیجہ تھا کہ عرصہ تک ان کی قومی پالیسی یہ رہی کہ الگ رہ کر اپنی جماعتی تنظیم کی جائے۔

لیکن غالباً آپ میں سے وہ تمام حضرات جو گزشتہ بارہ سال کے اندر مسلمانوں کے جماعتی تغیرات کا مطالبہ کرتے رہے ہیں' اس سے واقف ہوں گے کہ 1912ء میں میری سب سے پہلی صدا تھی' جو اس طرزِ عمل کے برخلاف بلند ہوئی۔ میں نے اپنے ہم مذہبوں کو اس طرف بلایا کہ وہ علیحدگی کی پالیسی پر قائم رہ کر اپنی ہستی کو ملک کی آزادی کے خلاف استعمال کررہے ہیں۔ انھیں چاہیے کہ اپنے ہندو بھائیوں پر اعتماد کریں' کانگریس میں شریک ہوں' ملک کی آزادی کو اپنا نصب العین بنائیں' اور فرقہ وار تنظیم سے کنارہ کش ہو جائیں۔ اس وقت میری یہ پکار میرے تمام ہم مذہبوں پر شاق گزری۔ پوری قوت کے ساتھ میری مخالفت کی گئی۔ لیکن بالاخر وہ وقت بہت جلد آگیا' جب

مسلمانوں نے اس حقیقت کی سچائی کا اعتراف کیا۔ میں جب 1916ء میں رانچی میں نظر بند تھا' تو سن رہا تھا کہ جوق در جوق مسلمان کانگریس میں شریک ہو رہے ہیں۔

حضرات!

جس طرح میں نے 1912ء میں اپنے تمام ہم مذہبوں کے مسلک کے خلاف اپنی صدا بلند کی تھی اور ان کی مخالفت کا خوف مجھے اظہار حق سے نہ روک سکا تھا۔ ٹھیک اسی طرح آج میں اپنا پہلا فرض سمجھتا ہوں کہ ان تمام بھائیوں کے خلاف اپنی صدا بلند کروں' جو ہندو سنگھٹن کی تحریک کے علمبردار ہیں۔ میں حیرت سے یہ محسوس کر رہا ہوں کہ جو دماغی حالت اس وقت مسلمانوں کے سیاسی حلقوں کی تھی' ٹھیک وہی آج ان حضرات کی ہو رہی ہے۔ وہی دلائل آج بھی ہمیں سنائے جا رہے ہیں۔ وہی اسباب و بواعث آج بھی ان کی زبان پر ہیں۔ مسلمانوں کا یہ خیال اس کے ساتھ تھا کہ ان کی تعداد کم ہے اور آج یہ تحریک ان لوگوں کو برانگیختہ کرنا چاہتی ہے' جن کی تعداد مسلمانوں سے تین گنا زیادہ ہے۔ میں بلا کسی تامل کے صاف صاف کہنا چاہتا ہوں کہ آج ہمیں ہندوستان میں نہ کسی ہندو سنگھٹن کی ضرورت ہے' نہ مسلم سنگھٹن کی۔ ہمیں صرف ایک سنگھٹن کی ضرورت ہے اور وہ یہ "انڈین نیشنل کانگریس" ہے۔

میں اس وقت اس معاملہ کی تفصیلات میں نہیں جانا چاہتا ہوں۔ جو دلائل ان تحریکات کی تائید میں بیان کیے جاتے ہیں' مجھے ان کی صحت سے بالکل انکار ہے۔ کہا جاتا ہے کہ چونکہ فلاں سنہ میں فسادات ہوئے اور ان میں ایک فریق کا نقصان زیادہ ہوا' اس لیے ضروری ہے کہ وہ دوسرے فریق کے مقابلہ میں اپنا علیحدہ سنگھٹن کر لے۔

میں کہتا ہوں کہ اگر ایک لمحہ کے لیے بھی یہ طریق استدلال صحیح تسلیم کر لیا جائے' تو ہندوستان کی ہر جماعت اپنے نقصانات کی ایسی ہی ایک فہرست تیار کر سکتی ہے اور اس کے بعد سنگھٹن کا اعلان کر دے سکتی ہے۔ اگر بمبئی کے گزشتہ بیس سال کے واقعات پر نظر ڈالی جائے تو کئی فسادات ایسے ملیں گے جو خود مسلمانوں کے دو فرقوں میں ہوئے ہیں۔ اور ایک فرقے نے دوسرے کو اچھی طرح لوٹا اور قتل کیا ہے۔ البتہ میں اس بات کا صاف صاف اعلان کرنا چاہتا ہوں کہ ہندو مسلم اتحاد کے نئے دور کے

بعد' ملتان میں فساد کا ہونا اور وہاں کے مسلمان بلوائیوں کے ہاتھ سے ہندوؤں کو سخت نقصان کا پہنچنا' ایک ایسا افسوسناک حادثہ ہے جس پر ہر مسلمان کے دل پر زخم لگنا چاہیے۔ تاہم ہندوستان جیسے ملک میں جہاں کروڑوں انسان بستے ہیں' جو ابھی ابھی نئی زندگی کے دور میں داخل ہوئے ہیں' اور جہاں غلط مذہبی تعصب اور بے جا مذہبی جوش کا ابھر آنا کچھ دشوار نہیں ہے' ایسے حوادث ناممکن نہیں کر دیے جا سکتے۔ اس کا صحیح علاج صرف یہی ہے کہ ملک کے دیگر طبقات اس کی وجہ سے فریقانہ جذبہ پیدا نہ کرلیں۔ جس کی زیادتی ہو اسے ملامت کی جائے' جس پر ظلم ہوا ہو اس سے ہمدردی کی جائے۔ یہ علاج نہیں ہے کہ ایک مقامی معاملہ کو طول دے کر اور تمام ملک اور فرقہ کا مسئلہ بنا کر کسی ایک فریق کو مقابلہ کی دعوت دی جائے۔ پھر دوسرا فریق بھی نئی نئی تیاریاں کرے اور اس طرح ختم نہ ہونے والی جنگ قائم ہو جائے۔

میں اس سے انکار نہیں کرتا کہ ہندوستان کی ہر جماعت کو اپنی اندرونی اصلاح و درستگی کے بیشمار کام درپیش ہیں اور ضروری ہے کہ ہر جماعت اپنی اپنی جگہ اپنی کمزوریوں کو دور کرنے کے لیے کوشش کرے' لیکن میں اس سے قطعاً" انکار کرتا ہوں کہ کوئی ایسی تحریک اس حالت میں قائم ہو سکتی ہے جب کہ اس کا خمیر فرقہ وار فسادات اور باہمی جنگ کے خون سے مہیا کیا گیا ہو۔

ان تحریکات کے بعض ذمہ دار حضرات یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ ہندو مسلم اتحاد کے مخالف نہیں ہے۔ اس لیے کہ وہ ہمیشہ مقابلہ کا وعظ کہہ کر آخر میں اتحاد و محبت کا بھی پیغام سنا دیتے ہیں۔ ان حضرات سے کہوں گا کہ آپ نے ہمیں غلط راستہ کی طرف بلایا ہے۔ لیکن اب فطرت انسانی کے انکار کی دعوت نہ دیجئے۔ حضرت مسیح نے دنیا سے کہا کہ دشمنوں کو بخش (39) دو۔ مگر دنیا آج تک دوستوں کو بھی بخش نہ سکی۔ کیا آپ چاہتے ہیں کہ ایک طرف انتقام اور مقابلہ کا جذبہ مشتعل کرکے' دوسری طرف محبت و اتحاد کا کارخانہ بھی قائم رکھیں۔

اسی طرح میں شدھی کی تحریک کی نسبت یہی عرض کروں گا کہ اگرچہ ہم کاغذ پر سیاست کی متحدہ تحریک اور مذہب کی فرقہ وار کشمکش کو دو مختلف خانوں میں رکھ سکتے

ہیں' لیکن عمل میں کوئی ایسی تفریق قائم نہیں رہ سکتی۔ ہمیں متحدہ قومیت کی ضرورت ہے اور ہم جانتے ہیں کہ اگر ہندوستان میں ایک طرف سے ملیچھ اور دوسری طرف سے کافر کی صدائیں اٹھتی رہیں گی' تو محال ہے کہ وہ رواداری پیدا ہو سکے' جس کے بغیر اتحاد کا وجود قائم ہی نہیں رہ سکتا۔

حضرات!

میں ملک کی تمام جماعتوں سے عرض کرونگا کہ انہیں ایک مرتبہ ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ کرلینا چاہیے۔ اگر وہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان آزادی و نجات حاصل کرے' تو پھر انہیں اور تمام کام اس کے لیے ملتوی کرنے ہی پڑیں گے۔ خواہ وہ کام انہیں کتنے ہی محبوب ہوں لیکن اس کے سوا چارہ نہیں۔

میں آج اس پلیٹ فارم سے جو ہندوستان کی متحدہ قومیت کا گہوارہ ہے۔ تمام ہندو مسلمانوں سے وطن کے نام پر اپیل کرتا ہوں کہ وہ اس کی امیدوں کو اس بے دردی کے ساتھ پامال نہ کریں' اور بلا اس بحث کے کہ اب تک کیا ہو چکا ہے۔ آئندہ کے لیے ان تمام سرگرمیوں کو بند کر دیں جو شدھی موومنٹ (41)' اس کی مدافعت اور فرقہ وار تحریکوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ اگر بند کر دینے کے لفظ سے وہ متفق نہیں ہو سکتے' تو کم از کم ملتوی کردیں۔ اگر وہ ایسا کریں گے تو نہ صرف اپنے وطن کی بلکہ تمام عالم انسانیت کی ایک سب سے بڑی خدمت انجام دیں گے۔

ہندوستان کا میثاق ملی

حضرات!

اس سلسلے میں مجھے یہ بھی یاد دلانے دیجئے کہ اب ہمیں اس باب میں تساہل نہیں کرنا چاہیے کہ ہندوستان کے لیے ایک ایسا میثاق قومی تیار ہو جائے جو نہ صرف ہمارے قومی نصب العین کو ہمیشہ کے لیے صاف اور واضح کر دے بلکہ ہندوستان کی مختلف جماعتوں کے باہمی علائق اور روزمرہ کے پیش آنے والے جھگڑوں کا بھی فیصلہ کر دے۔ اس اعتبار سے ہندوستان ایک عجیب ملک ہے۔ بہت ممکن ہے کہ تیس کروڑ

انسانوں کی آزادی صرف اس لیے تاخیر میں پڑ جائے کہ کسی مسجد کے سامنے سے ایک جلوس ڈھول بجاتا ہوا گزر گیا' یا کسی راستہ کے درخت کی شاخ کاٹ ڈالی گئی۔ پس جب ملک کی مصیبتوں کی نوعیت کا یہ حال ہے تو ہمیں ان مسائل کے قطعی اور دائمی فیصلہ میں تاخیر نہیں کرنی چاہیے۔ میں امید کرتا ہوں کہ آپ اس مسئلہ پر بھی غور فرمائیں گے۔ بہتر ہوگا کہ منتخب افراد کی ایک کمیٹی اس غرض سے مقرر کر دی جائے اور آئندہ اجلاس سے پہلے ایک مسودہ تیار کر لے۔

خاتمہ

حضرات! قوموں کے تمام بڑے دنوں کی طرح آج کے دن کے نتائج بھی دو انتہائی قسموں میں منقسم ہیں' آج ہم بہت بڑی کامیابی بھی حاصل کرسکتے ہیں اور بہت بڑی ناکامی بھی ہمارے حصے میں آسکتی ہے۔ ہمارے عزم' ہمارے ثبات اور ہماری حب الوطنی کے لیے آج بہت بڑی آزمائش درپیش ہے۔ آیئے! اس پر غالب آئیں اور اپنی قسمت کی تعمیر میں لگ جائیں۔

آل انڈیا خلافت کانفرنس

کانپور' 29 دسمبر 1925ء

حضرات!

یہ دوسرا موقعہ ہے کہ آپ نے خلافت کانفرنس کی صدارت کے لیے مجھے منتخب فرمایا ہے۔ پہلی مرتبہ 1920ء میں جب اس کا اجلاس ناگپور میں ہوا تھا' آپ نے یہی خدمت میرے سپرد کی تھی۔ اب پانچ سال کے بعد دوبارہ مجھے موقعہ دیا ہے کہ آپ کے اعتماد اور محبت کا شکریہ ادا کروں۔

پنج سالہ گردش حوادث

پانچ سال کی یہ مدت انسانی عمر کی کوئی بڑی مدت نہیں۔ زمانہ کی غیر معلوم مگر طویل عظیم عمر کا تصور کیجئے' تو یہ پانچ برس اس کے ناپیدا کنار سمندر میں ایک قطرہ سے زیادہ ہستی نہیں رکھتے۔ تاہم غور کیجئے' تو نظام شمسی کی انہی پانچ گردشوں کے اندر انقلاب و تغیر کی کتنی گردشیں دنیا پر گزر چکی ہیں۔ انقلاب کا ایک کامل دور ہے' جو ذہن اور جسم کے ہر گوشہ میں طاری ہے۔ جنگ عظیم گویا اس انقلاب کی پکار تھی۔ اب خود انقلاب تیزی کے ساتھ بڑھتا رہا ہے۔ ماضی کے نتائج ایک نئے مستقبل کے لیے ڈھل رہے ہیں اور مستقبل جلد جلد اپنے آثار و علائم بھیج رہا ہے۔

عالم اسلامی کے تغیرات

آج اس محل میں ہماری بحث و نظر کا دائرہ ہندوستان اور عالم اسلامی کے اندر محدود ہے، لیکن جغرافیہ عالم کے ان گوشوں کے حوادث بھی اس کے لیے کافی ہیں کہ ایک انقلاب انگیز عہد تاریخی خواص ان میں تلاش کیے جائیں۔

جدید ترکی کا ظہور اور نشوونما' مصر کی سیاسی حرکت کا اتار چڑھاؤ' مشرق میں یورپ کے طامعانہ استعمار کا نیا دور' عراق' شام اور فلسطین کی انگریزی فرانسیسی حکم برداری' عثمانی خلافت کا اختتام' خاندان عثمانی کا ترکی سے اخراج' شمالی افریقہ میں امیر محمد بن عبدالکریم کی پے در پے فتح مندیاں' حجاز کی ناگہانی اور فوری تغیرات' شریف حسین کی خودساختہ امارت کا خاتمہ' امیر ابن سعود کا داخلہ حجاز' جزیرۃ العرب میں ایک نئی سیاسی صورت حال کی پیدائش' شام میں قومی حرکت کا طاقتور ظہور' خاندان قاچاریہ کا خاتمہ اور پہلوی شاہیت کا قیام' یہ اور اسی طرح کے کتنے ہی واقعات ہیں جو اس قلیل عرصہ کے اندر گزر چکے ہیں۔ اور گو ان کی انقلابی اہمیت ہم نے اپنی روزانہ زندگی کی مشغولیت میں محسوس نہ کی ہو۔ لیکن تاریخ ان کے اندر قرنوں اور صدیوں کے تغیرات کا سراغ لگائے گی۔

ملک کے داخلی تغیرات

یہ تو ہماری دلچسپی کا بیرونی منظر تھا' لیکن ہم کسی حال میں بھی یہ حقیقت فراموش نہیں کرسکتے کہ ہمارے لیے زندگی اور سرگرمی کی اصلی جگہ خود اپنی سرزمین اور وطن ہی ہے۔ غور کیجئے! اس پانچ سال کے اندر یہاں کی دماغی و جماعتی حالت میں بھی کیسی کیسی تبدیلیاں ہو چکی ہیں۔ نہیں کہا جا سکتا' ہمارے ملک کے مستقبل میں ان کے اثرات کیا کیا اور کس کس طرح کام دیں گے۔ خلافت کی حرکت کے ساتھ ہی ملک کی آزادی و استقلال کی جو متحدہ حرکت شروع ہوئی تھی اور جس کی خصوصیتوں نے بہت جلد دنیا کی توجہ اور دلچسپی حاصل کرلی تھی۔ ایک خاص منزل تک پہنچ کر رک گئی اور اس کے بعد اس کے ردفعل (ری ایکشن) (1) کے اثرات نہایت تیزی کے ساتھ ظاہر

ہونا شروع ہوگئے۔ اب سرگرمی کی جگہ افسردگی ہے۔ بیداری کی جگہ غفلت ہے۔ اتحاد کی جگہ انتشار ہے۔ ملک و قوم کی جگہ فرقہ اور جماعت کی صدائیں ہیں اور کام کی رہی سہی قوتوں کے لیے نئے نئے گمراہ کرنے والے فتنے پیدا ہورہے ہیں۔ ہندوستان کے موجودہ منظر کا سب سے زیادہ اور دردانگیز پہلو اس وقت نمایاں ہوتا ہے جب مشرقی ممالک کے موجودہ تغیرات کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا جائے جب کہ مشرق کی تبدیلیاں آزادی اور ترقی کی طرف جاری ہیں۔ تو ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارا ملک قدم اٹھا کر صرف تھک ہی نہیں گیا ہے' بلکہ واپسی کے لیے پیچھے دیکھ رہا ہے۔ افریقہ کے مٹھی بھر قبائل جس آزادی کی حفاظت کی راہ میں فرانس اور اسپین کی متحدہ طاقت کو پے در پے شکستیں دے سکتے ہیں اس کے لیے ہندوستان اپنی اتنی وسیع آبادی کے ساتھ جو موجودہ نسل انسانی کا پانچواں حصہ ہے' اپنی جہالت و غفلت کو بھی شکست نہیں دے سکتا۔ ہندوستان کی طرح شام میں بھی مختلف مذاہب اور نسل کی مشترکہ آبادی ہے۔ وہاں کے دروزی قبائل' عام مسلمان اور مسیحی جماعتیں صدیوں سے باہم دگر قتل و غارت میں سرگرم رہی ہیں۔ مسلمانوں اور مسیحیوں کے مذہبی اختلافات کے لیے صرف صلیبی لڑائیوں ہی کا افسانہ کافی ہے' جس کے آٹھ خونی سیلاب اسی سرزمین میں بہہ بہہ کر خشک ہو چکے ہیں۔ تاہم آج اپنے ملک کی آزادی کے لیے ان سب کا متحدہ نعرہ یہ ہے الدین للواحد والوطن للجمیع۔ (2) وطن سب کے لیے ہے۔ اور ہر شخص کا دین اس کے لیے ہے۔ لیکن ہندوستان کا حال کیا ہے؟ یہ ہے کہ اس کی بہترین تعلیمی اور سیاسی پیداوار بھی آج اس حد تک جانے کے لیے تیار نہیں۔ مذہبی منافرت' جماعتی تعصب' فرقہ وارانہ تنگ دلی' اور محکومانہ ذہنیت کے تمام مفاسد ہماری راہ بدستور روکے کھڑے ہیں۔

مسلمانان ہند

جہاں تک مسلمانان ہند کی جماعتی زندگی کا تعلق ہے' 1920ء کی ابتداء سے 1925ء کا خاتمہ ہر اعتبار سے مختلف ہے۔ اگر انہیں دو مخالف سمتوں سے تعبیر کیا

جائے' تو مبالغہ نہ ہوگا۔ گزشتہ حرکت کا سب سے زیادہ نمایاں اور موثر پہلو یہ تھا کہ مسلمانوں میں متحدہ مقصد کے لیے متحدہ جدوجہد کی سرگرمی پیدا ہوئی۔ ان کی پراگندگی نظم و انضباط سے آشنا ہوئی۔ انہوں نے ہندوستان کے موجودہ دور میں پہلی مرتبہ مقصد' قوم' فرض اور ایثار کی راہ میں قدم اٹھایا۔ مختلف اسباب سے جن کی تشریح کا یہ موقعہ نہیں' وہ ملک کی سرگرمی میں اپنے برادران وطن سے بہت پیچھے تھے۔ اس حرکت نے مسلمانوں کے قدم بھی میدان جنگ کی طرف اٹھا دیئے۔ لیکن موجودہ حالت بالکل اس سے متضاد ہے۔ گزشتہ حرکت جو پوری تیزی کے ساتھ جاری تھی' اچانک رک گئی اور اس کے صدمے سے ان کی جمعیت بھی بکھر گئی۔ اب نظم اور انضباط کی جگہ ہر طرف پراگندگی ہے۔ افکار پریشان ہیں۔ طبیعتیں غیر مطمئن ہیں۔ یقین اور اعتماد ہل گیا ہے اور لوگ محسوس کررہے ہیں کہ کوئی راستہ ان کے سامنے موجود نہیں۔ عام طور پر ملک میں غفلت و گمرہی کی جو آب و ہوا پیدا ہوگئی ہے' وہ خود بھی اسی میں بہہ رہے ہیں اور حالات کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ اس سے الگ ہوکر اپنے فکر و دماغ کی درستی کی انہیں مہلت نہیں ملتی۔ اگر فکر و اعتقاد کی کوئی قوی اور بالاتر روشنی موجود نہ ہو' تو اس تاریکی کا لازمی نتیجہ سرگردانی اور حیرانی ہے۔ چنانچہ یہ سرگردانی ہر طرف دکھائی دے رہی ہے بہت سے لوگ کسی غیر معلوم اور غیر معین راہ کی جستجو میں ہیں۔ وہ کہتے ہیں کوئی نیا قدم اٹھانا چاہیے۔ لیکن کس طرف اور کس طرح؟ اسکا جواب خود انہیں معلوم نہیں۔ جب کہ عام حالت ایسی ہورہی ہے تو کچھ تعجب انگیز نہیں' اگر جا بجا جہل و فساد کے سوئے ہوئے فتنے بھی بیدار ہوگئے ہیں۔

موجودہ حالت قدرتی ہے

حضرات!

یہ تمام صورت حال کیسی ہی افسوسناک کیوں نہ ہو' لیکن یقین کیجئے' ان قدرتی قوانین کے ماتحت کچھ بھی تعجب انگیز نہیں ہے' جو افراد کی طرح قوموں اور جماعتوں کے لیے بھی اس دنیا میں نافذ ہیں۔ یہ علم و حقیقت کا صریح انکار ہوگا' اگر ہم مرعوب

ہو کر سراسیمہ ہو جائیں جس طرح ایک فرد پر اس کے جسم و دماغ کی مختلف حالتیں طاری ہوتی ہیں اور وہ حالتیں اس درجہ عام اور یکساں ہیں کہ ان کا علم و احساس کم و بیش ہر انسان میں موجود ہے۔ جسم کی صحت اور بیماریاں' دماغ کا نظم اور اختلال' جذبات کا سکون اور ہیجان' ہمارے لیے زندگی کے عام اور قدرتی حالات ہیں۔ ٹھیک یہی حال قوموں اور جماعتوں کا بھی ہے۔ ان کا بھی ایک مجموعی اور نوعی دماغ ہے اور اس کے لیے بھی نظم و اختلال اور سکون و ہیجان کی مختلف حالتیں ہیں۔ البتہ فرد کی زندگی شب و روز ہم پر گزر رہی ہے اور ہمارے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے۔ اس لیے ہم اس کے اندر قوانین زندگی کی کارفرمائی محسوس کر رہے ہیں۔ مگر قوموں اور جماعتوں کی نوعی زندگی کے تغیرات کی رفتار بہت ہی سست ہے۔ گھنٹے کی سوئی کی طرح اس کی حرکت مشاہدہ میں نہیں آتی۔ اگرچہ منٹ کی سوئی کی طرح وہ بھی متحرک ہے۔ تغیر کے ایک نقطہ سے لے کر دوسرے نقطہ تک پہنچنے کے لیے بسااوقات انھیں قرنوں اور صدیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر ہمارا محدود و ناقص علم اس گوشہ کا بھی احاطہ کر سکتا' تو ہم قوموں اور جماعتوں کے تمام احوال کو اسی نظر سے دیکھتے' جس نظر سے ایک طبیب بیمار کا جسم اور ایک حکیم انسان کے دماغی خواص دیکھتا ہے۔

مایوسی کی کوئی وجہ نہیں

ہندوستان کے اس پورے آباد رقبہ کو ایک فرد کی طرح تصور کیجئے اور مجھے جواب دیجئے کہ کائنات ہستی کے اس وجود کو بھی وہ سب کچھ کیوں نہ پیش آئے' جو ہمیشہ ان حالات اور ان ظروف میں پیش آتا رہا ہے۔ اور جب تک خالق کائنات کی مرضی ہوگی' پیش آتا رہے گا۔ یہ وجود بیمار ہے اور تندرستی حاصل کرنی ہے۔ بیماری کے اسباب ایک نہیں بے شمار ہیں۔ نئے نہیں' پرانے ہیں۔ صرف بیرونی نہیں' اندرونی بھی ہیں۔ ضروری ہے کہ ان سب کے نتائج ظاہر ہوں اور ناگزیر ہے کہ بار بار اتار چڑھاؤ پیش آئے۔ بیماری اگر پرانی اور تمام اعضاء میں پھیلی ہوئی ہے تو علاج کی کوششوں کو بھی اسی مناسبت سے اپنے اندر صبر اور برداشت پیدا کرنی چاہیے۔ کیوں ہم علاج کی کسی

ایک کوشش کی ناکامی یا بیماری کا کوئی ایک سخت ظہور دیکھ کر گھبرا جائیں؟ اگر علاج منظور ہے تو ہمیں ایک طبیب کے علم اور ایک تیمار دار کی برداشت کے ساتھ اس وقت تک کام جاری رکھنا پڑے گا' جو حکمت الٰہی نے اس کے لیے مقرر کر دیا ہے۔ ہم ایک فرد کی معمولی سی بیماری کے لیے بھی یہ حکم نہیں لگا سکتے کہ وہ کب تک تندرست ہو جائے گا' باوجودیکہ جسمانی صحت کے قوانین ہم نے منضبط کر لیے ہیں۔ پھر ہم ایک پوری قوم کے علاج میں کسی ایسے معجزانہ نتیجہ کے کیوں منتظر ہوں؟ اور ایک ابتدائی کوشش کی ناکامی یا نتیجہ کی تاخیر کیوں ہمیں سراسیمہ کر دے؟ ہم مرض کی کہنگی اور شدت پر غمگین ہوں گے' لیکن صحت کی طلب میں ہمارے جو عقائد اور یقین ہیں' ان سے دستبردار نہیں ہو سکتے۔

مسئلہ ہند کے اصول و عقائد

حضرات!

یقیناً ملک کی موجودہ صورت حال ہر محب وطن کے لیے انتہائی غم گینی کا سامان ہے لیکن میں پوری سنجیدگی کے ساتھ اس پر اپنی حیرت ظاہر کروں گا کہ مایوسی' انقلاب' عقائد کا سامان کیوں ہو؟ کیا ہم نے ملک اور قوم کی نجات و ترقی کی راہ میں قدم نہیں اٹھایا ہے؟ کیا کروڑوں انسانوں کے ذہن و عمل کے انقلاب کا عظیم و گرانبار کام ہمیں درپیش نہیں؟ کیا مذہب' تاریخ' زبان' رسم و رواج' تہذیب اور معاشرت کے گہرے اختلافات اور جہل و غفلت کی بیشمار خرابیاں ہماری راہ میں حائل نہیں؟ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ مرض صدیوں سے موجود ہے اور علاج کی عمر چند برسوں سے زائد نہیں؟ یہ چند برس بھی قومی زندگی کے لیے زیادہ سے زیادہ چند ایام ہیں۔ اگر ان صاف اور سادہ سوالات کا جواب اثبات میں ہے' تو ضروری ہے کہ ہمارے سامنے اعتقاد' یقین اور علم کی روشنی موجود ہو۔ ہم نے ایک بے خبر اور ناآشنا آدمی کی طرح قدم نہ اٹھایا ہو' جسے راہ کی ہر مشکل متحیر کر دیتی ہے اور ہر رکاوٹ پر وہ ہمت ہار کر بیٹھ رہتا ہے۔ حالات کی تبدیلی' کوششوں کی ناکامی' مشکلوں اور رکاوٹوں کی کثرت ہے' تو ہماری

کوششوں کی صورت اور مقدار میں تبدیلی ہونی چاہیے۔ لیکن ہمارے عقائد اور اصول کیوں بدلیں؟ اگر ہندوستان کی نجات کی راہ میں غفلت و فساد نے نئی نئی رکاوٹیں پیدا کر دی ہیں' تو اس کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ ہم اعتراف کرلیں کہ اب منزل زیادہ دور ہوگئی اور کام اس سے کہیں زیادہ ہے' جس قدر ہم نے سمجھ رکھا تھا۔ لیکن یہ نتیجہ تو نہیں ہونا چاہیے کہ آزادی ہمارے لیے غیر ضروری ہو جائے۔ غلام کی زندگی پر ہم قانع ہو جائیں! اور اس کی پہلی شرط یعنی باہمی جنگ و پیکار کا فیصلہ کرلیں! علم اور روشنی کے ہر کام کی طرح ضروری ہے کہ اس راہ میں بھی ہمارے سامنے کچھ بنیادی اصول ہوں۔ اگر وہ موجود ہیں تو اصول میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔

درمیانی وقفہ اور دعوت عمل

حضرات!

حقیقت حال یہ ہے کہ ہماری سرگرمی کا ایک دور ختم ہو چکا ہے' مگر دوسرا ابھی شروع نہیں ہوا۔ اس لیے درمیانی وقفہ کی اداسی اور پریشان حالی ہر طرف پھیلی ہوئی ہے۔ ضروری ہے کہ جلد از جلد ایک نیا دور شروع ہو۔ اور ہم ازسرنو تمام بکھری ہوئی قوتیں کسی ایک مرکز پر جمع کرلیں۔ ہمیں چاہیے کہ نہ تو گزشتہ پر ماتم کریں' نہ حال کے ہمت شکن نظاروں سے افسردہ ہوں۔ بلکہ قدم اٹھائیں اور امید کے ایک نئے آغاز پر دستک دے دیں:

تفاوت ست میان شنیدن من و تو
تو بستن در و من فتح باب میشنوم

حضرات!

ایک ایسے وقت میں آپ نے مجھے دوبارہ صدا دی ہے۔ آپ میں سے اکثر احباب اس بات سے بے خبر نہ ہوں گے کہ میں کئی سال سے اس کوشش میں ہوں کہ صرف اپنی قلمی مشغولیت ہی کے لیے وقف ہو جاؤں۔ میری طبیعت کا یہ میلان محض میرے ذوق طلب ہی کا تقاضا نہیں' بلکہ میرا یقین ہے کہ میرے لیے وقت کی تمام قومی خدمات

میں یہی خدمت سب سے زیادہ ضروری اور اہم ہے۔ گزشتہ پانچ سال کے اندر میں نے بار بار کوشش کی کہ قومی مجالس کی سرگرمیوں کے ساتھ یہ کام بھی جاری رکھوں۔ لیکن تجربے سے معلوم ہوگیا کہ بغیر یکسوئی کے ممکن نہیں۔ بالآخر مجبور ہو کر فیصلہ کرنا پڑا کہ ان سرگرمیوں سے بالفعل کنارہ کش ہو جانا چاہیے۔ اور اگر ان میں حصہ لینا بھی چاہیے' تو صرف اسی حد تک جہاں تک میری قلمی مشغولیت کا ضروری انہماک اجازت دے۔ اس حالت کا یہ قدرتی نتیجہ تھا کہ مجھے اس نئی ذمہ داری کی قبولیت میں تامل ہوتا ہے۔ مجھے تامل ہوا۔ لیکن بالآخر جب میں نے گردوپیش پر نظر ڈالی' تو اس کے سوا چارہ نظر نہ آیا کہ اپنے فیصلہ پر وقت کے تقاضا کو ترجیح دوں اور تسلیم کرلوں کہ ہم خدمت گزاران قوم کے لیے اصلی فیصلہ وہی ہے' جو وقت کا فیصلہ ہو۔ ہمیں پسند اور اختیار کی بہت سی چیزوں کی طرح اپنے فیصلہ کے حق ترجیح سے بھی دستبردار ہونا چاہیے۔ چنانچہ میں نے آپ کی دعوت منظور کرلی۔ اور اس وقت آپ کے سامنے موجود ہوں۔ آیئے' اپنی طلب و سعی کا سفر از سرنو شروع کر دیں۔ ہمارا سفر قوموں اور ملکوں کا سفر ہے۔ ہمیں انسانی اولوالعزمی اور فیروزمندی کی طرف جانا ہے۔ ہمیں اپنی گم گشتہ سعادت کا سراغ لگانا ہے۔ ہمیں اپنی راہ سے بیشمار رکاوٹیں دور کرنی ہیں۔ ہمیں خطروں اور مصیبتوں کے بیاباں طے کرنے ہیں۔ خدارا مجھے جواب دیجئے۔' کیا ایسے عظیم و گرانبار مقصد کے لیے راہ کی درازی اور سفر کی تھکن محسوس کی جا سکتی ہے؟ ہم ابھی چلے ہی کتنے ہیں کہ ستانے کے لیے بیٹھ جائیں؟ ہماری یہ چند برسوں کی حرکت' قوموں کے سفر کے لیے بمشکل چند قدم تھی۔ اگر ہمیں موت سے زندگی' پستی سے بلندی اور ذلت سے شرف و عظمت کی طرف پلٹنا ہے' تو ہمیں نہیں معلوم ایسے کتنے ہی سفر پیش آئیں گے اور ہر مرتبہ ہمیں نئے عزم اور تازہ ہمت کے ساتھ اٹھنا اور بڑھنا پڑے گا۔ اگر ہم مقصود سے غافل نہ ہوں اور صرف سفر ہی جاری رکھیں' تو یقین کیجئے اس راہ میں چلتے رہنا ہی بجائے خود مقصود ہے:

رہروان راخستگی راہ نیست
عشق ہم راہ ست و ہم خود منزل ست

کیا ہم فی الحقیقت بڑھنے کے لیے تیار ہیں؟ میں سمجھتا ہوں' اس کا صحیح جواب وہ نہ ہوگا' جو آج ہماری زبانیں دیں گی' بلکہ وہ ہوگا' جو سال آیندہ کے خاتمہ پر ہماری صورت حال دے سکے گی۔ اب ہمیں اعلان و دعویٰ ختم کر دینا چاہیے اور عمل کے لیے مستعد ہو جانا چاہیے۔

وقت کے مباحث

حضرات!

اس قدر تمہیدی کلمات ناگزیر تھے۔ اب آپ اجازت دیں کہ پیش نظر مسائل کی طرف متوجہ ہوں۔ مجھے جو کچھ عرض کرنا ہے' وہ نہایت مختصر ہے۔ میں چاہتا ہوں' جہاں تک ممکن ہو' آپ رسم و نمائش کی جگہ حقیقت اور عمل کی طرف متوجہ ہوں۔ میری جانب سے اس راہ میں پہلا قدم یہ ہے کہ خطبہ صدارت کے روایتی امتیاز و نمائش سے اپنی دستبرداری کا اعلان کرتا ہوں۔ یہ سالانہ تصنیف و انشا پردازی کی پرتکلف نمائش ممکن ہے' ملک کے ادبی ذخیرہ میں کچھ اضافہ کا موجب ہوتی ہو۔ لیکن اپنے محل اور وقت کے لیے تو قطعاً" غیر ضروری ہے۔ اس کا غیر ضروری ہونا ہی اس کی ناموزنیت کے لیے کافی تھا۔ لیکن اس کے سننے کا بوجھ حاضرین کے لیے کس درجہ ناقابل برداشت ہو جاتا ہے۔ جب کہ وہ غیر دلچسپ بھی ہوتا ہے۔ ایک تحریر جو لکھی ہوئی اور چھپی ہوئی موجود ہوتی ہے اور جسے ہر شخص اپنی فرصت کے اوقات میں پڑھ سکتا ہے' صرف اس لیے تین تین اور چار چار گھنٹہ تک پڑھی جاتی ہے' تاکہ کسی نہ کسی طرح ایک رسم پوری کر دی جائے۔ میں نے قومی مجالس کی اس وقت کی تلخی ہمیشہ محسوس کی ہے اور میں اسے گوارا نہیں کروں گا کہ خود بھی آپ کے لیے اس تلخی کا موجب بنوں۔ بلا شبہ میں محسوس کرتا ہوں کہ وقت کے متعدد مسائل بحث و بیان کے مستحق ہیں۔ لیکن میں کوئی وجہ نہیں پاتا کہ اس قومی مجلس کا وقت جو نظر و بحث کے لیے نہیں' بلکہ عملی تدابیر کے لیے ہے' ان مباحث کے لیے کیوں حاصل کروں! اخبار و رسائل کے ذریعہ تحریر و اشاعت کا موقعہ ہمیشہ حاصل رہا ہے۔ پس یہاں مجھے آپ سے

جو کچھ کہنا ہے' وہ صرف یہ ہے کہ آئندہ بارہ مہینے کے لیے ہماری جدوجہد کا پروگرام کیا ہونا چاہیے۔

سال رواں کے بعض حوادث

لیکن حضرات! خواہ ہم وقت کے احتساب میں کتنی ہی سختی کریں' تاہم سال رواں کے بعض حوادث ایسے اہم ہیں جن کی یاد سے اپنے دلوں کو اس وقت نہیں روک سکیں گے۔ دیش بندھو چترنجن داس کی وفات ہمارے ملک کا ایک نقصان عظیم ہے۔ وہ ملک کے ان سیاسی رہنماؤں میں سے ایک تھے' جن کی ذات ہر ملک و قوم کے لیے موجب فخر ہو سکتی ہے۔ ان کی رہنمائی سے ملک ایسے وقت میں محروم ہوا' جب کہ ان کے تدبر' حب الوطنی اور متحدہ قومیت کے سچے اور مضبوط اعتقاد کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔ سریندر ناتھ بنرجی کے انتقال سے بھی ہندوستان کی سیاسی شخصیتوں میں سے ایک دوسری شخصیت کی جگہ خالی ہو گئی۔ انہوں نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں کیسا ہی مسلک اختیار کیا ہو' تاہم ملک کی سیاسی زندگی کی پیدائش میں ان کی طویل خدمات تاریخ ہند میں اپنی جگہ حاصل کر چکی ہیں۔ سال رواں میں ملک کا موجودہ نظام حکومت بدستور اپنے جابرانہ خواص کی نمائش میں سرگرم رہا اور ہندوستان اپنی غلامانہ زندگی کی بے بسی برابر محسوس کرتا رہا۔ جنوبی افریقہ میں ایشیاٹک بل کا معاملہ اس حقیقت کا ایک تازہ ثبوت بہم پہنچاتا ہے کہ ہندوستان کی غلامانہ زندگی نے اس کے فرزندوں کی ذلت و مصیبت آخری درجہ تک پہنچا دی ہے اور یورپ کا نسلی تعصب نوع انسانی کے قدرتی حقوق کے خلاف دنیا کی ایک عالمگیر مصیبت ہے۔ ایسی حالت میں ہندوستان کا ایک دن کے لیے بھی اپنی غلامی پر قانع رہنا فی الحقیقت کسی قوم کی غلامانہ برداشت کی انتہا ہے۔ افسوس کہ ہمیں معلوم نہیں' ہماری بدبختی کی یہ برداشت کب تک جاری رہے گی۔ میں امید کرتا ہوں۔ اس وقت ہم میں ہمارے جنوبی افریقہ کے بھائیوں کا وفد موجود ہے۔ میں آپ کی جانب سے انہیں یقین دلاؤں گا کہ ہم اگرچہ اپنی بدقسمتی کی وجہ سے آج بیدست و پا ہیں' تاہم ہم میں ایک فرد بھی ایسا نہیں ہے' جو

اپنے سمندر پار بھائیوں کی اس مصیبت کے احساس سے خالی ہو۔ ہم ان کی جدوجہد میں اپنی تمام ممکن قوتوں کے ساتھ شریک ہیں۔

حضرات!

ہندوستان سے باہر کے بعض تازہ حوادث بھی نہ صرف سال رواں میں' بلکہ اس پورے دور میں اپنے آثار و نتائج کے اعتبار سے یادگار رہیں گے۔ عنقریب تاریخ مختلف عنوانوں سے ان کی داستانیں مرتب کرے گی۔

بالآخر موصل کے قضیہ کا نام نہاد مجلس اقوام نے فیصلہ کر دیا۔ یہ مجلس برطانیہ اور فرانس کی وزارتوں کا جنیوا میں ایک نیا دفتر ہے۔ اس لیے اس کا فیصلہ انصاف کے کتنے ہی خلاف ہو' لیکن توقع کے خلاف نہیں ہے۔ امید نہیں' ترکی حکومت اس صریح جبرونا انصافی کو جو اس کی ترکی آبادی و رقبہ کا ایک اہم ٹکڑا اس سے الگ کر دیتی ہے' منظور کر لے۔ اگر ترک جنگ پر مجبور ہوئے' تو جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے' ایک بات بالکل صاف ہے۔ ہندوستان اپنی تمام موجودہ کمزوریوں اور غفلتوں کے ساتھ بھی اس غلطی کا دوبارہ مرتکب نہیں ہو سکتا' جس میں وہ ایک صدی سے زیادہ عرصہ تک مبتلا رہ چکا ہے۔ وہ یقیناً اس سے انکار کر دے گا کہ اس کی مادی اور اخلاقی قوتیں آئندہ کسی ایسی جنگ کے لیے استعمال کی جائیں' جس کا مقصد محض برطانوی شہنشاہیت کے جابرانہ اغراض ہیں۔ یقیناً ہندوستان کے بدقسمت مسلمان اب اس کے لیے تیار نہ ہوں گے کہ برطنوی شہنشاہیت کے لیے ان ترکوں کے سینوں پر گولیاں چلائیں' جو اپنے قومی و وطنی حق کی حفاظت کے لیے دفاع پر مجبور ہوئے ہیں۔

سرزمین شام کی وحشیانہ بربادی خصوصاً دمشق اور اسکے بے گناہ باشندوں کا ہولناک قتل عام شاید نوع انسانی کے لیے موجودہ عہد کا سب سے زیادہ ماتم انگیز واقعہ ہے۔ عظیم و جمیل دمشق جو دنیا کی تاریخی آبادیوں میں سے ایک ہے' جس کا چپہ چپہ تاریخ مشرق کے بیش قیمت آثار کا دفینہ ہے' جو ایک صدی تک اسلام کے شاندار عہد عروج و تمدن کا مرکز رہ چکا ہے' جس کی تاریخ مرتب کرنے کے لیے ایک زمانہ میں حافظ ابن عساکر کو اسی ضخیم جلدیں لکھنی پڑی تھیں' اب ایک منہدم کھنڈر ہے اور متصل بہتر

ھمنشہ کی گولہ باری نے' جو کسی میدان جنگ کے لیے بھی ایک ہولناک بلا کی تھی' اسے انسانی قتل و غارت کا ایک وسیع مدفن بنا دیا ہے۔ نسل انسانی کی یہ تازہ ترین ہلاکت کن ہاتھوں سے انجام پائی ہے؟ فرانس کے ہاتھوں سے' اس فرانس کے ہاتھوں سے جس نے اپنے انقلاب کی زبانی نوع انسانی کو حقوق' مساوات اور آزادی کا پیغام دیا تھا اور جس کے روسو (3)' والٹیر (4)' میرابو (5) اور لا فیٹ (6)' وکٹر ہیوگو (7) کے لفظوں میں "نسل انسانی کے نجات دہندہ" تھے۔

حضرات!

تاریخ عالم کے موجودہ عہد کی اس ہولناک بربریت کے ذکر کے بعد جو نوع انسانی کی اس نجات دہندہ قوم کے ہاتھوں انجام پائی ہے' آپ قدرتی طور پر منتظر ہوں گے کہ اب میں فوراً دنیا کی اخلاقی زبان کے وہ تمام الفاظ بول جاؤں' جو ہمیشہ ایسے موقعوں پر بولے جاتے ہیں۔ میں انسانیت کا ذکر کروں' تہذیب کا حوالہ دوں' انسانی حقوق اور انصاف کی پامالی پر ماتم کروں' اور کم از کم آپ کو یاد دلاؤں کہ نام نہاد لیگ آف نیشنز اور یورپ کی فیاضانہ اور مربیانہ حکم برداری کے نتائج یہ ہیں' جو بدقسمت مشرقی اقوام کے حصہ میں آتے ہیں' لیکن میں ایسا نہیں کروں گا۔ یہ قطعاً" بے سود ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ایک معلوم و محسوس حقیقت سے انکار کرنا ہے۔ میں انسانی ظلم و حرص کی اس ہولناکی کا تو ذکر کر سکتا ہوں' جو موجود ہے' لیکن انسانی تہذیب و انصاف کی ان امیدوں کا کیوں ذکر کروں' جن کا فی الحقیقت کوئی وجود ہی نہیں ہے۔

انسانی ظلم و ناانصافی ہمیشہ کی طرح آج بھی موجود ہے۔ اس لیے ہم اسکے نتائج دیکھ رہے ہیں' لیکن انسانیت اور انصاف کہاں ہے' جس کی پامالی پر متعجب ہوں! طاقت نے کمزوری اور غفلت کے ساتھ کب انصاف کیا ہے کہ آج کرے گی؟ ہر انصاف جس کا مطالبہ کمزوری کرے' رحم ہے اور اس دنیا میں قومیں رحم نہیں کیا کرتیں۔ یہاں صرف طاقت اور ضرورت کا اعتراف کیا جاتا ہے' اور اسی کا نام انصاف ہے۔ ہمیں چاہیے کہ حقیقت کے خلاف ہر فریب خیال سے انکار کر دیں۔

سرزمین حجاز کے حوادث میں جہاں ایسے نتائج موجود ہیں' جو عجب نہیں' تاریخ

اسلام کے لیے ایک نئے دور اصلاح و ترقی کا دروازہ کھولیں' وہاں ہمارے لیے باشندگان حجاز کے مصائب کا تصور بھی کچھ کم المناک نہیں۔ شریفی حکومت جس کا وجود عرب اور اسلام کے لیے موجودہ عہد کی سب سے بڑی مصیبت تھی' اپنا آخری لمحہ حیات بھی ظلم و استبداد کے بغیر بسر نہ کر سکی۔ مدینہ منورہ کے ہزاروں باشندے فقر و فاقہ سے مجبور ہو کر شہر سے نکل گئے اور اس وقت حجاز کے ساحلی مقامات میں خانہ ویرانی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

ہمارے وفد حجاز نے ان کے مصائب کا دردانگیز پیام مسلمانان ہند کے نام بھیجا ہے۔ میں آپ کو خصوصیت کے ساتھ توجہ دلاؤں گا کہ تمام خلافت کمیٹیوں کے ذریعہ کوشش کی جائے کہ آیندہ حج کے لیے زیادہ سے زیادہ حجاج روانہ ہوں۔ اہل حجاز کی معیشت کا دارومدار زیادہ تر موسم حج کی رونق و کثرت پر ہے۔ جس قدر زیادہ حاجی جائیں گے' اسی مناسبت سے ان کی اقتصادی حالت سال بھر تک بہتر رہے گی۔

طلوع امید

لیکن حضرات! ان المناک حالات کی تاریکی میں امید اور مراد کی روشنی بھی کیسی تابندہ و نمایاں ہے! کون کہہ سکتا ہے کہ یہ آثار اپنے پیچھے کیسا روشن طلوع رکھتے ہیں۔ شمالی افریقہ میں امیر محمد بن عبدالکریم (8) کی فتح مندیاں حق و آزادی کے معجزات باہرہ میں سے ایک نیا معجزہ ہیں۔ اسپین کی تنہا فوجی طاقت جب بار بار ٹکرا کر رہ گئی' تو فرانس اور اسپین نے اپنی متحدہ قوت کا اسے نشانہ بنایا۔ مٹھی بھر بے سروسامان قبائل اور موجودہ عہد کی دو متمدن اور خونریز طاقتوں کا مقابلہ! دنیا کے لیے ایک عجیب نظارہ تھا۔ تاہم جو نتائج نکلے' وہ ہمارے سامنے ہیں۔ اس وقت تک ایک بالشت بھر زمین بھی ریفی علاقہ کی مسخر نہیں کی جا سکی اور عجیب نہیں' بہت جلد حق و باطل کا آخری فیصلہ ہو جائے۔ اسی طرح شام میں شجاع اور جانفروش دروزیوں (9) کی قومی حرکت کیسی شاندار اور امید افزا ہے۔ بہادر دروزیوں کی حرکت پہلے صرف جبل حوران کے قبائل ہی میں محدود تھی۔ لیکن دمشق کی ہولناک بربادی کا نتیجہ یہ نکلا کہ اب تمام آبادی ان

کے ساتھ شامل ہو گئی ہے اور غوطہ کی مرغزاروں سے لے کر جبل حوران کی سنگلاخ گھاٹیوں تک استقلال یا موت کا نعرہ بلند ہے۔ نہیں کہا جا سکتا' آیندہ حالات کیا صورت اختیار کریں۔ تاہم یہ تو واضح ہے کہ شام نے اپنے مقصد کی طرف عزم و ہمت کا قدم اٹھا دیا ہے۔ ضروری نہیں کہ یہ سفر جلد طے ہو' اور اب یا کسی قریبی مستقبل میں منزل مقصود تک پہنچ جائے۔ ہندوستان بھی اسی منزل کا ایک پاشکستہ رہرو ہے۔ اس کے دل کی آرزومندیاں اور روح کی بے چینیاں اپنے برادران شام کی کامیابیوں کی راہ تک رہی ہیں۔

ایران کے نئے انقلاب میں خاندان قاچاریہ کی شاہیت کا خاتمہ یقیناً ایک ایسا واقعہ ہے' جس کا تمام مشرق خیر مقدم کرے گا۔ یہ سلسلہ حکومت ایران کے عہد تنزل کی ایک پیداوار تھا۔ اس لیے شخصی حکومت کے بدترین مفاسد کے خمیر میں داخل تھے۔ اس کی پوری تاریخ اس عظیم سرزمین کے مصائب کی ایک مسلسل داستان ہے۔ یہ داستان جس قدر جلد ختم ہو جاتی' بہتر تھا۔ لیکن دنیا کو عرصہ تک انتظار کرنا پڑا۔ البتہ یہ انقلاب کیسا شاندار اور مکمل ہوتا' اگر ایک نئی شاہیت کے آغاز کی جگہ ہم ایران کی جمہوریت کا اعلان سنتے!

خاندان قاچاریہ کے عزل کے بعد دنیا کو قدرتی طور پر اسی کا انتظار تھا' مگر اسے مایوسی ہوئی تاریخ نے تعجب انگیز صورت میں اپنا ایک مشہور باب دہرا دیا اور ایران کے جمہوری مواد سے اچانک ایک نیا تاج و تخت شاہی آراستہ ہو گیا۔ بہرحال یہ ایران کے لیے ترقی کا ایک قدم ضرور ہے۔ آج اس کا تاج شاہی اس کے طاقتور اور صاحب عزم رہنما کے سر پر ہے اور تاریخ منتظر ہے کہ اس واقعہ کے نتائج کا فیصلہ کرے۔

حضرات!

آیئے اب وقت کے سب سے آخری مگر سب سے اہم واقعہ کی طرف متوجہ ہوں۔ یہ سرزمین حجاز کے عظیم الشان انقلاب کی تکمیل ہے۔ مدینہ منورہ میں نجدی فوجیں امن و امان کے ساتھ داخل ہو چکی ہیں اور جدہ کی تسخیر کی تصدیق ہو گئی ہے۔ اب شریف حسین کے فتنہ سے یہ سرزمین مقدس پاک ہو گئی۔ اور اس طرح وہ عظیم

الشان اسلامی خدمت مکمل ہوگئی۔ جس کا شرف قدرت الٰہی نے امام عبدالعزیز آل سعود کے نام لکھ دیا تھا۔ فی الحقیقت نجدی افواج کا حجاز میں داخلہ اس سے کہیں زیادہ اہم واقعہ ترتیب دے رہا تھا' جس قدر دنیا کی نگاہوں نے تصور کیا تھا اب نہ صرف سرزمین حجاز بلکہ جزیرۃ العرب کے لیے بالکل ایک نئی صورت حال پیدا ہوگئی ہے۔ موجودہ عرب کا سب سے بڑا انسان ہمارے سامنے نمودار ہوگیا ہے اور ایک عظیم مستقبل اس کے عقب میں ہے۔ اب صدیوں کے بعد مسلمانان عالم کو موقعہ ملا ہے کہ سرزمین حجاز کی تجدید و اصلاح کے خواب کی تعبیریں ڈھونڈیں۔ اگر مسلمانان عالم کی رائے عامہ نے اس انقلاب کی قدروقیمت محسوس نہ کی تو عجب نہیں' وہ تاریخ کی نظروں میں ایک بہت بڑی فرصت عمل ضائع کر دینے کے لیے مجرم ثابت ہوں۔

مرکزی خلافت کمیٹی اور اس کا نظام

حضرات! قبل اس کے کہ میں آپ کو وقت کے اہم کاموں کی طرف توجہ دلاؤں' چند الفاظ اس بارے میں بھی کہنا چاہتا ہوں کہ بحالت موجودہ ہماری ملکی سرگرمیوں میں خلافت کمیٹی کی نوعیت کیا ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ اس بارے میں صاف اور واضح خیالات کی ضرورت ہے۔ خلافت کمیٹی جس وقت قائم ہوئی' تو دو مقصد اس کے پیش نظر تھے: مسئلہ خلافت کے لیے ملک میں عام جدوجہد جاری رکھنا اور مسلمانوں میں خصوصیت کے ساتھ ملکی آزادی کے لیے سرگرمی پیدا کرنا۔ اس آخری مقصد کی ضرورت اس لیے پیش آئی تھی کہ اس راہ میں مسلمانوں کے قدم بہت پیچھے تھے۔ اس لیے ضروری تھا کہ خصوصیت کے ساتھ ایک جماعت ان میں سرگرمی پیدا کرتی ہے۔ اب صورت حال یہ ہے کہ جہاں تک مسئلہ خلافت کا تعلق ہے' کوئی ایسی جدوجہد موجود نہیں ہے' جس کے لیے تمام ملک میں ایک مستقل نظام کی ضرورت ہو اور جو مسائل درپیش ہیں ان کے لیے صرف مرکزی کمیٹی کافی ہے۔ باقی رہا دوسرا مقصد' تو کہا جا سکتا ہے کہ اس کے لیے بھی اب ضروری نہیں کہ خلافت کمیٹی کے نام سے تمام صوبوں اور ضلعوں میں کوئی نظام قائم رکھا جائے۔ مسلمانوں میں جو لوگ ملک کی موجودہ

افسردگی اور ہندو مسلم نااتفاقیوں سے پریشان خاطر ہو چکے ہیں' وہ تو آگے کی طرف دیکھنے کے لیے کوئی نگاہ نہیں رکھتے' اور جب پیچھے دیکھتے ہیں' تو انہیں خیال ہوتا ہے کہ خلافت کمیٹی کی جگہ سے ہٹ کر کیوں نہ کوئی نیا نظام قائم کرلیا جائے؟ یا کم از کم کوئی پچھلا نظام ہی کیوں نہ ازسرنو زندہ کرلیا جائے؟ جن لوگوں کی پریشان خاطری اس حد تک نہیں پہنچی ہے کہ اپنے گزشتہ اصول و عقائد سے دستبردار ہو جائیں' وہ اگرچہ دوسرے مقصد سے انکار نہیں کرتے تاہم وہ بھی محسوس کرنے لگے ہیں کہ اگر خلافت کمیٹیوں کے لیے ملک کے اندر کوئی معین اور جاری کام نہیں ہے' تو پھر یہ پورا کارخانہ کیوں کر قائم رکھا جا سکتا ہے! اور اگر نہیں رکھا جا سکتا تو کیوں قائم رکھا جائے؟

حضرات!

مجھے آخری خیال کے وزن سے انکار نہیں' مگر میں پہلے سے بھی متفق نہیں ہو سکتا میں تسلیم کرتا ہوں کہ جہاں تک باہر کے اسلامی مسائل کا تعلق ہے' معاملات نے ایسی صورت اختیار کرلی ہے کہ ان کے لیے صرف مرکزی خلافت کمیٹی بھی کافی ہوسکتی ہے۔ لیکن مجھے اس سے انکار ہے کہ ہندوستان کی سیاست و عمل کی زندگی میں مسلمانوں کو پیچھے ہٹنا چاہیے۔ اور میں محسوس کرتا ہوں کہ بحالت موجودہ اگر وہ کارکن حلقہ باقی نہ رہا۔ جو خلافت کمیٹی کے نام سے پہچانا جاتا ہے' تو لازمی نتیجہ یہی ہوگا کہ مسلمانوں کی جماعتی سرگرمیوں کو آگے بڑھنے کی جگہ پیچھے ہٹنے کے لیے چھوڑ دیا جائے اور گزشتہ تحریک نے اعتقاد و عمل کی جو ایک خاص آب و ہوا پیدا کر دی ہے' وہ ایک عرصہ تک کے لیے معدوم ہو جائے۔ ذرا تفصیل کے ساتھ غور کیجئے کہ موجودہ صورتحال کیا ہے؟ خلافت کمیٹی کو صرف اس کے نام میں نہیں دیکھنا چاہیے۔ نام تو صرف اس تختی کا سوال ہے' جو اس کے دروازے پر لٹکا دی جاتی ہے۔ دراصل خلافت کمیٹی مسلمانوں کے اس کارکن حلقہ کی نمائندگی کرتی ہے' جس کی عقائد و اعمال کی چند خاص خاص خصوصیتیں ہیں اور انہی خصوصیتوں کی بنا پر اس کا ایک خاص حلقہ ملک میں قائم ہوگیا ہے۔ یہ حلقہ مسلمانان ہند کی جماعتی زندگی میں 1920ء کی ایک نئی کڑی پیدا کرتا ہے جو 1912ء سے 1920ء تک کے دماغی تغیرات کا قدرتی نتیجہ تھی۔ اگر یہ کڑی

نکال دی جائے' تو مسلمانوں کی سیاسی و عملی سرگرمی کی رفتار ترقی میں سے ایک منزل گم ہو جائے گی۔ جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے' اس حلقہ کی بڑی خصوصیات جو اسے دوسرے حلقوں سے ممتاز کرتی ہیں' یہ ہیں کہ یہ ہندوستان کی آزادی و نجات پر جو متحدہ قومیت کے ذریعہ حاصل ہوگی' یقین رکھتا ہے۔ موجودہ صورت حال کی بدقسمتی اس کام میں کتنی ہی دشواریاں پیدا کر دے' لیکن وہ تیار نہیں کہ اس نصب العین سے دستبردار ہو جائے۔ وہ مسلمان کے جماعتی حقوق و فوائد کا تحفظ ضروری سمجھتا ہے' لیکن اس طریق عمل سے انکار کرتا ہے کہ مسلمان ہندوؤں کے طرز عمل سے روٹھ کر اجنبی حکمت کی آڑ پکڑ لیں اور ان کی ہستی ہمیشہ ملک کی قسمت کے لیے ایک دھمکی کی طرح استعمال کی جائے۔ اگر ہندوؤں سے انہیں منصفانہ طرز عمل کا مطالبہ کرنا ہے' تو پوری قوت سے کرنا چاہیے۔ لیکن ساتھ ہی ضروری ہے کہ ہماری باہمی آویزش ملکی جنگ کے میدان سے ہمیشہ الگ رہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ عمل اور سرگرمی کے ان ابتدائی اور بے سود طریقوں پر وہ قطعاً" اعتقاد نہیں رکھتا' جنہیں 1920ء کی تبدیلی کا دروازہ بند کر چکا ہے۔ کوئی میدان ہو' وہ یقین کرتا ہے کہ جدوجہد کی اصلی روح قربانی و ایثار اور عملی اقدام ہے۔ گزشتہ تحریک ملک کی قوت عمل کے لیے ایک پورا امتحان تھی۔ جن جن قدموں میں چلنے کی سکت تھی' وہ چل اٹھے' جو نہ چل سکے' انہوں نے ثابت کر دیا کہ اسباب کچھ ہوں' لیکن ان کے لیے چلنا مشکل ہے۔ اب جو حلقہ مسلمانوں میں ہر جگہ خلافت کمیٹی کا سمجھا جاتا ہے' یہ گویا مسلمانوں کی موجودہ قوت عمل کا خلاصہ ہے۔ اگر موجودہ دور میں کسی طرح کی بھی عملی سرگرمی جاری رکھنی ہو' تو یہ ناگزیر ہے کہ اسی مواد سے کام لیا جائے۔ اس سے باہر کوئی ایسا مواد موجود نہیں' جو کسی طرح کی عملی سرگرمی شروع کر سکے۔

میں اس وقت دلائل اور تفصیل سے کام نہیں لوں گا' کیونکہ میں سمجھتا ہوں' میرا مدعا ہر شخص اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے۔ کیا آپ اس کی ضرورت نہیں محسوس کرتے کہ مسلمانوں میں اعتقاد اور فکر کا یہ مذہب (اسکول) قائم رکھنا چاہیے؟ میں تو محسوس کرتا ہوں کہ اس کی ضرورت ہے اور اگر یہ حلقہ سردست اپنی جگہ خالی کر

دے، تو صرف اتنا ہی نہیں کہ وہ خالی رہے گی، بلکہ ایسی جماعتیں آگے بڑھ آئیں گی جن سے نہ تو کسی طرح کی صحیح عملی سرگرمی کی امید کی جا سکتی ہے، نہ وہ آگے کی طرف کوئی نگاہ رکھتی ہیں۔ اگر مسلمان موجودہ انتشار اور افسردگی کے وقفہ میں اور کچھ نہیں کرسکتے تو کم از کم انہیں پیچھے تو نہیں دیکھنا چاہیے۔

البتہ ایک مسئلہ کا فیصلہ ناگزیر ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ آپ اس کا فیصلہ کرلیں کہ آپ کے لیے اہم ترین کام خود ہندوستان کے اندر کی زندگی اور اس کی ضروریات ہیں یا نہیں؟ اگر آپ کا جواب اثبات میں ہو، تو آپ کو غور کرنا چاہیے کہ اس راہ میں کوئی معین اور عملی قدم اٹھا سکتے ہیں یا نہیں؟ آپ نے پانچ سال تک ہندوستان کے باہر کے اسلامی اور مشرقی مسائل کے لیے جدوجہد کی اور جس قدر نتائج اس سے نکل سکتے تھے، حاصل ہوئے۔ لیکن موجودہ صورتحال کیا ہے؟ یہ ہے کہ آپ اپنے ملک کے اندر بدستور قید و بند کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ آپ کی حالت، صرف آپ کی نجات کی راہ ہی نہیں، بلکہ تمام ایشیا اور مشرق کی راہ میں روک ہے۔ پس ضروری ہے کہ آپ کی قوتیں اب ملک کی اندرونی خدمات کے لیے وقف ہو جائیں۔ بحیثیت ملک کی ایک بڑی جماعت کے مسلمانوں کی تعلیمی، معاشرتی اور عام دماغی اصلاح و ترقی کا کام ہر حال میں ایک مقدم اور ناگزیر فریضہ ہے۔ اگر ملک کے سامنے سیاسی حرکت کے لیے کوئی عملی پروگرام موجود نہیں اور بحالت موجودہ جس قدر بھی زیادہ سرگرمی جاری رکھی جا سکتی ہے اس میں نیشنل کانگریس مشغول ہے، تو چاہیے کہ یہ موقع ہم کسی صحیح تعمیری کام میں صرف کر دیں۔ یہ واقع ہے کہ ہم نے 1920ء کی حرکت سے پہلے کوئی مہلت ایسی نہیں پائی کہ عوام کی اصلاح و ترقی کے لیے چار پانچ سال تک کوئی بھی سرگرمی جاری رہی ہوتی۔ اس کا افسوسناک نتیجہ آج ہم اس ردِ فعل (ری ایکشن) میں دیکھ رہے ہیں، جس نے اچانک تمام ملک کو انتشار اور افسردگی کے حوالہ کر دیا ہے۔

اب اگر ہم اور کچھ نہیں کرسکتے تو کم از کم آئندہ چند سالوں میں وہی کام انجام دے لیں، جو گزشتہ چند سالوں کے اندر نہیں کیا گیا۔ اگر ہم اس کام میں تھوڑی سی بھی کامیابی حاصل کرسکے، تو یہ مسلمانوں کے لیے بحیثیت ایک جماعت کے اور ملک کے

لیے بحیثیت مجموعی ایک عظیم الشان خدمت ہوگی۔ میرا خیال تھا کہ اس کام کا ایک بڑا ٹکڑا جو بغیر کسی جماعتی خصوصیت کے کیا جا سکتا ہے، آل انڈیا کانگریس اپنے ہاتھ میں لے لے۔ لیکن اگر کانگریس سردست کوئی ایسا کام شروع نہیں کر سکتی تو ملک کی تمام جماعتوں کو چاہیے کہ اسے اپنے اپنے حلقوں میں شروع کر دیں۔ اگر خلافت کیٹیوں کا نظام کسی ایسے کام میں مشغول ہو جائے، تو پھر میں یقین کے ساتھ کہوں گا کہ ان کے غیر ضروری ہونے کا کوئی سوال درپیش نہیں ہے۔

یہ صحیح ہے کہ آپ نے گزشتہ سال ایک پروگرام منظور کیا تھا، جو آپ کے ریکارڈز (10) میں موجود ہے۔ اس میں کام کی متعدد دفعات جمع کی گئی ہیں۔ لیکن میں نہیں سمجھتا کہ وہ اپنی موجودہ شکل میں آپ کے لیے مفید عمل ہو سکتا ہے۔ آپ کو چاہیے کہ آپ سب سے پہلے اس پہلو پر غور کریں کہ مسلمانوں کی جماعتی اصلاح و ترقی کے لیے بنیادی سطح کونسی ہے، اور پھر کوئی ایک معین اور واضح اور سہل العمل قدم اس طرف اٹھایئے۔

1926ء اور تعمیری پروگرام

تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے لیے ہر حال میں مقدم کام عوام کی تعلیم ہے۔ یہی کام سب سے زیادہ ضروری ہے اور اسی کی طرف سے ہمیشہ اغماض کیا گیا ہے۔ تعلیم کے لفظ کو یہاں اس سے زیادہ وسیع معنوں میں لیجیے۔ تعلیم سے مقصود وہ تعلیم ہی نہیں ہے، جو قواعد اور منضبط اصول کے ذریعہ مکتبوں اور مدرسوں میں دی جاتی ہے۔ یہ تو دراصل آنے والے عہد کے لیے ہے۔ جنہیں آج پڑھایا جا رہا ہے، وہ کل کام کریں گے، لیکن قوم کو اس کی موجودہ حالت میں بلند کرنے کے لیے ضروری ہے کہ موجودہ نسل کی دماغی حالت اور عملی استعداد درست کی جائے۔ وقت کی تمام مشکلات کا یہی علاج ہے۔

ہم عوام میں باہمی اتحاد پیدا نہیں کر سکتے۔ عملی سرگرمی ابھار نہیں سکتے، معیشت کی تکلیفیں دور نہیں کر سکتے۔ وقت کی ضروریات کا احساس پیدا نہیں کر سکتے۔ جب تک

ان کے فہم و استعداد کے مطابق ان سے ہمارا ایک دائمی ذریعہ خطاب و درس قائم نہ ہو جائے۔ اس کے لیے دو چیزیں ضروری ہیں۔ موجودہ نسل میں جس کی ابتدائی تعلیم کا زمانہ گزر چکا ہے' نوشت و خواند کی تعلیم عام کرنا اور باقاعدہ و مرتب تعلیمی اسباق کے ذریعہ جو مذہبی' اخلاقی اور معاشرتی تعلیمات پر مشتمل ہوں' عوام کی جماعتوں کو مسلسل تعلیم دینا۔

اگر ہم نے ان پڑھ عوام کی ایک بڑی تعداد میں اتنی استعداد پیدا کر دی ہے کہ وہ اٹک اٹک کر اردو عبارت پڑھ لیں اور غلط سلط اردو لکھ لیں' تو آپ یقین کیجئے کہ ہر طرح کی اصلاح و ترقی کے دروازے' جو کسی حال میں بھی نہیں کھل سکتے تھے ہم نے بہ یک دفعہ ان پر کھول دیے۔ اسی طرح اگر ہم نے 1926ء میں کم از کم اتنا بھی کرلیا کہ ہم ایک خاص مقدار کی مفید اور ضروری تعلیم لکچروں کے ذریعہ عوام کے مختلف حلقوں کو دیتے رہے' اس کی مسلسل صدائیں ان کے دلوں تک اترتی رہیں اور اس طرح کارکن حلقہ میں اور عوام میں' روزانہ خطاب اور مقابلہ کا تعلق قائم ہوگیا' تو غور کیجئے کہ 1926ء کی جماعتی استعداد سے 1927ء کس قدر مختلف ہوگا!

میں سمجھتا ہوں کہ آپ کو سردشت صرف یہ تعلیمی پروگرام اختیار کرنا چاہیے اور اس میں بھی صرف چار چیزوں پر قناعت کرلینی چاہیے۔

1- عوام کے موجودہ طبقہ میں نوشت و خواند کی اشاعت اور اس کے لیے نائٹ (II) سکولوں کا قیام۔ اکثر صورتوں میں ان کے لیے مساجد کافی ہیں۔

2- عوام کی مذہبی' اخلاقی اور معاشرتی اصلاح و ترقی کے لیے ایسی تعلیم گاہوں کا اجرا جہاں مرتب و مسلسل لکچروں کے ذریعہ اس طرح تعلیم دی جائے کہ ہر مہینے کا ایک معین کورس ہو اور اس میں ایک خاص مقدار کی مفید اور ضروری معلومات موجود ہوں۔ اس کے لیے بھی اکثر حالتوں میں مسجد بہترین محل ہے۔

3- جہاں تک ممکن ہو۔ عوام کے لیے قرات خانوں (ریڈنگ رومز) کا قیام۔

4- کوشش کی جائے کہ جمعہ کے خطبات کی اصلاح ہو اور ان کے ذریعہ ضروری اور مفید تعلیم ہفتہ وار سامعین کو مل سکے۔

اس پروگرام کے نفاذ کے لیے لیکچروں اور خطبوں کی ترتیب و اشاعت ضروری ہے اور اس کا خود مرکزی خلافت کمیٹی کو انتظام کرنا چاہیے۔

روپیہ کی فراہمی

حضرات!

روپیہ کی فراہمی کے لیے بھی اس وقت تک جو طرز عمل چلا آتا ہے، میں سمجھتا ہوں، اب اس میں تھوڑی سی تبدیلی کرنی چاہیے۔ یہ ظاہر ہے کہ بغیر روپیہ کے کوئی کام نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ حالت زیادہ عرصہ تک چل نہیں سکتی کہ عوام سے روپیہ کی مسلسل طلبی بھی جاری رہے اور کام کا اعلان اور وعدہ بھی ہوتا رہے۔ ہمیں چاہیے کہ اب ایسا طرز عمل اختیار کریں کہ لوگوں کو روپیہ دینے اور اس کے نتائج تولنے کا صحیح طور پر موقعہ مل سکے۔ اگر آپ اس سال عملی سرگرمی پیدا کرنا چاہتے ہیں، تو چاہیے کہ روپیہ کی مسلسل طلبی و وصولی کا طریقہ ملتوی کر دیجئے۔ آج یہیں طے کر لیجئے کہ 1926ء کے کاموں کے لیے خصوصاً اس تعلیمی پروگرام کے لیے آپ کو کم از کم کس قدر روپیہ چاہیے۔ اس کے بعد سال کی پہلی سہ ماہی صرف اس رقم کی طلبی و وصولی کے لیے صرف کر دیجئے۔ خلافت کمیٹی کا تمام نظام تین ماہ تک صرف اسی کام میں مشغول رہے۔ اس عرصہ میں پبلک کا فرض ہے کہ وہ آپ کو روپیہ دے، اور اس کا مطالبہ نہ کرے کہ آپ کام کر رہے ہیں یا نہیں۔ اس کے بعد نو ماہ خالص عمل اور مشغولیت کے ہونے چاہئیں۔ ان نو مہینوں کے ہر دن کے لیے آپ پبلک کے سامنے جوابدہ ہوں گے۔ سال کے خاتمہ پر وہ فیصلہ کر سکے گی کہ کس قدر آپ کو روپیہ دیا گیا اور کس قدر آپ نے کام انجام دیا۔

موتمر حجاز

حضرات!

1926ء کا دوسرا اہم کام آپ کے لیے مجوزہ موتمر حجاز ہے، جس کا پیام دعوت امیر عبدالعزیز آل سعود کی جانب سے تمام عالم اسلامی کو دیا جا چکا ہے اور خصوصیت کے

ساتھ آپ کے نام بھی پہنچ چکا ہے۔

موتمر حجاز بجائے خود ایک ضروری کام ہے۔ لیکن حجاز کے مسئلہ نے اس کی ضرورت اور زیادہ اہم کر دی ہے۔ تاریخ اسلام کو صدیوں کے بعد موقع ملا ہے کہ سرزمین حجاز کو اصلاح و عمل کے لیے مستعد دیکھے۔ اس دور کے آغاز کے لیے سب سے پہلا کام موسم حج میں موتمر اسلام کا انعقاد ہے۔ ہمارا وفد اس وقت حجاز میں موجود ہے اور امید ہے کہ اس باب میں اس کے ذریعہ عنقریب مفصل اطلاعات موصول ہوں گی۔ بہت ممکن ہے کہ اس سلسلہ میں بعض اہم خدمات کے انصرام میں مرکزی خلافت کمیٹیاں نمایاں حصہ لیں۔ امید ہے کہ مسلمانان ہند کی رائے عامہ ہمیشہ اس کی اعانت میں سرگرم رہے گی۔

خاتمہ

حضرات!

آخر میں میرے لیے صرف یہ رہ گیا ہے کہ اللہ تعالٰی سے توفیق عمل کے لئے دست بہ دعا ہوں۔ اگر ہماری نیتیں اخلاص سے اور ہمارے قلوب عزم سے خالی نہیں ہیں، تو ہمیں راہ کی مشکلات پر نہیں، بلکہ رہنمائے حقیقی کی دستگیری پر نظر رکھنی چاہیے۔

ربنا لا تزغ قلوبنا بعد اذ ھدیتنا وھب لنا من لدنک رحمتہ (12)

9

جمعیتہ تبلیغ اہلحدیث

کلکتہ، ستمبر1934ء

برادران عزیز!

قبل اس کے کہ اس موقعہ پر بعض مطالب جو میں آپ لوگوں کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں، پیش کروں، میں چاہتا ہوں کہ چند باتیں بطور تمہید کہہ دوں۔ مجھے یقین ہے کہ اس مجمع میں ایسی تعداد موجود ہے، جو بے خبر نہیں کہ میں عام مجمعوں میں شریک ہونا نہیں چاہتا۔ کچھ تو صحت کی کمزوری کا اقتضا ہے، اور کچھ طبیعت کی افتاد کہ میری طبیعت دوسری طرف نہیں جاتی۔ یہ یقیناً میری کمزوری ہے، مگر یہ واقع ہے کہ مجھے تھوڑی دیر کے لیے بھی رسمی تقریر کرنا گراں ہوتا ہے۔ اب چند سالوں سے اگر گوارا بھی کرتا ہوں، تو جبر ہے، مگر جبر کی بھی کئی قسمیں ہوتی ہیں۔ ان قسموں میں ایک خوشگوار جبر بھی ہے اور ایسا ہی ایک خوشگوار جبر اس موقع پر بھی کیا گیا ہے۔ ان حضرات نے جنھوں نے اس جمعیت کی بنیاد ڈالی ہے، مجھ سے سخت اصرار کیا۔ میں نے معذرت کی۔ انہوں نے اور زیادہ اصرار کیا۔ میں نے معذرت کی، لیکن ان کے اصرار کے آگے میری معذرت کو شکست ہوئی۔ میں ان کی بات ماننے پر مجبور ہوگیا۔ معاملہ اسی پر ختم نہیں ہوا، بلکہ مزید اصرار کیا گیا کہ میں جلسے میں صدر بنوں، لیکن میں نے اس کے لیے ہربار معذرت کی۔ پھر بھی اصرار کے آگے جھکنا پڑا اور میں نے وعدہ کرلیا کہ جلسے میں

شریک ہو کر کچھ کہہ دوں۔

تقریر کی قسمیں

ایک ضروری چیز پہلے بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں یعنی تقریر کی کئی قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک تقریر تو وہ ہے' جس کا مقصد ہے کہ آپ سے اپیل کی جائے' آپ کے دل کو متوجہ کیا جائے۔ آپ کے احساسات کو اکسایا جائے اور آپ کے جذبات سے کھیلا جائے۔ دوسری تقریر وہ ہے جس کا تعلق دماغ سے ہے۔ اس کے لیے ضرورت اس کی ہے کہ آپ کا دماغ اس طرف متوجہ ہو' کان سنے' دماغ سوچے اور فیصلہ کرے کہ کہاں تک حقیقت کو پا رہا ہے۔

تقریر کا مقصد

میں اس لیے پہلے ہی کہہ دینا چاہتا ہوں کہ میری تقریر پرجوش نہ ہوگی۔ ولولہ انگیز نہ ہوگی۔ آتش بداماں نہ ہوگی' بلکہ محض انجمن کے مقاصد کے سلسلے میں کام کی باتیں آپ تک پہنچانے کی کوشش ہوگی' تاکہ وہ آپ تک پہنچ جائے اور آپ غور کریں نیز مجھے یہ کہنے کا خیال یوں بھی ہوا کہ یہ ایسا جلسہ ہے' جہاں علماء موجود ہیں۔ میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں' وہ امور غور و فکر سے متعلق ہیں۔ اس کو دوسرے سے زیادہ بہتر یہی کر سکتے ہیں۔

انجمن کے مقاصد

مجھے آپ کی انجمن کے مقاصد معلوم نہیں ہیں۔ لیکن جہاں تک معلوم ہیں' وہ یہ ہیں کہ چند اہل خیر نے اس کی ضرورت محسوس کی کہ تبلیغ حقیقت کے لیے انجمن قائم کی جائے۔

اقدام اور نفس عمل

حالات کو دیکھ کر ان تمام حضرات کو مبارکباد دیتا ہوں کہ یہ ایک نہایت مبارک

اور مفید اقدام کیا ہے۔ جہاں تک مسلمانوں کی زندگی کا تعلق ہے' وہ اسلام کی حقیقی تعلیم کی دعوت و تبلیغ ہے۔ آپ کی کوششوں کے اثرات دیکھتا ہوں۔ بحمداللہ آپ نے عظیم الشان جلسہ منعقد کیا ہے۔ مبارک اقدام ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ آپ یہ نہ سمجھے ہوں گے کہ وہ اقدام یہیں ختم ہو جائے گا۔ ضروری ہے کہ آپ کو رخ بھی معلوم ہو۔ منازل موجود ہوں اور منزل مقصود بھی پیش نظر رہے۔ علما کی جماعت کو دنیا' اور ان کے چند نصائح سے شہریوں کو فائدہ پہنچا' مبارک اقدام ہے' مگر نفس عمل نہیں ہے' منزلیں آگے آنے والی ہیں لہٰذا منزل بھی آپ کے سامنے ہونی ضروری ہے۔

رہی اسلام کی حقیقی تعلیم کی تبلیغ اور اشاعت' تو عزیزان من! ہندوستان کے مختلف ادارے اور جماعتیں اس خدمت کو انجام دے رہے ہیں۔ لیکن عام طور پر دیکھا ہو گا کہ ہندوستان میں تمام کوششیں صرف سالانہ اجتماع کے انعقاد میں صرف کر دی جاتی ہیں۔ اور اقدام عمل' سعی طلب اور رفع تشنگی کے لیے کوئی قدم نہیں اٹھتا۔ اگر واقعی صرف تبلیغ پیش نظر ہے' تو یہ کافی نہیں۔ کافی ابتداء بھی نہیں۔ ابتدا تو جب ہے کہ اشاعت و تبلیغ کے سلسلے میں یہ بھی سوچا ہو کہ وقت کیا ہے؟ اس کا مطالبہ کیا ہے؟ اس کا رخ کدھر ہے؟ اس کی پیاس کیا ہے؟ آپ کو کس رخ کا جواب دینا چاہیے؟ اس کی تشنگی کو بجھانے کے لیے کیسے گلاس میں آب حیات انڈیل کر دینا چاہیے؟ اگر آپ کے سامنے یہ باتیں نہیں' یہ خیال نہیں' تو پھر اس سے بھی کوئی فائدہ نہیں۔ آپ اگر اسلامی کوشش کرتے ہیں تو کیجئے۔ بھلائی ہو گی۔ لیکن آپ اسی قانع نہ ہو جائیں اور افسوس ہے اگر آپ اسی پر قانع ہو جائیں۔ اسی پر قناعت کر لیں۔

ایک خیال

میں خود بھی فکر میں تھا کہ جمعیتہ العلماء کا ایک جلسہ طلب کیا جائے کہ مسلمانوں کو جلد دعوت عمل دے' غور کرے کہ معاملہ کیا ہے۔ مسلمان کدھر جا رہے ہیں؟ لیکن کس کی تبلیغ کس کے سامنے' کس شکل میں کی جائے؟

اب ایک شکل اجمالی طور پر سب کے سامنے آ گئی ہے لیکن یہ موضوع بہت وسیع

ہے۔ موقع ہے اور نہ اتنا وقت کہ اس پر تقریر کر سکوں۔

قرآن پاک کی عظمت

بہرحال میرے عزیزو! اس وقت تو محض یہ دیکھنا ہے کہ اسلام کیا ہے؟ یہ اللہ کی صداقت کا ایک عالمگیر پیغام ہے۔ ہم تمام کرۂ ارضی پر نظر ڈالیں۔ اس کرۂ ارضی کی نبض ہاتھ میں لے لیں اور بیماری کی تشخیص کے بعد اس کے سامنے آب حیات پیش کریں۔ تمام قوموں کا مطالعہ کریں اور دیکھیں کہ ان کو پیاس کس آب حیات کی ہے۔ لیکن آپ کی نظر محدود اور مسئلہ وسیع ہے۔ ہم سے کوتاہی ہو رہی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ علمی حیثیت کے مطالعہ کریں کہ دنیا کی حالت کیا ہے؟ اس کو ضرورت کس چیز کی ہے؟ تو کام چل سکتا ہے؟ اور اگر ہم ایسا کریں تو دنیا کی کونسی بات نہیں ہو سکتی کیونکہ دنیا کی تمام قومیں جس چیز کی تلاش میں ہیں' وہ تو آپ کے پاس قرآن میں ہے۔ لیکن حالت یہ ہے کہ ہر گوشے میں اس سے انکار ہے۔

اوروں کا تعصب اور عوام کی حالت

حقیقتاً ایک شخص جو اسلام کی تعلیم اور دنیا کے حالات سے واقف ہو' حیرت میں رہ جاتا ہے کہ روشنی ہونے پر بھی دنیا اس کا اعتراف نہیں کرتی۔ اس زمانے میں حکومتیں اور جماعتیں متعصب ہیں۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ عوام میں علم کی وسعت نے' عقلی نشوونما نے' سائنس کی روشنی نے' یورپ و امریکہ میں ہزاروں نہیں بلکہ کروڑوں بے تعصب انسان پیدا کر دیے ہیں۔ ان میں اتنی سچائی ہے کہ ہر حقیقت کو مان لیتے ہیں۔ بلا شبہ ان کے ارادوں میں اب بھی وہی تعصب کام کر رہا ہے لیکن افراد اپنی چیزوں پر بھی نکتہ چینی کرتے ہیں' اور غیروں کی بھی اچھی چیزوں کو مان لیتے ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اسلام عالمگیر صداقت کے ساتھ موجود ہے اور وہ متوجہ نہیں ہوئے؟ پھر دنیا جس کو ڈھونڈتی ہے' وہ اسلام کے سوا کچھ نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی کوئی حرکت ایسی نہیں ہوتی' جو ان کو اپنی طرف متوجہ کرے' لوگ اس برکت سے محروم ہیں۔ ہزاروں' لاکھوں' کروڑوں' نگاہیں روشنی کی تلاش میں بھٹکتی پھر

رہی ہیں۔ روشنی سامنے ہے اور وہ نہیں دیکھتے۔ کیوں؟ روشنی تو ایسی چیز ہے' جو دور ہی سے نظر آئے' لیکن روشنی پر اگر چادر ڈال دیں' تو روشنی باہر نہیں نکلے گی۔

میں صاف کیوں نہ کہوں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام تمام سچائیوں کے باوجود لوگوں کی غلط فہمیوں کا نشانہ بنا ہوا ہے۔ اس کے متعلق غلط فہمیاں پھیلائی گئی ہیں' پھیلی ہوئی ہیں اور پھیلائی جارہی ہیں'. اور وہ ذوق طلب پیدا نہیں ہوتا' جو ہونا چاہیے تھا۔ اب ضرورت اس کی ہے کہ مدتوں کی لپٹی ہوئی چادر کو ہٹا دیا جائے' تاکہ روشنی کو سب دیکھ سکیں اور پروانوں کی طرح اس سے لپٹ جائیں۔

تبلیغ اسلام کے دو میدان

تبلیغ اسلام کے لیے دو میدان ہیں: ایک خارجی' دوسرا داخلی' خارجی میدان وہ ہے کہ جہاں غیر مسلم قومیں ہیں' جہاں غیر مسلمین میں تبلیغ کرنی ہے۔

داخلی سے مقصود یہ ہے کہ جہاں تک مسلمانوں کے اعمال و عقائد کا تعلق ہے' جس میدان میں مسلمانوں کے اخلاق و عادات کی اصلاح کی ضرورت ہے' کیا انہیں وہاں حقیقی اسلام کا جلوہ نظر آرہا ہے؟ نہیں' تو اسلام کی تبلیغ کا اہم میدان داخلی ہے۔ کیونکہ ہم سے اس کی جلوہ فرمائی دور ہوگئی ہے۔ ہماری آنکھیں حقیقی اسلام کے جلووں کو ڈھونڈتی ہیں' لیکن نہیں دیکھتیں اس لیے صورت حال کو بدل ڈالنے کے لیے ہم سنبھلیں اور قدم اٹھائیں۔

اسلام کی بیرونی تقویت اور اشاعت اسلام خارجی کے لیے ضروری ہے کہ ان میں جو غلط فہمیاں پھیلائی گئی ہیں اور پھیلی ہوئی ہیں' ہم ان کو دور کریں۔ اس کے ساتھ ہی یہ اندازہ کریں کہ فکری زندگی کس رخ جارہی ہے اور وہ کس چیز کی ضرورت محسوس کررہی ہے۔ اس کے بعد ہم ان کی ضرورت کی تمام چیزیں اسلام کے خزانے سے نکال کران کے سامنے رکھ دیں' تو ممکن نہیں کہ وہ کسی اور چوکھٹ پر سر جھکا دیں۔

اسلام کی مخالفت کا آغاز

بڑی مشکل یہ ہے کہ دنیا میں سب سے بڑی قوم عیسائیوں کی ہے اور یہ معلوم

ہے کہ مختلف اسباب ایسے پیدا ہوئے کہ مختلف سیاسی جماعتوں کو مسلمانوں اور اسلام کے خلاف پروپیگنڈا کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی اور اس ضرورت کے ماتحت انہوں نے اس پروپیگنڈے پر اپنی ساری جدوجہد ختم کر دی۔ اس پروپیگنڈے کا آغاز حروب صلیبیہ سے ہوتا ہے۔

یورپ میں تحریک ہوئی کہ بیت المقدس کو مسلمانوں کے ہاتھ سے لے لیا جائے کیونکہ بیت المقدس سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مولد ہے اور یورپ کی بڑی قومیت عیسائیوں پر مشتمل ہے۔ اسی تحریک کے زیراثر تیس سال کے اندر بیت المقدس پر آٹھ حملے کیے گئے۔ آخر میں صلاح الدین ایوبی نے اس کو ختم کیا۔

غلط بیانی

لیکن یہ فتنہ دبا نہیں' بڑھتا ہی گیا۔ مسلمانوں پر غلط الزام لگائے' تاکہ ان کی طرف سے بدظنی اور غلط فہمیاں پھیلیں۔ تمہیں ان الزامات کو سن کر حیرت ہوگی۔ کہا گیا کہ مسلمان ایک بت پرست قوم ہے اور محمد ایک سونے کا بت ہے' جو مدینے میں رکھا ہوا ہے۔ توحید سے انہیں کوئی تعلق نہیں بلکہ وہ ایک ایسی قوم ہے' جو دنیا میں صرف لوٹ مار کرکے اپنا پیٹ بھرنا چاہتی ہے۔ اب اس قسم کا پروپیگنڈا نہیں ہوتا کیونکہ خود وہاں مذہبی اداروں کی حالت خراب ہے۔ خود اپنے متعلق کچھ کہنے کھڑے ہوتے ہیں' تو عوام یہ کہہ کر آگے بڑھ جاتے ہیں کہ یہ پاگل ہوگیا ہے۔ لیکن صدیوں کا زمانہ گزر چکا' ان زہریلے خیالات کی اشاعت کی صدا کی بازگشت' اب تک یورپ میں موجود ہے۔ اور یہ زہریلا پروپیگنڈا کہ اسلام جو دراصل انسانیت کے لیے آب حیات ہے' زہر ہے' ان کے لٹریچر کا اہم جزو بن گیا ہے' ضرب المثلیں قائم ہوگئی ہے۔

سولہویں صدی میں دور جدید

پھر سولہویں صدی کا وہ زمانہ آیا کہ یورپ میں موجودہ تہذیب کی پیدائش ہوئی اور وہاں کے اداروں نے محسوس کیا کہ قرآن کا ترجمہ کیا جائے۔ اشاعت و تعلیم کا کالج قائم کیا گیا۔ شام سے اہل علم عیسائیوں کو بلایا گیا۔ قرآن کا تفسیر کے ساتھ لاطینی زبان میں

ترجمہ شائع ہوا۔ لاطینی اس وقت یورپ کی علمی زبان تھی۔ اس لیے لاطینی میں ترجمہ ہوا۔ اور یہی عربی کا پہلا ٹائپ ہے۔ جس میں پہلی مرتبہ یورپ میں قرآن شائع ہوا۔ اب حالت پہلی جیسی نہ تھی' لیکن اداروں اور مدرسوں میں پڑھنے والوں کی باگ انہیں کے ہاتھ میں تھی۔ اس لیے اعمال کی تعبیر جس حال میں کی گئی وہ برائیوں سے خالی نہ تھی۔ وہ اثرات ضائع نہ ہونے پائے۔ ان کا سلسلہ قائم رہا اور یہ حالت سترہویں صدی تک قائم رہی۔

انگریزی ہندوستان میں

اس کے بعد انگریز ہندوستان میں آئے۔ مسلمانوں سے ملے۔ پھر بھی جو کتابیں اسلام کے متعلق لکھی گئیں' وہ غلط فہمیوں سے پر اور غلط فہمیاں پیدا کرنے والی تھیں۔ مبلغین کے گروہ آئے۔ تبلیغ و اشاعت کے ادارے قائم ہوئے۔ اسلامی ممالک میں عیسائیت کی تبلیغ شروع ہوئی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ انکی تیار کردہ کتب از سرتاپا غلط تھیں۔ یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اگر مقدمہ غلط نہ تھا' تو تشریح غلط ضرور تھی۔

ہندوستان میں مسیحیت کی تبلیغ

انیسویں صدی میں ہندوستان میں عیسائیت کی تبلیغ کے لیے ایک ادارہ قائم کیا گیا۔ یہ وہی زمانہ ہے' جب مسلمانوں میں بیداری کی جنبش پیدا ہوئی۔ مولوی محمد حسن (1) اور ڈاکٹر وزیر خان (2) سینہ تان کر مدافعت کے لیے کھڑے ہوگئے۔ ڈاکٹر وزیر خان نے انگریزی زبان سیکھی' کتابوں کا مطالعہ کیا اور پادری فنڈرز (3) سے مناظرہ ہوا۔

اس وقت پادریوں نے جس شکل میں اعتراضات کیے تھے' وہ موجودہ یورپ کی ترجمانی نہ تھی۔ موجودہ دور کے یورپ نے چرچ کو شکست دے کر مذہب کا چولا اتار پھینکا ہے۔ مادی اور عقلی نشوونما کا دور ہے اور وہ مذہب کو کسی حال میں بھی ماننے کو تیار نہیں۔

مسلمان اور تبلیغ اسلام

لہٰذا تبلیغ اسلام کے لیے مسلمانوں کو دوسری صورتیں اختیار کرنی چاہئیں۔ عیسائی مشنریوں کا نمونہ سامنے موجود ہے۔ دیکھو' وہ کس طرح مذہب کی اشاعت کیا کرتے ہیں۔ جس زمانے میں ہندوستان میں تعلیم کا نیا دور شروع ہوا' اسی زمانے میں مصر اور ترکی میں بھی یہی مشنری اپنا کام کرنے لگے۔ لیکن ترکی میں اسلامی حکومت کی وجہ سے اپنے ارادوں میں ناکام رہے۔ البتہ مصر اور ہندوستان میں انہوں نے اپنا کام جاری رکھا۔ عیسائیوں کے اعتراضات مسلمانوں اور اسلام پر ہوتے رہے۔ یورپ کا ذہن اور اس کی مشنری الگ ہیں۔ ہر گروہ برابر حملے کرتا رہا۔ سبھوں کو جوابات دیے گئے۔ جن میں بہت سے اداروں نے جوابات کو مان لیا اور خاموش ہوگئے۔ کہیں ان کے دوسرے ساتھی برابر اپنے کاموں میں مشغول رہے' اور ان سب کا جواب اسلام میں بیک وقت موجود ہے مثلاً:

مسئلہ طلاق اور یورپ

عیسائی کہتے ہیں کہ ایک مرد کے لیے ایک وقت میں ایک ہی عورت کی ضرورت ہے اور ایک ہی رشتے میں دلفریبی اور خوشنمائی پیدا کی گئی ہے اس لیے طلاق غلط ہے' گناہ ہے' ایک الٰہی رشتے کو قطع کرنا ہے' یہ ان کا مقدمہ ہے۔

لیکن برخلاف اس کے نہ تو اسلام اس کو مقدس اور الٰہی رشتہ قرار دیتا ہے اور نہ اس کے انقطاع سے منع کرتا ہے' بلکہ اس کو محض ایک مرد اور عورت کے درمیان زندگی نباہنے کے لیے ایک معاہدہ تصور کرتا ہے' لیکن واجبات اور فرائض کے ساتھ۔ اگر اس معاہدے سے فرائض اور واجبات ادا نہیں ہوتے' تو پھر اسلام کے نزدیک یہ معاہدۂ اشتراک' سوسائٹی کے لیے تعذیب ہے۔ اس لیے اسلام حکم دیتا ہے کہ جب ایسا موقع آجائے' تو علیحدہ ہوکر چھٹکارا حاصل کرلو' اور زندگی خوشگوار بنانے کے لیے اپنا اپنا رشتہ اختیار کرلو' تاکہ دونوں کی زندگی راحت و سکون سے گزر سکے' کیونکہ اس معاہدے کا اس اشتراک جنسی کا' مقصد واحد راحت و سکون کی زندگی گزارنا ہے۔ تو جب ایسی زندگی نہ گزرے' تو زبردستی دونوں کو ساتھ رکھنا ظلم نہیں' تو اور کیا ہے۔

اس لیے طلاق بھی نکاح کی طرح راحت و سکون کے لیے ضروری ہے۔ لیکن مسیحیت اس سے بالکل مختلف ہے۔ خواہ راحت کی تلاش میں ایک بیوی سے وابستہ ہو کر تم پہلی راحت کو بھی کھو دو لیکن پھر گئی ہوئی راحت کو حاصل کرنے کے لیے تم اس سے الگ نہیں ہو سکتے۔

آج یورپ میں سب سے بڑا معاشری مسئلہ جس کی گتھیوں کو سلجھانے کے لیے واں کا بڑے سے بڑا دماغ مصروف اور پریشان ہے' وہ مسئلہ نکاح اور طلاق کا ہے۔ وہ محسوس کررہے ہیں کہ قومی ترقی کے لیے نکاح کی طرح طلاق بھی ضروری ہے۔ بلکہ وہاں کی نئی پود نے تو اکتا کر چرچ سے کھلم کھلا بغاوت کر کے ایک دوسرا طریقہ اختیار کرلیا ہے اور وہ طریقہ وقتی نکاح کا ہے۔ ایک مدت کے لیے نکاح کرلیتے ہیں' اور دیکھتے ہیں کہ اگر اچھی طرح نبھ جاتی ہے' تو پھر قائم رکھتے ہیں' ورنہ اس رشتے کو توڑ ڈالتے ہیں۔

سرسید کا اخلاص

یہی اعتراضات ہندوستان میں بھی عیسائی مشنریوں نے اسلام پر کیے تھے اور سب سے پہلے مخلص مسلمان سرسید تھے' جنہوں نے عیسائیوں کے اعتراضات کا جواب دینے کی سخت کوشش کی۔ لیکن انہیں سمجھانے کے لیے انہوں نے مذہب سے زیادہ عقل سے کام لیا۔ اور اسلام کی حقیقی تعلیم سے علیحدہ ہونے کا نتیجہ یہ نکلا کہ عیسائی پادریوں کے اعتراضات کو مذبذب طور پر لوگوں نے مان لیا اور اسلام کی تاویلیں شروع ہوگئیں۔ اور یہ مسئلہ مذبذب بن کر رہ گیا۔ اور اس یورپ کا جس کی روشنی میں یہ سب تاویلیں ہوگئیں' حال یہ ہے کہ سب سے بڑی پیاس تعدد ازدواج اور مسئلہ طلاق کا فیصلہ کرنا ہے اور یہ فیصلہ بہترین صورت میں تمہارے پاس موجود ہے۔ کاش کہ تم ان کے سامنے پیش کرو!

مغرب کے سامنے کیا پیش کرنا چاہیے۔

ان کے سامنے پیش کرنے کے لیے تمہیں کسی معجزے کی ضرورت نہیں۔ یورپ

مذہبی زنجیروں کو توڑ کر عقلی دور میں شریک ہو چکا ہے۔ یورپ کے موجودہ دور کا معیار وہ نہیں ہے' جو بدقسمتی سے ایشیا اور مشرق کے علماء نے سمجھ رکھا ہے۔ جب تم ان کے سامنے اسلام پیش کرو گے' تو وہ یہ نہیں دیکھیں گے کہ معجزات ہیں یا نہیں۔ بلکہ وہ اپنی پیاس بجھانے کے لیے سرد پانی اور اپنی بیماری کے لیے تریاق کی جستجو کرے گا' وہ ڈھونڈے گا کہ جس چیز کی اس کو ضرورت ہے وہ ہے یا نہیں؟ اور جہاں تک اسلام کا تعلق ہے تو میں کہہ سکتا ہوں کہ صرف عیسائیت کی نہیں' بلکہ اس کے دامن میں ساری دنیا کی نجات ہے۔ ساری دنیا کی بیماریوں کے تریاق کا سرچشمہ اس کی آغوش میں بہہ رہا ہے۔ دنیا کو صلائے عام دو' اور اس صورت میں کہ وہ تمہاری طرف جھک جائے۔ تمہارے پاس' تو ایک گھونٹ میں اس کی ساری بیماریوں کا علاج ہے۔ جب تم اس صورت میں پیش کرو گے کہ وہ سمجھ سکے' تو ضرور جھکے گی۔

اسلام کی تعلیم کس طرح پیش کی جائے؟

اب سنو! یورپ کا معیار یہ ہے کہ وہ جلد از جلد سوسائٹی کے تمام مسائل کو حل کرنا چاہتا ہے۔ ووہ ایسے لائحہ عمل کی تلاش میں ہے کہ جس کے ذریعہ سے زندگی امن و صحت کے ساتھ بسر ہو سکتی ہے۔ وہ رکاوٹیں جو راہ میں حائل ہو جاتی ہیں' باقی نہ رہیں' تو اس کی صورت صرف یہ ہے کہ اسلام کی تعلیم کو پیش کرو' لیکن اس سے پہلے اس مسئلہ کو حل کرو کہ یہ تعلیم کن صورتوں میں پیش کی جائے۔ اس کے لیے قدم بڑھانا چاہیے۔ اس میں نقصان نہیں' کوئی برائی نہیں۔ اگر تعلیم انسان کے لیے ہے' اور اس لیے ہے کہ زمین پر بسنے والے اس پر عمل کریں' تو اسی حالت میں' اسی صورت میں پیش کرو کہ وہ اسے دیکھ کر گھبرا نہ جائیں۔ اور اگر اس لیے ہے کہ اس پر فرشتے عمل کریں' تو تمہیں اختیار ہے۔

ناکامیوں کا علاج

سوچو اور غور کرو جو چیزیں تمہیں اس راہ میں ناکام بنا دیتی ہیں' وہ کیا ہیں؟ کس وجہ سے ہماری اجتماعی زندگی منتشر اور پراگندہ ہو رہی ہے اور اس کا حل کیا ہے؟ اس کا

حل صرف قرآن کی تعلیم پر ہے۔ قرآن خود سوسائٹی کے معیار کی پرکھ کے لیے یہ کسوٹی بناتا ہے کہ دیکھا جائے کہ اس سوسائٹی نے اپنی اجتماعی زندگی کے مسائل اور راہ میں آنے والی مشکلات کا حل کس طرح کیا! لیکن تم نے کبھی اس پر غور نہیں کیا۔ اپنی اجتماعی زندگی کے انتشار کو ختم کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔

یورپ والوں کی تلاش حق

یورپ کی قومیں ہیں کہ عمل کو اپنا رہبر اور عقل کو اپنی راہ کی روشنی بنا رہی ہیں' اور اس کے لیے ہمیشہ کوشاں ہیں کہ کوئی لائحہ عمل مل جائے۔ سب سے پہلے انہوں نے ایک نسخہ روما سے لیا۔ لیکن وہ ناکام ثابت ہوا۔ دوسرے دور میں انقلاب فرانس اور امریکہ کی آزادی نے انہیں جمہوریت کا پیغام سنایا۔ اس پیغام سے انہوں نے دوسرا نسخہ حاصل کیا اور اس کا استعمال بھی کیا۔ لیکن نصف صدی کے اندر ہی اندر یہ بھی ناکام ثابت ہوا۔ اس کے بعد انہوں نے طرح طرح کے نسخے تجویز کیے۔ ایک نسخہ روسو (4) کا تھا دوسرا کارل مارکس (5) کا تھا اور اسی طرح کے بہت سے حکیموں نے نسخے تجویز کیے۔ لیکن سب کے سب ناکام رہے۔ اور وہ اب بھی نئے نسخے کی تلاش میں سرگرداں ہیں اور مختلف نسخوں کو آزما رہے ہیں۔ لیکن ہر ایک نسخہ غلط ثابت ہو رہا ہے۔

نسخہ تمہارے پاس ہے۔

اور وہ نسخہ تمام صحت کے ساتھ تمہارے پاس ہے۔ تم اسے ان کے سامنے پیش کرو۔ وہ منظور کرلیں گے۔ عزیزان من! یہ غلطی نہ کھاؤ کہ مسیحی پادریوں کا مشن یورپ کا ترجمان ہے' اور یورپ تمہاری چیزوں کو منظور نہیں کرسکتا۔ یورپ کے مسیحی مبلغین اپنے منتشر شیرازے کو جمع کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔ یا دوسرے لفظوں میں یوں کہو کہ یورپ میں اپنے لیے جگہ نہ پاکر دوسرا میدان تلاش کررہے ہیں۔

مسیحی مبلغین یورپ کے ترجمان نہیں

اب ضرورت اس کی ہے کہ مسلمان اسے خوب سمجھ لیں کہ یہ غلطی جو ان کے دماغوں میں حلول کرگئی ہے کہ یورپ کے ترجمان عیسائی مبلغین ہیں اور یورپ ان ہی کے ذریعہ سے اپنی بیماری کا علاج ڈھونڈ رہا ہے' غلط ہے۔ سوسائٹی کے مسائل کا حل جس کی تلاش میں یورپ پریشان ہے' سوائے قرآن کے اور کہیں نہیں ہے۔ اور اگر تم اس آب حیات کو اس کے سامنے پیش کرو گے' تو یورپ قبول کرے گا' وہ نسخوں کو تلاش کرتے کرتے تھک چکا ہے۔ اس کی پیاس اب تک نہیں بجھی' اور اب وہ اس نسخے پر جھکنے کے لیے مجبور ہوگیا ہے۔

جمہوریت کا مفہوم

جمہوریت کے معنی یہ ہیں کہ طاقت و اقتدار چند افراد کے ہاتھ میں نہیں' پوری قوم کے ہاتھ میں رہے۔ اور مساوات کے معنی یہ ہیں کہ سب برابر ہوں۔ لیکن بعض لوگوں نے اپنے لیے کچھ اور ہی قانون بنا لیے ہیں' جن کی بنیاد خودغرضیوں اور تعصبات پر ہے۔ ایک طرف تو دنیاوی اور دوسری طرف مذہبی شہزادے پیدا ہوگئے ہیں۔ اور لوگوں کی اجتماعی زندگی ان دو پتھروں کے نیچے دب کر رہ گئی ہے۔ انقلاب فرانس اور امریکہ کی آزادی نے اس پتھر کو ہٹانا چاہا تھا لیکن ایک ہٹا تو دوسرا اس کی جگہ پر آگیا۔

نیا نسخہ اور اس کے اثرات

لوگ گھبرا اٹھے' تو ایک بالکل نیا نسخہ تجویز کیا گیا' جو اب روس میں سوشلزم کی صورت میں ہے۔ لیکن میں تمہیں بتا دوں۔ یہ نسخہ بھی غلط ہے' جس طرح پہلے نسخے غلط تھے۔ سوشلزم کو محض پہلی سرمایہ داری کا جواب سمجھو۔ پہلے جتنی قوت کے ساتھ سرمایہ داری تھی اب اتنی ہی طاقت کے ساتھ اس سے انکار ہے۔ ضرورت اعتدال کی ہے اور اس کا نام و نشان وہاں نہیں۔ اور میں تمہیں یہ بھی بتا دوں کہ دنیا جس چیز کو ڈھونڈ رہی ہے' وہ مساوات ہے' اور اس کی بہترین صورت تمہارے پاس ہے۔ دنیا کی ساری پریشانیوں کا حل وہ ہے' جو آج سے تیرہ سو سال پیشتر رسول عربی صلعم نے پیش

کیا تھا اور تیرہ سو سال سے متعصب نگاہیں اس میں سخت سے سخت نکتہ چینی کرتی رہیں۔ متعصب دماغ اس کی مضبوط جڑوں کو ہلانے کی کوشش کرتے رہے' لیکن کیا وہ اپنی لاحاصل کوششوں میں کامیاب ہوئے؟ یا کامیاب ہو بھی سکتے ہیں؟

اسلام کا سب سے بڑا معجزہ

اسلام کا سب سے بڑا معجزہ یہ ہے کہ اس کا ظہور عرب میں ہوا۔ اس کی پہلی کرنیں وہاں پھیلیں جہاں سخت ظلمت و تاریکی چھائی تھی۔ نہ حقیقت کی روشنی کہیں نظر آتی تھی اور نہ ان کی تاریکی پسند نگاہیں اس کو دیکھنا ہی چاہتی تھیں۔ عرب کا ہر فرد خود کو نوشیرواں اور خسرو سے کم نہ سمجھتا تھا۔ جماعتی گھمنڈ اتنا زیادہ تھا کہ ہر قبیلہ اپنے سوا دوسروں کو ذلیل سمجھتا تھا۔ اب تم آنکھیں کھول کر دیکھ لو' علم کی روشنی میں وہی حال یورپ کا ہے یا نہیں۔

عرب کی حالت

نسلی شرف کا یہ حال تھا کہ ہر شخص اپنے قبیلہ پر اتنا زیادہ مغرور تھا کہ اگر خود دوچار خون بھی کر دیتا تھا۔ تاہم دوسرے کے بدلے چار خون کرنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔

اسلام کے ظہور کے اثرات

اسلام کا ظہور اس وحشی قوم میں ہوا اور تیئیس برس کی مختصر مدت میں اس نے سارے عرب میں کچھ کا کچھ کر دیا۔ قرآن کے درس نے ان کے دلوں میں رشک و حسد کی دہکتی ہوئی آگ کو محبت کی تھپکیں دے دے کر ٹھنڈا کر دیا۔ اسلام نے اتنی کم مدت میں سب کچھ اس ملک میں کیا' جہاں کے بہادر اپنے سے نیچے کے ہاتھ سے میدان جنگ میں بھی مرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ وہاں اجلہ سادات قریش کا سردار ایک غلام کو بنایا جاتا ہے اور ابوبکرؓ اس کی رکاب تھامے چلتے ہیں۔ اور یہ خوش نصیب غلام جس کی رکاب آقا تھامے تھے' حضرت اسامہ بن زید تھے۔

اسلام کی تعلیم کا اثر

یہ تھا اسلام کا وہ عدیم المثال کارنامہ جو اس نے تئیس برس کی مدت میں پیش کیا۔ نسلی اور شخصی غرور کا نام تک نہ رہا۔ نظریوں کا سوال نہیں' بلکہ سوال اجتماعی زندگی کے مشکلات کے حل کا ہے۔ ان حلوں کو اسلام نے زندگی کا لازمی جز بنا دیا ہے اور جمہوریت کی وہ روح جو آج سے تیرہ سو سال پہلے پھونکی گئی تھی اور وہ جوہر جو اسلام نے پیش کیا تھا' آج بھی باقی ہے۔ آج کی ٹوٹی پھوٹی مسجدوں میں بھی ہر روز پانچ وقت تمہاری آنکھیں یہ سب کچھ دیکھ سکتی ہیں۔ اسلام کی اچھوتی قوت کو دیکھو۔ اسلام آج تیرہ سو سال سے حکومت کررہا ہے۔ تم میں سے ہزاروں اب بھی ایسے موجود ہیں جو اس کی تعلیمات سے بغاوت کرنا چاہتے ہیں۔ ان میں بھی جماعتی غرور کا شیوہ اختیار کرنے کی عادت پیدا ہوگئی ہے لیکن اس کی طاقتوں کے آگے سر نہیں اٹھا سکتے۔ بڑے سے بڑے اور چھوٹے سے چھوٹے درجہ کا آدمی پانچ وقت تو ضرور ایک ہی صف میں نظر آتا ہے۔ ہزار غرور اور تمکنت کے باوجود بھی اگر وہ مسلمان ہے' تو ضرور ایک ہی صف میں کھڑا ہوتا ہوگا۔ یہی ہے مساوات' اور اسی کی دنیا کو اشد ضرور ہے۔ اسلام کا بنایا ہوا لائحہ عمل یہی ہے' جو کبھی بیکار ہونے والا نہیں۔

یورپ کیا چاہتا ہے

یورپ اس وقت معجزوں کو تلاش نہیں کرتا' بلکہ اس کو حقیقی تلاش ایسی مساوات اور اجتماعی زندگی کے حل کی ہے' جو ان کے پاس نہیں' صرف آپ کے پاس ہے۔ آپ اس پر خود غور کریں۔ اور دوسروں کو دعوت فکر و عمل دیں۔

اسلام پر اعتراضات کا جواب

پھر ایسی بہت سی جماعتیں پیدا ہوگئی ہیں' جو اسلام پر بے دھڑک اعتراض کردیتی ہیں' لیکن خود مسلمانوں نے جواب دے کر ان کو بہت کچھ اہمیت دے دی ہے۔ یہ مسلمانوں کی غلطی ہے کہ وہ انہیں جواب دیتے ہیں اور یہ غلطی مسلمان ہمیشہ کرتے آئے ہیں۔ ایسی ہی ایک جماعت جو مسلمانوں پر ہمیشہ اعتراض کرنے کی عادی ہے'

آریوں کی ہے۔ یہ آج سے بہت پہلے سے اسلام پر اعتراض کررہی ہے' لیکن ہمیشہ ناکام رہی۔ ان سے پہلے عیسائیوں کے اعتراض سامنے آچکے ہیں اور ان کا بہت زیادہ اور شافی جواب دیا جاچکا ہے۔ اب ان ہی اعتراضات کو آریہ نیا جامہ پہنا کر سامنے پیش کر دیتے ہیں' پھر جواب مانگتے ہیں اور مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ ان میں بھی چند ایسے موجود ہیں' جو اسی پر چلا اٹھتے ہیں کہ ہندو مسلمانوں کو ہضم کرنا چاہتے ہیں اور اسلام کو مٹا ڈالنا چاہتے ہیں۔

ہاں' اگر تمہارے نزدیک اسلام کی جڑیں ایسی ہی کمزور ہیں' جو معمولی جھونکوں سے اکھڑ جائیں' تو یہ ہوسکتا ہے۔ اگر تمہارے نزدیک مسلمان ایسے ہی مجبور ہیں' تو آسانی سے ہضم ہوسکتے ہیں۔ میرے عزیزو! تم نے غلط سمجھا یا تم کو غلط سمجھایا جارہا ہے' میں بتا دینا چاہتا ہوں کہ اسلام اور مسلمانوں کا حریف اگر کوئی بھی ہوسکتا ہے' تو عیسائی مذہب اور عیسائی قوم ہے' دوسرا کوئی نہیں۔

ہندوستان میں آنے کے بعد

ہندوستان میں آنے کے بعد مسلمانوں میں یہ عیب بھی پیدا ہوگیا ہے کہ نسلی افتخار سے بھی آگے بڑھ کر وہ اکثر جماعتوں کو اپنے سے نیچا ہی نہیں' بلکہ ناپاک سمجھنے لگے ہیں۔ اسلام کسی کے جسم کو ناپاکی سے ملوث ہوئے بغیر ناپاک نہیں سمجھتا۔ وہ جسم کی ناپاکی کو بہت کم وقعت دیتا ہے' وہ دلوں کی ناپاکی کو ناپاکی سمجھتا ہے اور اسی کو اہمیت دیتا ہے۔ اس لیے تمہارا فرض ہے کہ اس برائی کو جو تم میں دوسروں کی دیکھا دیکھی پیدا ہوگئی ہے' دور کرو اور بہت جلد دور کرو۔

ایک مسلمان مہتر کو تم اس لیے اپنے ساتھ بٹھانے کے لیے تیار نہیں کہ وہ ظاہراً" ناپاک کام کرتا ہے اور خستہ حال رہتا ہے' خواہ وہ تہجد گزار عابد ہی کیوں نہ ہوں' اس کا دل ایمان کی شعاعوں سے منور ہی کیوں نہ ہو۔ اس کے برخلاف تم ایک سفید کپڑے پہنے ہوئے آدمی کو اپنے ساتھ بٹھا کر کھلانے کے لیے تیار ہو' خواہ اس کی روح کتنی ہی میلی' اس کا دل کتنا ہی تاریک اور اس کے اعمال کتنے ہی ناپاک کیوں نہ

ہو۔

میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ تم غلط وزن کرنے کے عادی ہو گئے ہو' اور اگر تم وزن کرتے ہو' تو تم خود غلط ہوتے ہو۔ جب تم خود غلط ہوئے' تو تمہارا ہر قدم غلط ہوگا۔ اور تم آنکھیں رکھتے ہو' تو پھر دیکھو کہ تمہارا ہر قدم خود غلط اٹھ رہا ہے۔

عزیزو!

اب وقت کم رہ گیا! اور جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ میری صحت زیادہ دیر تک بولنے کی اجازت نہیں دیتی' اس لیے اس طویل مبحث کو چھوڑ کر میں اپنے مقصد پر آتا ہوں یعنی یہ جلسہ تبلیغ و اشاعت کا ہے۔

تبلیغ کہاں کی جائے؟

اس لیے میں کہوں گا کہ پہلے سوچ تو لو کہ تمہیں کہاں تبلیغ کرنا ہے' اندرونی گوشوں میں یا بیرونی میدان میں۔ اگر اندرونی تبلیغ کرنا چاہتے ہو' تو بہت سی برائیاں تمہاری آنکھوں کے سامنے مذہب کے دامن پر رینگتی پھر رہی ہیں' ان کو دور کرو اور اگر بیرونی تبلیغ تمہارے پیش نظر ہے' تو کسی اقدام سے پہلے یہ معلوم کرو کہ دنیا کیا چاہتی ہے' اس کو کس چیز کی پیاس ہے اور تم اس کی پیاس کو کس طرح بجھا سکتے ہو؟ اور وہی چیز پہلے اس کے سامنے پیش کرو۔ ورنہ تمہاری کوششیں لاحاصل اور بیکار ہیں۔ دنیا کا رخ دیکھو' معلوم ہوگا کہ وہ اسی کو ڈھونڈ رہی ہے' جو پیغام اسلام کا ہے۔ اسلام کا پیغام نجات اور دائمی راحت ہے۔ پھر دنیا مسلسل مصائب سے گھبرا کر اسی کی تلاش میں ہے۔

نکاح اور طلاق

امریکہ کے صرف ایک صوبے میں پچاس کلب ایسے موجود ہیں' جو عقد موقت کی اشاعت کر رہے ہیں۔ یعنی لوگ ایک مدت کے لیے نکاح کریں' کیونکہ اگر مسیحی قانون کے مطابق نکاح کرتے ہیں' تو وہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ اور اگر دونوں کا میل نہیں ہوا تو دونوں کی زندگی مسلسل عذاب بن کر رہ جاتی ہے۔ معلوم ہوا کہ یہی فطرت کا اقتضا

تھا۔ وہاں شادیاں چار چار اور چھ چھ مہینوں کے لیے بھی ہوتی ہیں۔ لیکن تمہارے پاس یہ چیز جس کو وہ اب پا سکے ہیں' پہلے سے موجود ہے' اور عین فطرت ہے۔ اور اسی قسم کے دوسرے قوانین ہیں' جو عین فطرت کے مطابق ہیں۔ دیکھو ایک طرف تو نکاح کی اہمیت قائم ہے اور دوسرے ایسے ناگفتہ بہ مصائب سے گلوخلاصی کے لیے بھی دروازہ کھلا ہے۔

آج یورپ و امریکہ معاشرتی نظام کا نقشہ اور وہ بھی نامکمل بنا رہے ہیں' حالانکہ مکمل نقشہ اسلام میں ایک زمانے سے اور کامل طور پر موجود ہے۔

اسلام اور سوشلزم

انقلاب فرانس نے ایک نسخہ دیا تھا' لیکن پہلے کی جگہ دوسرے سرمایہ دار آگئے۔ مساوات کا دور ختم ہوگیا۔ پھر بڑے بڑے عزت حاصل کرتے رہے' باقی سب ذلت میں پڑ گئے۔ اس سے ثابت ہوگیا کہ جمہوریت کا نسخہ بھی غلط تھا۔ آج ہندوستان میں بھی اس کے مقلد موجود ہیں اور بہت زیادہ ہیں۔ لیکن اس کی وجہ کیا ہے؟ یہی کہ غلامی سے ہمارے دماغ ماؤف ہوگئے اور ہم یورپ کے سامنے جھک گئے۔

غلامی صرف ہماری قومیت پر ہی نہیں' بلکہ دماغ پر بھی طاری ہوگئی ہے اور اب جمہوریت کے بدلے ہمارے سامنے سوشلزم ہے۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ سوشلزم اسی وقت سامنے آتا ہے' جب انسان کے دل میں انتقامی جذبہ پیدا ہوتا ہے اور انتقامی جذبہ اس وقت پیدا ہوتا ہے' جب انسان مجبور ہو جاتا ہے۔

اسلام سرمایہ داری کے خلاف ہے

اسلام سے زیادہ سرمایہ داری کی مخالف کوئی جماعت نہیں۔ کوئی تحریک نہیں۔ اس کی سب سے پہلے کوشش یہ ہوتی ہے کہ گھر میں دولت جمع ہی نہ ہو۔ یہ نہیں کہ جب دولت جمع ہو جاتی ہے' تو وہ اسے بانٹنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ یہ چاہتا ہے کہ دولت ایک گھر' ایک خاندان ہی میں نہ رہے' بلکہ ہمیشہ چلتی اور پھیلتی رہے۔

اسلام کا ایک قانون ہے وراثت' باپ کی جائیداد تمام اولاد میں تقسیم ہو جاتی ہے۔

لیکن عیسائیوں میں بڑے بھائی کو ملتی ہے۔ بقیہ دوسروں کو صرف زندگی گزارنے بھر۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دولت نسل بعد نسل بڑھتی جاتی ہے اور جب تک دولت کا ابھاو ختم نہ ہو جائے' دنیا کو تسکین نہیں ہو سکتی' وہ ہمیشہ مضطرب رہے گی۔ اس لیے اسلام چاہتا ہے کہ دولت بٹ جائے' ایک جگہ جمع نہ ہو' بلکہ ہمیشہ پھیلی رہے۔

اگر یہ نہ ہوتا تو فطرت کے مطابق بھی نہ ہوتا۔ اسی لیے اسلام نے دولت کی تقسیم کی بہترین صورت پیش کی اور اس وقت جب' دنیا اتنی ہی تاریکی میں تھی' اب اگر تم چاہتے ہو کہ اسلام کی تبلیغ اور اشاعت ہو' تو سب سے پہلے تم خود ان تمام باتوں کو سمجھو۔ ان مقدس تعلیمات پر غور کرو کیونکہ اگر تم خود سمجھ کے پیش نہ کرو گے' تو دوسرے کیا سمجھیں گے۔

اس سے زیادہ شرم کی اور کیا بات ہو سکتی ہے کہ جو یورپ اور امریکہ میں تبلیغ کا خواب دیکھ رہے ہیں' اپنی ہمسایہ قوم کو اب تک نہیں سمجھا سکے۔ پھر یہ کس درجہ شرمناک ہے کہ تم سے اب تک اتنا بھی نہ ہو سکا کہ اپنے اللہ کے پیغام کو' دین فطرت کی تعلیم کو دنیا کی سب زبانوں میں نہ سہی' تو کم از کم ملک کی زبان میں اہل ملک تک پہنچا سکو۔ بتاؤ تم نے انگریزی میں ہندی میں' بنگالی میں' گجراتی میں' تلگو میں' پنجابی میں یا ملک کی اور زبانوں میں' کونسا مستند ترجمہ قرآن ملک اور اہل ملک کے سامنے پیش کیا ہے؟

تو پھر کیا اسی پر تبلیغ کا خیال ہے' جب تم قرآن مجید کو غیر مسلموں تک نہیں پہنچا سکتے' اللہ کے پیغام کو صحیح اور درست طریقے پر نہیں سمجھا سکتے' تو تم کس طرح امید کر سکتے ہو کہ تبلیغ اسلام کر سکو گے!

عزیزو!

وقت بہت زیادہ ہو گیا اور اب تقریر کا ختم ہونا ضروری ہے۔ مجھے جو کچھ کہنا تھا' کہہ چکا اور اب اس کا سمجھنا آپ کے لیے ہے۔

آخر میں یہ کہوں گا کہ جو لوگ تبلیغ دین کا جوش رکھتے ہیں' وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ لیکن میں ان سے پھر یہی کہوں گا کہ اس ابتدا کو انتہا نہ سمجھیں' اس پہلی منزل

کو منزل مقصود نہ سمجھیں۔ ان کی کوششیں مجلسوں' محفلوں اور سالانہ جلسوں تک نہ ختم ہو جائیں۔ میری دعا ہے کہ اللہ پاک ان کی نیتوں کو خیر اور استقامت بخشے!

ہندوستانی کمیٹی' بہار

1937ء

آپ حضرات مجھے اجازت دیں کہ میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں' وہ کہوں۔ ملنے کا مقررہ وقت تین تھا۔ لہذا ضروری تھا کہ میں تین بجے آجاؤں۔ لیکن اتفاق کہ دیر ہوگئی۔ چنانچہ سب سے پہلے میں جو مشورہ آپ کو دینا چاہتا ہوں' وہ یہ ہے کہ ہم سب آداب مجلس کی پابندی کیا کریں' اور پہلی شرط آداب مجلس کی یہ ہے کہ جلسے میں وقت مقررہ پر شریک ہوا کریں۔

میں یہ ہرگز نہیں پسند کروں گا کہ اب جو محدود وقت اس وقت ہمارے قبضے میں ہے' اسے اصل مقصود کے سوا' دوسری چیز میں صرف کیا جائے۔ اس سے پہلے بھی دو ایک جلسے ہو چکے ہیں۔ اور میں امید کرتا ہوں کہ جو حضرات اس وقت اس جلسے میں شریک ہیں' ان کی اکثریت گزشتہ جلسوں میں موجود تھی۔ میں چاہتا تھا کہ بحث و نظر کے لیے ایک مرتب سلسلہ آپ حضرات کے سامنے پیش کروں' اور میں نے وعدہ بھی کیا تھا کہ اسی ترتیب کے ساتھ آپ کے ساتھ چلوں گا۔ یہ پہلی بار ہے کہ اس سلسلہ میں مجھے غور کرنے کا موقعہ ملا' اور میں نے محسوس کیا کہ میں آپ کے سامنے وہ چیز پیش کروں' جو وقت کی اہم ضرورت ہے' جس ترتیب کی چال سے میں چلنا چاہتا تھا' اگر چلتا تو وہ تین منزلوں کے بعد ضرور اس موضوع پر پہنچتا' جسے میں آج آپ کے

سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں۔ وہ موضوع اس قدر اہم ہے کہ ہر شخص کے سامنے آتا ہے۔ اس لیے ضروری ہوا کہ یہ مسئلہ ہمارے سامنے زیادہ صاف اور روشن شکل میں آجائے۔

زبان کا مسئلہ

جو ترتیب جلسے کی میرے سامنے تھی اس سے میں ذرا ہٹنا چاہتا ہوں۔ اور جس چیز پر میں آپ کو غور و فکر کی دعوت دوں گا' وہ چیز زبان کا مسئلہ ہے' اور اس مسئلہ کی جو اہمیت ہے وہ ظاہر ہے۔ وہ جماعت جو قوم کا لقب اختیار کرتی ہے' اس کے لیے یہ مسئلہ بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر کوئی قوم' یا جماعت اس شرط کو پورا نہیں کرتی' جو زبان سے متعلق ہے' تو اس کے بغیر وہ ایک قدم نہیں چل سکتی۔ زبان کا مسئلہ نہایت اہم ہے' اس مسئلے کو قدرتی طور پر ہندوستان میں ابھرنا تھا' اور وہ ابھرا۔ ہندوستان اس وقت مختلف ٹکڑوں کا نام ہے' اور ان ٹکڑوں کی مختلف جغرافیائی حیثیت ہے۔ اس ملک میں مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں۔ اگر ہندوستان کے آگے قومی زبان کا مسئلہ آتا ہے' تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ زبان ایک ہو۔ کیونکہ ہر ٹکڑا اپنی ایک تاریخ رکھتا ہے۔ جس کا تعلق اس کی معاشرتی زندگی سے ہوتا ہے' اس کی مقامی زبان ہوتی ہے۔ میرے وہ قدرتی جذبات جو مقامی زبان کے بارے میں ہیں' یہ ہیں کہ وہ زبان جو سب سے پہلے ماں کی گود سے نکل کر بچے کے کان سے ٹکرائے۔ اگر آپ کسی بناوٹی ذریعہ سے' منطق یا مصلحت سے' کوشش کریں کہ وہ جذبات بھی جو ماں کی گود سے اٹھتے ہیں' مصلحت میں شامل ہو جائیں' تو میرا خیال ہے کہ اس کے لیے زمانہ درکار ہے۔

اس لیے قدرتی طور پر ہندوستان میں قومی زبان کے مسئلے نے نازک صورت اختیار کرلی۔ اگرچہ یہ خاص ایسا الجھاؤ نہیں ہے جو صرف ہندوستان میں پیش آیا ہو۔ میں آپ کو بتاؤں گا کہ متمدن ممالک میں بعض ایسے حصے ہیں' جہاں پانچ پانچ زبانیں تسلیم کرنی پڑی ہیں' اور انھوں نے ان پانچوں زبانوں کو اس طرح تسلیم کیا ہے کہ انھیں وہ تمام حقوق عطا کر دیے جو کسی قومی زبان کو عطا کیے جاتے ہیں۔

یہ کوئی ایسی دشواری نہیں ہے' جو صرف ہمارے سامنے پیش آئی ہو۔ ہر ملک کی خاص دشواریاں ہوتی ہیں۔ اور ہمارا فرض ہے کہ ہم ان دشواریوں پر غالب آجائیں۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم اس مسئلے پر غور کریں اور اس کا جو صحیح فیصل ہو' اسے ہمارے سامنے ہونا چاہیے۔ بہت ممکن ہے کہ اس سلسلہ میں جذبات کی راہ سے کچھ اثر اس فیصلے پر پڑے' مگر کچی رائے سے یہ منزل طے نہیں کی جا سکتی۔ اس کی بنیاد محض وقتی جذبات پر نہ ہونا چاہیے' بلکہ منطق اور ٹھوس دلائل پر ہونا چاہیے۔ یہ سوال' وقت اور موسم کا سوال ہے۔ اور مجھے امید ہے کہ یہ سوال آپ کے دلوں کو ملتفت بھی کر سکے گا۔ لہٰذا میں اسی سوال پر آپ کے غور و فکر کو دعوت دوں گا۔

یہ معاملہ بہت وسیع ہے' اگر اس کا صرف ایک پہلو بھی لیا جائے' تو اس کے لیے متعدد مجلسوں کی ضرورت لاحق ہوگی۔ اور مجھے صرف اسی مجلس میں مختلف مراحل طے کرنے ہیں۔ اس لیے میں کوشش کروں گا کہ تمام مراحل جلد جلد اس مجلس میں طے کرلوں۔

پہلا مرحلہ جو ہمیں طے کرنا ہے' وہ تاریخ کا ہے۔ مگر میں تفصیل میں پڑنا نہیں چاہتا۔ بنابریں تاریخ کے لیے صرف سرسری اشاروں کو جگہ دی جائے گی۔

دوسری چیز قدرتی طور پر سامنے یہ آتی ہے کہ اٹھارہویں صدی میں جس میں ہندوستان کی بہت بڑی زبان اردو کو سر اٹھانے اور پھیلنے کا موقعہ ملا' حالات کیا تھے' اس لیے کہ ہم کسی گوشے میں بھی جائیں' اس درمیانی کڑی کو بھول نہیں سکتے۔

تیسرا سوال یہ ہے کہ موجودہ حالت کیا ہے اور اس کی پیاس کیا ہے' نیز وہ کیوں کر بجھ سکتی ہے جہاں تک تاریخ کا تعلق ہے' بہت سی چیزیں آپ حضرات کے سامنے سے گزر چکی ہیں اور ان بنیادی چیزوں میں سے جسے آپ جانتے ہیں ایک یہ ہے کہ چھٹی صدی عیسوی میں ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے پہلے ہندوستان کی کیا حالت تھی' اس پر کافی روشنی پڑ چکی ہے اور اس وقت جو دور گزر رہا تھا' اس کا بھی حال آپ لوگوں کو معلوم ہے۔ ہندوستان میں اس قدر زبانیں موجود ہیں کہ شمار کیا جائے تو وہ زبانیں جو معاشرتی ضروریات کو پورا کرتی ہیں ان کی تعداد 127 تک پہنچتی ہے۔

بارھویں صدی عیسوی میں بحیروں نے ہندوستان کی حالت کا نقشہ کھینچا ہے۔ اور ابن خلدون نے بھی اس پر کافی بحث کی ہے۔ اس وقت ہندوستان میں جو زبانیں پیدا ہو چکی تھیں، وہ پراکرت کہلاتی تھیں۔ اور سنسکرت کو مقدس اور مذہبی زبان کا درجہ حاصل تھا۔ اگر کالیداس کے ڈراموں کو دیکھا جائے، تو معلوم ہوگا کہ دربار کے اعلیٰ طبقے کی زبان سنسکرت ہوتی تھی، اور بادشاہ بھی درباریوں کے سامنے جب کبھی زبان کھولتا، تو سنسکرت میں گفتگو کرتا تھا۔ دربار کی زبان اگرچہ سنسکرت تھی، مگر دربار میں جو مختلف گوشوں کے لوگ ہوتے تھے، ان کی عام بول چال پراکرت زبان میں ہوتی تھی۔

چھٹی صدی عیسوی سے پہلے مختلف زبانیں پیدا ہو چکی تھیں، اور سنسکرت بول چال کی زبان نہیں رہی تھی۔ اس کی حیثیت فقط علمی، مذہبی اور شاید درباری زبان کی تھی۔ ملک کی تمام بول چال دوسری زبانوں میں تھی۔ یہ پراکرت زبانیں مختلف گوشوں میں پیدا ہوئیں۔ شمالی ہند میں بھی ایک مختلف زبان پیدا ہوئی۔ مثلاً ہمیں برج بھاشا کا پتہ ملتا ہے۔ اودھ کی بھی ایک زبان بن چکی تھی۔ ان چیزوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان زبانوں کا ابتدائی مادہ بھی ایک ہی تھا، اور زبان کا قدرتی قاعدہ بھی ایک تھا۔ اختلاف جو کچھ تھا، وہ فقط لب و لہجہ کا تھا۔ اور اس لب و لہجہ کا اختلاف البتہ زبانوں پر اثر ڈالتا تھا۔ شمالی ہند کی زبانوں میں اب تک پنجاب کی زبان موجود ہے۔ چودھویں صدی میں گرونانک کی زبان میں جو اشارے ملتے ہیں، وہ اپنے ابتدائی مادوں میں شمالی ہند سے الگ نہیں تھے۔ علم اللسان کی رو سے دیکھا اور ان کی لغات سامنے رکھی جائے تو معلوم ہوگا کہ ان زبانوں کے مصادر وغیرہ ایک تھے۔ لب و لہجہ کا اختلاف جو تھا، ان کے اثر سے مختلف زبانیں پیدا ہو گئیں۔ چنانچہ اودھ میں برج بھاشا کی زبان کا پتہ چلتا ہے۔

اس کے بعد مسلمان آئے، ابتدائی دور میں معلوم نہیں زبان کا کیا رنگ تھا، مگر لوگوں کے میل جول سے جو زبان پیدا ہو چلی تھی، اور سعد سلمان کے قصائد میں جس زبان کا اکثر تذکرہ کیا گیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ زبان ہندوی تھی۔ امیر خسرو نے بھی اپنی نظم "نہ سپہر" میں جس میں ہندوستان کی خصوصیات کے ساتھ مختلف باتیں بیان کی گئی ہیں، اس زبان کو جابجا ہندوی ہی سے تعبیر کیا ہے۔ یہ عہد ابتدائی عہد تھا،

اور مسلمان اب فاتح کی حیثیت سے نہیں' بلکہ باشندوں کی حیثیت سے بسر کرنے لگے تھے۔

شمالی ہند میں عام طور پر ایک زبان بولی جاتی تھی' جو قدرتی طور پر آپس کے میل جول کا نتیجہ تھا۔ لیکن جب وسط ایشیا کے باشندے عربی اور فارسی ساتھ لیے ہوئے آئے' تو ان کے بہت سے الفاظ ہندوستان کی زبانوں میں مل گئے اور ایک ملی جلی صورت پیدا ہونے لگی۔ نیز لہجہ کے اختلاف کا بھی زبان پر اثر پڑا اور برج بھاشا اور اودھ کی زبان ایک نئی منزل سے گزرنے لگی۔

خالق باری جو امیر خسرو کی طرف منسوب ہے' اگر اسے تسلیم کرلیا جائے اور نہ تسلیم کرنے کی کوئی وجہ نہیں' تو جو نقشہ ہمارے سامنے آتا ہے' وہ اپنی بنیاد کے اعتبار سے' اس میں کوئی شک نہیں کہ جو زبان ہم آج استعمال کررہے ہیں' وہی ہے جس کا اشارہ خالق باری میں کیا گیا ہے۔ غرض یہ ایک دور تاریخ کا تھا' جو زبان پر گزرا۔

جہاں تک دکن کا تعلق ہے' وہاں مسلمانوں نے شمالی ہند سے جاتے ہی ایک سلسلہ حکمت قائم کر دیا۔ اور وہاں بھی ایک عام بول چال پیدا ہوگئی۔ نامناسب نہ ہوگا اگر اس کا نام دکنی زبان رکھ دیا جائے۔

اگرچہ وہاں کی زبان موجودہ زبان سے قدرے مختلف ہے' لیکن بہرحال واں بھی ایک زبان نشوونما پا رہی ہے اور جہاں تک وہاں کی مسلمان حکومت کا تعلق ہے' وہاں اب ایک عام زبان تسلیم کرلی گئی۔

اب بیچ کا زمانہ آتا ہے' یہ زمانہ تاریخی نزاع سے بالکل پاک ہے۔ ملک کی ایک عام زبان تسلیم کرلی گئی ہے اور وہ زبان عام طور پر بولی جارہی ہے اور جہاں تک ان ساری شرائط کا تعلق ہے جو ایک ملکی زبان میں ہونی چاہئیں' وہ سب اس میں موجود ہیں۔ اس لیے جہاں تک بول چال کا تعلق ہے' اس زمانے کو آپ بلا کسی تردد' جھجک اور تذبذب کے بابر اور اکبر سے شروع کرسکتے ہیں۔ اکبر کے عہد ہی میں وہ زبان جسے اردو سے تعبیر کیا جاتا ہے' نشوونما پاچکی تھی' اور عام طور پر بولی جاتی تھی' نیز باہر کے بسنے والوں نے بھی اسے تسلیم کرلیا تھا۔

اکبر کی جو درباری اور علمی مجالس ہوا کرتی تھیں۔ ان مجالس کی زبان غالباً فارسی ہوگی میر فتح اللہ شیرازی شیراز سے آئے تھے اور اکبر کے دربار میں ایک گرانقدر عہدے پر فائز تھے' ابوالفضل' فیضی اور عبدالقادر بدایونی کے ساتھ ان مجالس میں میر فتح اللہ شیرازی بھی شریک ہوتے تھے۔ اس لیے ظاہر ہے کہ وہ مجلس کی زبان کیونکر سمجھتے ہوں گے۔ اور جب میر فتح اللہ شیرازی بحث میں عام حصہ لیتے ہوں گے' تو وہ کس زبان میں لیتے ہوں گے۔

لیکن اب مجھے شواہد مل گئے ہیں کہ مجلس کی زبان فقط فارسی نہیں ہوگی۔ مغلوں کا یہ خاندانی اثر تھا کہ وہ اپنی خاندانی زبان ترکی رکھنا چاہتے تھے' اور بچے پیدا ہوتے ہی ترکی ملاؤں کے سپرد کردیا جاتا تھا۔ یہ ملا خالص ترکی نسل ہوا کرتی اور خاص اس غرض سے وطن سے بلوائی جاتی۔ ان ملاؤں کے سپرد کردینے کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ ان بچوں کے کانوں میں اوائل سے جو زبان ٹکراتی' وہ ترکی اور فارسی ہوتی۔ یہ سلسلہ تربیت شروع سے آخر تک قائم رہا۔ حتیٰ کہ شاہ عالم کے زمانے تک اس خاندان کی تربیت اسی طور پر ہوتی رہی۔ اس ابتدائی تربیت کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ شاہی خاندان کی زبان خالص فارسی اور ترکی ہوا کرتی اور ان کی زبان میں دوسری زبان کی آمیزش نہیں ہو سکتی تھی۔

اس لیے ظاہر ہے کہ مجلس کی زبان فارسی زبان میں محدود نہیں ہوتی ہوگی بلکہ مختلف بحثیں یقیناً اس زبان میں ہوتی ہوں گی' جو ملکی ہوگی اور اسے بغیر تردد کے تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ اس زمانہ میں ملکی زبان اردو ہی تھی۔ البتہ یہ بات صاف ہے کہ ملک کی تعلیمی اور سرکاری زبان فارسی تھی۔

اس کے بعد اٹھارھویں صدی کا زمانہ آتا ہے۔ ایک قوم سمندر پار سے آتی ہے اور سیاسی قوت حاصل کرنے لگتی ہے۔ ان کی ضرورتیں بڑھتی ہیں اور ان کے میل جول سے معاشی ضروریات کی مشکلات پیدا ہونے لگتی ہیں۔ اس سلسلے میں چند چیزیں ہمارے سامنے آتی ہیں ان میں سے ایک چیز یہ ہے کہ اب وہ زبان صرف بول چال کی زبان نہیں ہے' بلکہ شاعری کی زبان ہے۔ اکثر موقعوں پر دیکھا گیا ہے کہ نثر سے پہلے

نظم نے سر اٹھایا ہے' اس لیے وہ زبان سترہویں صدی کے اواخر اور اٹھارہویں صدی کے اوائل میں نظم کی زبان تھی۔

شاعری کی ابتدا کیونکر ہوئی' کس طرح ہوئی' کہاں ہوئی؟ میں ان تفصیلات میں جانا نہیں چاہتا۔ کہا جاتا ہے کہ شاعری کی ابتدا دکن سے ہوئی' لیکن ولی دکنی کو جو شاعری کا باوا آدم مانا جاتا ہے' یہ قطعی غلط ہے۔ ولی وغیرہ کو شاعری کی پہلی صف میں جگہ دینا غلط ہے کیونکہ واقعات و شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ ولی سے ایک سو برس پہلے اس زبان میں نظم لکھی جا چکی تھی' ہاں اس میں البتہ شک نہیں کہ شاعری کی ابتدا دکن سے ہوئی۔

ولی کا زمانہ درحقیقت ایک تاریخی زمانہ ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب اس زبان کو فارسی محاورات اور فارسی تمثیل سے آشنا کیا گیا' جس کی تکمیل میر و سودا کے ہاتھوں ہوئی' اور ولی ان میں سے ایک تھا۔

سردست یہ زبان سترہویں صدی کے اواخر میں شاعری کی زبان ہو چکی ہے۔ اس زبان کی شاعری اب تکمیل کے درجے تک پہنچ رہی ہے اور مذہبی ضرورتوں نے بھی مجبور کرکے اس میں نثر کا مواد جمع کر دیا۔

اب ایک منٹ کے لیے ہمیں رکنا چاہیے۔ زبان کے نام کا جہاں تک تعلق ہے' اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس کا نام ہندی ہے۔ ابتدائی اشارات بھی مثلاً امیر خسرو کی نظم "نہ سپہر" سعد سلمان اور غزنوی شعرا کے کلام' اعجاز خسروی وغیرہم میں اس زبان کو ہندوی سے منسوب کیا گیا ہے اس لیے آپ دیکھیں گے کہ عام طور پر زبان کا نام ہندوی ہے۔

اردو نثر کی سب سے پہلے جو چیزیں وجود میں آئیں۔ ان میں پہلی چیز قرآن حکیم کا ترجمہ ہے سب سے پہلے حضرت شاہ ولی اللہ نے قرآن حکیم کا ترجمہ فارسی زبان میں کیا اور پھر وہ وقت آیا کہ شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین نے اس کا ترجمہ 1810ء میں اردو میں کیا۔ شاہ عبدالقادر دیباچے میں لکھتے ہیں کہ ضرورت کے ماتحت اسکا ترجمہ ہندی زبان میں کر رہا ہوں۔ اس ترجمہ کے محرک سید احمد بریلوی ہوئے تھے۔ پھر اس کے بعد مولانا اسماعیل شہید نے ایک کتاب تقویت الایمان لکھی اور انھیں اصلاح کی

ضرورتوں نے مجبور کیا کہ وہ اس کتاب کو سہل اور آسان زبان میں لکھیں اور انہوں نے بھی یہی لکھا کہ میں اس کتاب کو ہندی میں لکھ رہا ہوں۔

اٹھارویں صدی میں قدرتی طور پر اس زبان کا نام ہندی پڑنا تھا اور ہندی پڑا۔

پریس کا جہاں تک تعلق ہے۔ ہندوستان میں پریس سب سے پہلے کلکتہ میں آیا۔ یہاں کئی دروازے اب ایسے کھلتے ہیں، جو وہاں نہیں کھلتے تھے اور اردو زبان کی تاریخ کی متعدد کڑیاں کلکتے میں ملتی ہیں۔ اسی زمانہ میں ایک دوسرا لفظ بھی اٹھا، اور وہ ریختہ تھا۔ ریختہ کی خاص خصوصیت تھی۔ شاہ عبدالقادر کی تعریف ریختہ کے بارے میں بہترین ہے۔ وہ ہندی اور ریختہ میں یہ فرق کرتے ہیں کہ وہ ترجمہ جو عام، سہل اور آسان، ٹھیٹ زبان میں ہوتا، اسے وہ ہندوی کہتے ہیں اور وہ زبان جو شاعری کی فارسی آمیز زبان تھی، اسے وہ ریختہ کے نام سے پکارتے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ ترجمہ ہندی زبان میں ہو، نہ کہ ریختہ میں۔ ولی کے بعد شاعری نے جو نشوونما پائی وہ فارسی آمیز تھی اور اسے ریختہ سے تاویل کیا جاتا تھا۔ ٹھیٹ اردو کو ہندی کہتے تھے۔

اردو کا نام

اب یہاں دیکھنا چاہیے کہ اردو کا تسمیہ کیونکر شروع ہوا، اردو کے متعلق سب سے پہلے تذکرہ میرامن نے کیا۔ میرامن کو کلکتے میں جان گل کرسٹ نے بلایا، تاکہ اس طرح کی چیزیں تیار کی جائیں، جو عام بول چال میں ہوں۔ چنانچہ فورٹ ولیم کالج میں ایک بورڈ بنایا گیا۔ اسی سلسلے میں شیر علی افسوس وغیرہ بھی بلائے گئے اور باغ و بہار لکھی گئی۔

میرامن نے جو کام کیا، وہ عجیب و غریب ہے۔ اس وقت صاف اور سلیس زبان کا نمونہ پیش کرنا، جو دریا کی طرح رواں ہو، بہت دشوار تھا، کیونکہ زبان ہنوز صاف نہیں ہوئی تھی۔ اس وقت بھی کہ اردو ارتقا کی کئی منزلیں طے کر چکی ہے، چار درویش اپنی جگہ پر قائم ہے، اور شاید ہمیشہ قائم رہے گا۔

بادشاہ اور امراء کا بڑا حصہ لشکری زندگی میں بسر ہوتا تھا، یہاں کیمپ کی زندگی کے

جو معنی ہیں وہی معنی اردو کے بھی تھے۔ لشکری زندگی' دائمی زندگی کی سی ہو گئی تھی۔ لشکر کی زبان چونکہ عام زبان سے زیادہ ٹکسالی تھی' اس لیے آہستہ آہستہ یہ تصور پیدا ہوتا گیا کہ جو زبان زیادہ ٹکسالی اور فصیح ہوتی' وہ اردو کی زبان کہلاتی' کیونکہ اس زبان میں گلیوں کی زبان میں بہت فرق ہوتا اور عام طور پر یہ سمجھا جاتا کہ شستہ بولی فقط اردو میں پائی جائے گی۔

دلی میں ایک اردو بازار بھی تھا اور قلعہ کے باہر سب سے شاندار بازار وہی تھا۔ بہت ممکن ہے کہ وہ جو اردو بازار تھا اس کے معنی یہ ہوں کہ وہ اردو کا بازار تھا' اور اردو سے مقصد غالباً زبان کی زیادہ شائستہ حالت تھی۔

انشاء اور قتیل دونوں نے دریائے لطافت لکھی ہے۔ دریائے لطافت ہی ایک ایسی کتاب ہے' جو معلومات کا بہت قیمتی ذریعہ ہے۔ دریائے لطافت میں انشاء نے زبان کے بہت سے نمونے پیش کیے ہیں' جن میں علامہ تفضل حسین وغیرہ کا نمونہ خاص دلچسپی اور اہمیت رکھتا ہے۔

یہی وہ کڑی ہے' جہاں قدرتی طور پر شاعری اور تعلیم کے اثر سے یہ زبان فارسی سے بہت متاثر ہوگئی ہے۔ ٹھیٹ اردو کا مقصد اب یہ رہ گیا ہے کہ وہ زبان جس میں فارسی اور عربی تراکیب کا اثر کم ہو اور وہ عام بول چال کی زبان ہو۔ وہ زبان جو فارسی رس اور فارسی مصادر میں ڈوبی ہوئی ہے وہ علمی زبان ہے اور وہ زبان جو بول چال کی زبان ہے' ٹھیٹ ہے' یہ اردو فارسی کی تراکیب سے تقریباً خالی ہے۔

دلی کے بعد لکھنؤ زبان کا دوسرا مرکز بنا اور دلی و لکھنؤ کے مابین زبان کے مسئلے میں بڑا تغیر پیدا ہوگیا۔ دلی کا رجحان یہ تھا کہ جو صاف زبان ہے' یہی رہے۔ لیکن لکھنؤ میں جو دور شروع ہوا' وہاں یہ تغیر واقع ہوا کہ جہاں تک ممکن ہے فارسی کے مغلق اور موٹے الفاظ بولے جائیں' چنانچہ اس کی مثال میر انشاء کے بیان سے بخوبی ملتی ہے۔ میر انشاء نے مرزا صاحب کی ملاقات کے سلسلہ میں اپنی تحریر اور مرزا صاحب کی تحریر کا جو نمونہ پیش کیا ہے' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زبان میں کس قدر تغیر پیدا ہوگیا تھا۔ مرزا صاحب کہتے ہیں۔

"اپنے تئیں بھی ایسے لوگوں سے علاقہ رہا"

مگر میر انشاء نے اپنی جو زبان لکھی ہے، وہ دو خصوصیت کی نمائندگی کرتی ہے، ایک تو یہ کہ وہ بہت سخت ہے، اور دوئم وہ زبان، وہ ہے جو اس وقت لکھنؤ کے 'دنچے' طبقے میں بولی جاتی ہے، مرزا صاحب کی زبان وہی سیدھی اور صاف ہے۔

مگر اس کے باوجود اٹھارہویں صدی کے اوائل میں بھی ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس زمانے میں بھی زبان کا نام ہندوی دیا جاتا تھا۔

مجھے بخوبی یاد ہے کہ والد مرحوم کی زبان سے میں نے کبھی اردو کا نام نہیں سنا! وہ ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ یہ ہندی کی کتاب ہے، اور یہ اس وقت استعمال کرتے تھے جب خلاصے کے بارے میں گفتگو کرتے۔ وہ کہتے کہ یہ خلاصہ ہندی میں ہے، یا یہ خلاصہ کیدانی میں ہے۔

اس زمانے یعنی 1821ء میں چند کتابیں فارسی میں لکھی گئیں اور پھر اردو میں ترجمہ ہوئیں۔ یہ ترجمے بہت مستند اشخاص مثلاً قاضی احمد گوپاموی وغیرہ نے کیے اور انہوں نے بھی تسلیم کیا ہے کہ یہ زبان ہندی ہے۔ اس لیے جہاں تک تسمیہ کا تعلق ہے، وہ دونوں نام استعمال کرتے ہیں، یعنی ہندی بھی اور اردو بھی۔

وہ زبان جو بہت فارسی آمیز تھی، اسے اردو کے نام سے یاد کیا جانے لگا اور ہندی صاف اور صحیح اردو سمجھی جاتی تھی۔

دو لغت بھی جو انگریزی میں لکھے گئے، اسے ہندوستانی میں لکھا گیا اور متعدد انگریزی چیزیں جو ہمارے سامنے آئیں، انہیں بھی ہندوستانی کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے۔

جہاں تک اردو زبان کی نثر کا تعلق ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس میں بہت بڑا احسان انگریزوں کا ہے۔ مگر یہ احسان اس لیے نہیں تھا کہ انہیں اردو سے کوئی خاص ہمدردی تھی، بلکہ ان کا مفاد اور سیاسی اغراض سب کے سب اسی امر پر موقوف تھے کہ اردو کو ترقی دی جائے۔ چنانچہ انگریزوں کے گردوپیش کوئی دوسری جماعت ہوتی تو وہ بھی یہی کرتے۔ ان کا سیاسی اقتدار اس قدر بڑھ گیا تھا کہ وہ ہر امر میں دخل دیتا

چاہتے تھے' مگر انہیں بڑی دشواریاں پیش آتی تھیں کیونکہ زبان کا مسئلہ فوج میں بھی تھا اور سویلین میں بھی۔

سرکاری اور تعلیمی زبان پہلے ہی سے فارسی تھی اور انگریزوں نے بھی اسے ہی قائم رکھا تھا۔ جب معاملات آگے بڑھے' تو سب سے پہلے عدالت کا معاملہ درپیش ہوا۔ عدالت کی جو زبان تھی وہ نہ افسروں کی زبان تھی' نہ مدعی کی' اور نہ مدعاعلیہ کی۔ اظہارات' شہادات' وغیرہ سب دوسری زبانوں میں تھے۔ چنانچہ ان چیزوں کی بنا پر مقدمات کے فیصلے کرنے میں بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ چونکہ اظہار و شواہد وغیرہ سے افسروں کو کماحقہ' واقفیت نہیں ہوتی تھی' اس لیے فیصلے اکثر غلط اور بیجا ہوا کرتے تھے۔ یہ وہ دقتیں تھیں جن کی شدت کو قدم قدم پر محسوس کیا گیا' اور آخرکار وہ مجبور ہوئے کہ اردو زبان کو فروغ دیں' جو درحقیقت ملکی زبان تھی اور اسی زبان میں کارروائی کی جائے۔ دوسری طرف عہدیداروں کے لیے فارسی زبان کو ذریعہ قرار دیا اور انھوں نے اس مضمون کو لازمی طور پر اختیار کرنا شروع کیا۔

تعلیم کا مسئلہ

تیسری چیز تعلیم کا مسئلہ تھی اور تعلیم کے بارے میں آپ کو معلوم ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی پالیسی کیا تھی!

1815ء میں میکالے نے ہندوستان میں تعلیم کا خاکہ کھینچا اور ایک نئی تبدیلی رونما ہوئی۔ ایک گروہ کا خیال تھا کہ مشرقی علوم کو مشرقی زبان میں سیکھنا چاہیے اور دوسرے گروہ نے کہا کہ نہیں' انگریزی میں۔ میکالے نے دوسرے گروہ کا ساتھ دیا۔ اور اپنی وہ مشہور رپورٹ لکھی' جس میں اس نے لکھا کہ ہندوستان کو ایک نئی زبان سیکھنا چاہیے اور نئے علوم و فنون کو اس کے ذریعہ سیکھ کر ترقی کے راستہ میں بڑھنا چاہیے۔

لیکن یہاں میکالے سے ایک زبردست غلطی ہو گئی۔ ملکی زبانوں کو اس نے نہایت حقارت سے دیکھا اور انہیں کسی قابل نہیں سمجھا' جس کی وجہ سے بڑی خرابیاں پیدا ہو گئیں۔

مگر ملکی زبانوں کی طرف توجہ نہ دینے کے مسئلہ میں انہوں نے جو غفلت برتی' اس کے پیچھے ان کا "سیاسی پس پردہ" تھا جو دروازہ ان کے لئے کھل گیا تھا' وہ چاہتے تھے کہ کسی طرح اسے محفوظ کرلیا جائے۔ اس لیے کوشش کی کہ تعلیم کا ذریعہ وہ زبان ہو' جو ملک کی مادری' قومی' روایتی' معاشرتی اور تاریخی نہیں' بلکہ ایک سمندر پار کی زبان کو وسیلہ بنایا جائے۔ یہ فیصلہ قطعی مصنوعی تھا۔ کوئی قوم' کسی اجنبی زبان کو اپنی دماغی اور فکری زندگی کا ایک منٹ کے لیے بھی ذریعہ نہیں بنا سکتی۔ اگر وہ بنائے گی بھی' تو کوئی صحیح چیز وہ نہیں بنا سکتی' بلکہ اس کی ایک مسخ شدہ صورت البتہ پیدا ہو جائے گی۔ چنانچہ آپ دیکھ لیجئے کہ یہاں ایک سو تیس برس کی تعلیم کے بعد بھی وہ نتائج پیدا نہیں ہو سکتے' جو دوسرے ممالک میں بہت تھوڑے عرصے میں پیدا ہو گئے۔

مصر و شام کا حال یہ ہے کہ انہوں نے اگرچہ نئے علوم کے آگے سر جھکا دیا' لیکن یاد رہے کہ انہوں نے زبان کے مسئلے میں ہرگز غیر فطری اور غیر قدرتی ذریعہ اختیار نہیں کیا' بلکہ انہوں نے ان علوم کے حاصل کرنے میں وہی قدرتی یعنی مادری زبان کا سہارا لیا' چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہندوستان کے اعلیٰ ڈگری پائے ہوئے لوگوں کے مقابلے میں' واں کا ایک معمولی طالب علم جس کی تعلیم ہائی اسکول سے زیادہ نہیں ہے' زیادہ مفکر زیادہ زندگی کا مالک اور زیادہ قابل ہے۔ مصر میں اعلیٰ تعلیم کا کوئی انتظام نہیں' بس یہ سمجھ لیجئے کہ یہاں جو معیار ہائی اسکول کا ہے' وہی وہاں بھی ہے۔ لیکن فرق نتائج یہ ہے کہ تیس برس کے عرصے میں وہاں جو تغیر اور ترقی ہوئی' اس کا عشر عشیر بھی یہاں نہیں ہوسکا۔ تعلیم کے سلسلے میں ہندوستان میں تعلیم کو رائج ہوئے مصر سے سو برس زیادہ گزرے۔ لیکن حال یہ ہے کہ ایک مصری جس چیز کو خوش اسلوبی اور دماغی تازگی کے ساتھ پیش کر دے گا' آپ کے ملک میں کوئی بھی ویسا نہیں مل سکتا۔ اس کی وجہ بالکل صاف ہے۔ آپ کی آنکھوں پر جو عینک چڑھی ہوئی ہے' اگر اسے ہٹا دیا جائے' تو آپ کے چاروں طرف تاریکی ہی تاریکی ہوگی۔ اور بالکل اندھیرا ہو جائے گا۔ آپ کی آنکھوں پر پہلے ہی ایک مصنوعی عینک لگا دی گئی ہے۔ اور وہ قوت جو قومی زبان کے ذریعہ سے حاصل ہو سکتی تھی' وہ ایک اجنبی صدا سے مٹا دی

گئی ہے اور اب حالت یہ ہے کہ آپ کوئی چیز اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتے۔

اس لیے آپ جب کبھی چاہیں گے کہ خود اپنے میں آکر کچھ سوچیں اور بڑھیں' تو راستہ بند ہو جائے گا۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ آپ کی علمی زندگی ایک اجنبی زندگی ہے' جب تک انگریزی لباس میں ایک علم' ایک جذبہ' ایک خیال موجود ہے' کچھ نہیں ہو سکتا۔ یہ بہت بڑا نقص ہے اور جب تک یہ نقص دور نہ ہو' قومی دماغ پیدا نہیں ہو سکتا۔

بہرکیف وہ چیز غلط ثابت ہوئی اور انگریزوں نے ملکی زبان کی ترویج و اشاعت اور ترقی میں کوشش شروع کر دی۔

پنجاب یونیورسٹی میں جو بحث چھڑی تھی وہ دراصل علوم کی تحصیل کا مسئلہ تھا' نہ کہ ذریعہ تعلیم کا۔

اس لیے سوال یہ ہے کہ تعلیم سے زیادہ اپنی زبان میں حاصل کی جائے۔ جو چیز اس سلسلہ میں آتی ہے' اور جہاں تک قومی زبان کا تعلق ہے' ہم ان پچھلے اشارات کو سامنے رکھ کر اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ

ہندوستان مختلف ٹکڑوں میں بٹا ہوا ہے۔

ہر ٹکڑے کی ایک زبان ہے۔

ہر زبان کی قومی اور تاریخی و معاشرتی روایات ہیں۔

اگر کسی مصنوعی ذریعہ سے آپ وہ زبان ان سے چھین لیں' تو آپ اس میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ تیسری چیز یہ ہے کہ اگر یہ سوال اٹھایا جائے کہ گزشتہ ایک ہزار برس کے مختلف زمانوں میں جو مختلف زبانیں بنی ہیں' ان میں کوئی زبان ایسی ہے' جس سے تاریخی حیثیت سے ہم یہ معلوم کر سکیں کہ جغرافیائی حیثیت سے اس کا دائرہ محدود نہ ہو۔ ایسی کوئی زبان ہے یا نہیں؟ تو تاریخ کی روشنی میں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ سترہویں صدی کے اواخر میں ایک زبان ایسی تھی جس سے تمام ملک آشنا ہو گیا تھا' اور وہ یہی زبان تھی جسے آج ہم اردو کے نام سے تعبیر کرتے ہیں' اور تاریخ کے فیصلے کی روشنی میں ہم بغیر کسی جھجک کے یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ یہی اردو زبان تھی' جسے

انگریزوں نے بھی معلوم کیا کہ یہ تمام ملک میں پھیلی ہوئی ہے۔ نیز فوج میں بھی یہی بول چال ہے اور جس کے ذریعہ ہم دلوں پر قبضہ کرسکتے ہیں اور مطلب نکال سکتے ہیں وہ یہی اردو ہے۔ یہ زبان جو پیدا ہوئی اور پھیلی' یہ قومی زبان ہے۔ قومی زبان کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص دلی سے گجرات جاکر جو زبان بولتا تھا' اور مہاراشٹر کا باشندہ کرناٹک' مالابار میں جو زبان بولتا تھا' وہ یہی اردو تھی۔ اور یکساں طور پر بولی اور سمجھی جاتی تھی۔

جہاں تک نام کا تعلق ہے' اسے ابتدا میں ہندوی کہتے تھے' بعد میں ہندی اور اردو کا اطلاق بھی سترہویں صدی کے اواخر میں ہو جاتا ہے۔ جس کی ابتدا میر امن نے کی۔ اس زمانے میں ہندی اور اردو میں کوئی تفریق نہیں تھی' جو اس وقت اردو اور ہندی میں ہے۔ البتہ ریختہ اور اردو میں کافی فرق کیا جاتا تھا' یعنی فارسی آمیز علمی زبان کو ریختہ کہتے تھے اور عام بول چال' ٹھیٹ زبان کو ہندی سے تعبیر کرتے تھے۔

اب تیسرا دور آتا ہے اور یہ دور غدر کے بعد سے شروع ہوتا ہے۔ غدر کے بعد نئے سرے سے سرشتہ تعلیم بنانا پڑتا ہے اور یہی زمانہ ہے جب کہ رسم الخط کا سوال اٹھتا ہے۔

رسم الخط کا مسئلہ

سوال یہ اٹھایا گیا کہ رسم الخط کس قسم کا اختیار کیا جائے' دیوناگری یا فارسی۔ عام تعلیم کے لیے کونسا رسم الخط موزوں اور مناسب ہے۔ 1877ء میں بہار میں اور 1900ء میں یہی سوال یو' پی میں بھی اٹھا۔ اور یہ چیز میں آپ کے سامنے بھی لانا چاہتا ہوں۔ بہار میں جب یہ سوال اٹھا' تو اس کی نوعیت بدلی ہوئی تھی۔ اب یہ سوال فارسی اور دیوناگری رسم الخط کا تھا۔ ہندی سے مقصود اردو ہی تھی' مگر یہ پہلی بار تھا کہ ہندی کا اطلاق اس زبان پر کیا گیا جس کی شکل دیوناگری رسم الخط میں ہو' اور اردو وہ سمجھی گئی' جسے فارسی رسم الخط میں لکھا جاتا ہو۔

(افسوس کہ یہ خطبہ اتنا ہی دستیاب ہوا' اور نامکمل رہ گیا۔ مرتب)

انڈین نیشنل کانگریس

رام گڑھ ' مارچ 1940ء

دوستو! 1923ء میں آپ نے مجھے اس قومی مجلس کا صدر چنا تھا۔ اب سترہ برس کے بعد دوسری مرتبہ آپ نے یہ عزت مجھے بخشی ہے۔ قوموں کی جدوجہد کی تاریخ میں سترہ برس کی مدت' کوئی بڑی مدت نہیں ہے۔ لیکن دنیا نے اپنی تبدیلیوں کی چال اس قدر تیز کر دی ہے' کہ اب وقت کے پرانے اندازے کام نہیں دے سکتے۔ اس سترہ برس کے اندر ایک کے بعد ایک بہت سی منزلیں ہمارے سامنے آتی رہیں۔ ہمارا سفر دور کا تھا اور ضروری تھا کہ مختلف منزلوں سے گزرے۔ ہم ہر منزل میں ٹھہرے' مگر رکے کہیں نہیں۔ ہم نے ہر مقام کو دیکھا بھالا' مگر ہمارا دل اٹکا کہیں بھی نہیں۔ ہمیں طرح طرح کے اتار چڑھاؤ پیش آئے' مگر ہر حال میں ہماری نگاہ سامنے ہی کی طرف رہی۔ دنیا کو ہمارے ارادوں کے بارے میں شک رہے ہوں' مگر ہمیں اپنے فیصلوں کے بارے میں کبھی شک نہیں گزرا۔ ہمارا راستہ مشکلوں سے بھرا تھا۔ ہمارے سامنے قدم قدم پر طاقتور رکاوٹیں کھڑی تھیں۔ ہم جتنی تیزی سے چلنا چاہتے تھے' نہ چل سکے ہوں' لیکن ہم نے آگے بڑھنے میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔ اگر ہم 1923ء اور 1940ء کی درمیانی مسافت پر نظر ڈالیں' تو ہمیں اپنے پیچھے بہت دور ایک دھندلا سا نشان دکھائی دے گا۔ 1922ء میں ہم اپنی منزل مقصود کی طرف بڑھنا چاہتے تھے' مگر منزل ہم سے

اتنی دور تھی کہ اس کی راہ کا نشان بھی ہماری آنکھوں سے اوجھل تھا۔ لیکن آج نظر اٹھایئے' اور سامنے کی طرف دیکھئے' نہ صرف منزل کا نشان صاف دکھائی دے رہا ہے' بلکہ خود منزل بھی دور نہیں ہے۔ البتہ یہ ظاہر ہے کہ جوں جوں منزل نزدیک آتی جاتی ہے' ہماری جدوجہد کی آزمائشیں بھی بڑھتی جاتی ہیں۔ آج واقعات کی تیزرفتاری نے جہاں ہمیں پچھلے نشانوں سے دور اور آخری منزل سے نزدیک کر دیا ہے' وہیں طرح طرح کی نئی نئی الجھنیں اور مشکلیں بھی پیدا کر دی ہیں اور ایک بہت ہی نازک مرحلے سے ہمارا کارواں گزر رہا ہے۔ ایسے مرحلوں کی سب سے بڑی آزمائش ان کے متضاد امکانوں میں ہوتی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ ہمارا ایک صحیح قدم ہمیں منزل مقصود سے بالکل نزدیک کردے۔ اور بہت ممکن ہے کہ ایک غلط قدم طرح طرح کی نئی مشکلوں میں الجھا دے۔ ایک ایسے نازک وقت میں آپ نے مجھے صدر چن کر اپنے جس بھروسے کا اظہار کیا ہے' وہ یقیناً بڑے سے بڑا بھروسا ہے' جو ملک کی خدمت کی راہ میں آپ اپنے ایک ساتھی پر کرسکتے تھے۔ یہ بہت بڑی عزت ہے' اس لیے بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ میں اس عزت کے لیے شکرگزار ہوں اور ذمہ داری کے لیے آپ کی رفاقت کا سہارا چاہتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ جس گرمجوشی کے ساتھ آپ نے اس اعتماد کا اظہار کیا ہے۔ ویسی ہی گرمجوشی کے ساتھ آپ کی رفاقتیں بھی میرا ساتھ دیتی رہیں گی۔

وقت کا اصلی سوال

اب میں سمجھتا ہوں' مجھے بغیر کسی تمہید کے وقت کے اصلی سوال پر آجانا چاہیے۔ ہمارے لیے وقت کا سب سے پہلا اور سب سے اہم سوال یہ ہے کہ 3 ستمبر 1939ء کے اعلان جنگ کے بعد ہم نے جو قدم اٹھایا ہے' وہ کس طرف جارہا ہے؟ اور اس وقت ہم کہاں کھڑے ہیں؟

غالباً کانگرس کی تاریخ میں اس کے ذہنی نقشے کا یہ ایک نیا رنگ تھا' کہ 1936ء کے اجلاس لکھنؤ میں یورپ کی بین القومی (انٹرنیشنل) صورت حال پر ایک لمبی تجویز منظور

کرکے اس نے اپنے نقطہ خیال کا صاف صاف اعلان کردیا' اور اس کے بعد سے وہ کانگریس کے سالانہ اعلانوں کا ایک اہم اور ضروری حصہ بن گئی۔ یہ گویا اس بارے میں ہمارا ایک سوچا سمجھا ہوا فیصلہ تھا' جو ہم نے دنیا کے سامنے رکھ دیا۔

ان تجویزوں کے ذریعے ہم نے دنیا کے سامنے ایک ہی وقت میں دو باتوں کا اعلان کیا تھا:

سب سے پہلی بات' جسے میں نے ہندوستانی سیاست کے ایک نئے رنگ سے تعبیر کیا ہے' ہمارا یہ احساس ہے کہ ہم اپنی آج کل کی مجبوری کی حالت میں بھی دنیا کی سیاسی صورت حال سے الگ تھلگ نہیں رہ سکتے۔ یہ ضروری ہے کہ اپنے مستقبل کی راہ بناتے ہوئے' ہم صرف اپنے چاروں طرف ہی نہ دیکھیں' بلکہ اس سے باہر کی دنیا پر بھی برابر نظر رکھیں۔ زمانے کی بے شمار تبدیلیوں نے ملکوں اور قوموں کو اس طرح ایک دوسرے سے نزدیک کردیا ہے' اور فکر اور عمل کی لہریں ایک گوشے میں ابھر کر اس تیزی کے ساتھ دوسرے گوشوں پر اپنا اثر ڈالنا شروع کر دیتی ہیں کہ آج کل کی حالت میں ممکن نہیں' ہندوستان اپنے مسئلوں کو صرف اپنی چار دیواری کے اندر ہی بند رہ کر سوچ سکے۔ یہ ناگزیر ہے' کہ باہر کے حالات' ہمارے حالات پر فوری اثر ڈالیں۔ اور ناگزیر ہے کہ ہماری حالتوں اور فیصلوں سے دنیا کی حالتوں اور فیصلوں پر اثر پڑے۔ یہی احساس تھا' جس نے اس فیصلے کی شکل اختیار کی۔ ہم نے ان تجویزوں کے ذریعہ اعلان کیا کہ یورپ میں جمہوریت اور انفرادی اور قومی آزادی کے خلاف فاشزم اور نازی ازم کی جو ارتجاعی (reactionary) (ری ایکشنری) تحریکیں روزبروز طاقت پکڑتی جاتی ہیں' ہندوستان انہیں دنیا کی ترقی اور امن کے لیے ایک عالمگیر خطرہ تصور کرتا ہے۔ اور اس کا دل اور دماغ ان قوموں کے ساتھ ہے' جو جمہوریت اور آزادی کی حفاظت میں ان تحریکوں کا مقابلہ کررہی ہیں۔

لیکن جب فاشزم اور نازی ازم کے خطروں کے خلاف ہمارا دماغ جارہا تھا' تو ہمارے لیے ناممکن تھا کہ ہم اس پرانے خطرے کو بھلا دیتے۔ جو ان نئی قوتوں سے کہیں زیادہ قوموں کے امن اور آزادی کے لیے مہلک ثابت ہو چکا ہے اور جس نے

فی الحقیقت ان نئی ارتجاعی (reactionary) تحریکوں کی پیدائش کا سارا مواد بہم پہنچایا ہے۔ میرا اشارہ برطانیہ کی سامراجی قوت کی طرف ہے۔ اسے ہم ان نئی ارتجاعی (reactionary) قوتوں کی طرح دور سے نہیں دیکھ رہے' یہ خود ہمارے گھر پر قبضہ جمائے ہمارے سامنے کھڑی ہے۔ اس لیے ہم نے صاف صاف لفظوں میں یہ بات بھی کھول دی کہ اگر یورپ کی اس نئی کشمکش نے لڑائی کی شکل اختیار کر لی' تو ہندوستان جو اپنے آزاد ارادے اور آزاد پسند سے محروم کر دیا گیا ہے' اس میں کوئی حصہ نہیں لے گا۔ وہ صرف اسی حالت میں حصہ لے سکتا ہے' جب کہ اسے اپنی آزاد مرضی اور پسند سے فیصلہ کرنے کی حیثیت حاصل ہو۔ وہ نازی ازم اور فاشزم سے بیزار ہے۔ مگر اس سے بھی زیادہ برطانوی شہنشاہیت سے بیزار ہے۔ اگر ہندوستان اپنی آزادی کے قدرتی حق سے محروم رہتا ہے' تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ برطانوی شہنشاہیت اپنی تمام روایتی خصوصیتوں کے ساتھ زندہ موجود ہے اور ہندوستان کسی حال میں تیار نہیں کہ برطانوی شہنشاہی کی فتح مندیوں کے لیے مدد دے۔

یہ دوسری بات تھی جس کا یہ تجویزیں لگاتار اعلان کرتی رہیں۔

یہ تجویزیں کانگریس کے اجلاس لکھنؤ سے لے کر اگست 1939ء تک منظور ہوتی رہیں۔ اور "لڑائی کی تجویزوں" کے نام سے مشہور ہیں۔

کانگریس کے یہ تمام اعلان برٹش گورنمنٹ کے سامنے تھے کہ اچانک اگست 1939ء کے تیسرے ہفتے میں لڑائی کے بادل گرجنے لگے اور 3 ستمبر کو خود لڑائی بھی شروع ہو گئی۔

اب میں اس موقعہ پر ایک لمحہ کے لیے آپ کو آگے بڑھنے سے روکوں گا اور درخواست کروں گا کہ ذرا پیچھے مڑ کر دیکھیے' پچھلے اگست کو آپ نے کن حالات میں چھوڑا ہے؟ برطانوی حکومت نے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935ء ہندوستان کے سر جبراً" تھوپا اور حسب معمول دنیا کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ اس نے ہندوستان کو اس کے قومی حق کی ایک بہت بڑی قسط دے دی ہے۔ کانگریس کا فیصلہ اس بارے میں دنیا کو معلوم ہے۔

تاہم اس نے کچھ عرصے کے لیے دم لینے کا ارادہ کیا' اور اس پر آمادہ ہو گئی کہ ایک خاص شرط کے ساتھ وزارتوں کا قبول کرنا منظور کرلے۔ اب گیارہ صوبوں میں سے آٹھ صوبوں میں اس کی وزارتیں کامیابی کے ساتھ کام کر رہی تھیں اور یہ بات خود برطانوی حکومت کے حق میں تھی کہ اس حالت کو جس قدر زیادہ مدت تک قائم رکھا جا سکتا ہے' قائم رکھے۔ ساتھ ہی صورت حال کا ایک دوسرا پہلو بھی تھا۔ جہاں تک لڑائی کی ظاہری صورت کا تعلق ہے' ہندوستان صاف صاف لفظوں میں نازی جرمنی سے اپنی بیزاری کا اعلان کر چکا تھا۔ اس کی ہمدردیاں جمہوریت پسند کرنے والی قوموں کے ساتھ تھیں' اور صورت حال کا یہ پہلو بھی برطانوی حکومت کے حق میں تھا۔ ایسی حالت میں قدرتی طور پر یہ توقع کی جا سکتی تھی کہ اگر برطانوی حکومت کی پرانی سامراجی ذہنیت (mentality) میں کچھ بھی تبدیلی ہوئی ہے تو کم از کم ڈپلومیسی (diplomacy) ہی کی خاطر وہ اس کی ضرورت ضرور محسوس کرے گی کہ اس موقعہ پر اپنا پرانا ڈھنگ بدل دے اور ہندوستان کو ایسا محسوس کرنے کا موقع دے کہ اب وہ ایک بدلی ہوئی آب و ہوا میں سانس لے رہا ہے۔ لیکن ہم سب کو معلوم ہے کہ اس موقع پر برطانوی حکومت کا طرز عمل کیسا رہا' تبدیلی کی کوئی ذرا سی پرچھائیں بھی اس پر پڑتی ہوئی دکھائی نہیں دی۔ ٹھیک اسی طرح جیسا کہ اس کے سامراجی مزاج کا ڈیڑھ صدی سے خاصہ رہا ہے' اس نے اپنے طرز عمل کا فیصلہ کرلیا' اور بغیر اس کے کہ کسی شکل اور کسی درجے تک بھی ہندوستان کو اپنی رائے ظاہر کرنے کا موقع دیا گیا ہو' لڑائی میں اس کے شامل ہو جانے کا اعلان کر دیا گیا۔ اس بات تک کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی کہ ان نمائندہ اسمبلیوں ہی کو اپنی رائے ظاہر کرنے کا ایک موقعہ دے دیا جائے' جسے خود برطانوی حکومت نے اپنی سیاسی بخششوں کی نمائش کرتے ہوئے ہندوستان کے سر تھوپا ہے۔

تمام دنیا کی طرح ہمیں بھی معلوم ہے کہ اس موقعہ پر برٹش امپائر کے تمام ملکوں کو اپنے اپنے طرز عمل کے فیصلہ کا کس طرح موقعہ دیا گیا تھا۔ کینیڈا' آسٹریلیا' نیوزی لینڈ' جنوبی افریقہ' آئرلینڈ' سب نے لڑائی میں شریک ہونے کا فیصلہ اپنی اپنی قانون ساز مجلسوں میں بغیر کسی باہر کی مداخلت کے کیا۔ اتنا ہی نہیں' بلکہ آئرلینڈ نے شریک ہونے

کی جگہ غیر جانبدار رہنے کا فیصلہ کیا' اور اس کے اس فیصلہ پر برطانیہ کے کسی باشندے کو تعجب نہیں ہوا۔ مسٹر ڈی ویلرا نے برطانیہ کے ہمسایہ میں کھڑے ہو کر صاف صاف کہہ دیا تھا کہ جب تک آلسٹر (ulster) کا سوال قابل اطمینان طریقہ پر طے نہیں ہوتا' وہ برطانیہ کی مدد کرنے سے انکار کرتا ہے۔

لیکن برطانوی نوآبادیوں (Dominions) کے اس پورے مرقع میں ہندوستان کی جگہ کہاں دکھائی دے رہی ہے؟ جس ہندوستان کو آج یہ قیمتی خوش خبری سنائی جا رہی ہے کہ اسے برطانوی حکومت کے فیاض ہاتھوں سے جلد' مگر کسی نامعلوم زمانے میں برطانوی نوآبادیوں (Dominions) کا درجہ (status) ملنے والا ہے' اس کی ہستی کا کیونکر اعتراف کیا گیا؟ اس طرح' کہ اسے دنیا کی تاریخ کی شاید سب سے بڑی ہونے والی لڑائی میں اچانک دھکیل دیا گیا۔ بغیر اس کے کہ اسے معلوم بھی ہوا ہو کہ وہ لڑائی میں شریک ہو رہا ہے!

صرف یہی ایک واقعہ اس کے لیے کافی ہے کہ برطانوی حکومت کے موجودہ مزاج اور رخ کو ہم اس کے اصلی رنگ روپ میں دیکھ لیں' مگر نہیں' ہمیں جلدی نہیں کرنی چاہیے۔ ہمیں اور موقعے بھی پیش آنے والے ہیں۔ وہ وقت دور نہیں' جب ہم اسے اور زیادہ نزدیک سے' اور اور زیادہ بے پردہ دیکھنے لگیں گے!

1914ء کی لڑائی کی پہلی چنگاری بلقان کے ایک گوشہ میں سلگی تھی۔ اس لیے انگلستان اور فرانس نے چھوٹی قوموں کے حقوق کا نعرہ لگانا شروع کر دیا تھا۔ پھر یادش بخیر' پریذیڈنٹ ولسن کے چودہ نکتے دنیا کے سامنے آئے۔ اور ان کا جو کچھ حشر ہوا' دنیا کو معلوم ہے۔ اس مرتبہ صورت حال دوسری تھی۔ پچھلی لڑائی کے بعد انگلستان اور فرانس نے اپنی فتح مندی کے نشے میں مخمور ہو کر جو طرز عمل اختیار کیا تھا' اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ ایک نیا رد فعل (reaction) شروع ہو جائے۔ وہ شروع ہوا۔ اس نے اٹلی میں فاشزم اور جرمنی میں نازی ازم کا روپ اختیار کیا۔ اور وحشیانہ طاقت کی بنیادوں پر بے روک آمریت دنیا کے امن اور آزادی کو چیلنج دینے لگی۔ جب یہ صورت حال پیدا ہوئی' تو قدرتی طور پر دو نئی صفیں دنیا کے سامنے آکھڑی ہوئیں' ایک جمہوریت اور

آزادی کا ساتھ دینے والی' دوسری ارتجاعی (reactionary) قوتوں کو آگے بڑھانے والی۔ اور اس طرح لڑائی کا ایک نیا نقشہ بننا شروع ہوگیا۔ مسٹر چیمبرلین کی حکومت جس کے لیے فاشسٹ اٹلی اور نازی جرمنی سے کہیں زیادہ سوویت روس کی ہستی ناقابل برداشت تھی' اور جو اسے برطانی سامراج کے لیے ایک زندہ چیلنج سمجھتی تھی' تین برسوں تک اس منظر کا تماشا دیکھتی رہی۔ اتنا ہی نہیں' بلکہ اس نے اپنے طرزِ عمل سے کھلے طور پر فیسٹ اور نازی قوتوں کی جرائتیں ایک کے بعد ایک بڑھائیں۔ اب سینیا' اسپین' آسٹریا' چیکوسلاواکیا' اور البانیا کی ہستیاں ایک کے بعد ایک دنیا کے نقشے سے مٹتی گئیں۔ اور برطانوی حکومت نے' اپنی ڈگمگاتی ہوئی پالیسی سے' انھیں دفن کرنے میں برابر مدد دی۔ لیکن جب اس طرزِ عمل کا قدرتی نتیجہ اپنی انتہائی شکل میں ابھر آیا' اور نازی جرمنی کا قدم بے روک آگے بڑھنے لگا' تو برطانوی حکومت بالکل بے بس ہوگئی۔ اسے لڑائی کے میدان میں اترنا پڑا' کیونکہ اگر اب نہ اترتی' تو جرمنی کی طاقت برطانوی شہنشاہی کے لیے ناقابل برداشت ہو جاتی۔ اب چھوٹی قوموں کی آزادی کے پرانے نعرے کی جگہ جمہوریت' آزادی اور عالمگیر امن کے نئے نعروں نے لے لی اور تمام دنیا ان صداؤں سے گونجنے لگی۔ 3 ستمبر کا اعلان جنگ انگلستان اور فرانس نے ان ہی صداؤں کی گونج میں کیا۔ اور دنیا کی ان تمام بے چین روحوں نے جو یورپ کی نئی ارتجاعی (reactionary) قوتوں کی وحشیانہ زور آزمائیوں اور عالمگیر بدامنی کے عذاب سے حیران اور سراسیمہ ہو رہی تھیں' ان خوشنما صداؤں پر کان لگا دیئے!

کانگرس کا مطالبہ

1939ء کو لڑائی کا اعلان ہوا اور 7 ستمبر کو آل انڈیا کانگرس ورکنگ کمیٹی واردھا میں اکٹھی ہوئی' تاکہ صورت حال پر غور کرے۔ ورکنگ کمیٹی نے اس موقعہ پر کیا کیا؟ کانگرس کے وہ تمام اعلان اس کے سامنے تھے جو 1936ء سے لگاتار ہوتے رہے ہیں۔ اعلان جنگ کے بارے میں جو طرزِ عمل اختیار کیا گیا تھا' وہ بھی اس کی نگاہوں سے اوجھل نہیں تھا۔ یقیناً اسے ملامت نہیں کی جا سکتی تھی' اگر وہ کوئی ایسا فیصلہ کر دیتی' جو

اس صورت حال کا منطقی نتیجہ تھا' لیکن اس نے پوری احتیاط کے ساتھ اپنے دل و دماغ کی نگرانی کی۔ اس نے وقت کے ان تمام جذبوں سے جو تیز رفتاری کا تقاضا کر رہے تھے' اپنے کانوں کو بند کرلیا۔ اس نے معاملے کے تمام پہلوؤں پر پورے سکون کے ساتھ غور کرکے وہ قدم اٹھایا' جسے آج ہندوستان سر اٹھا کر دنیا سے کہہ سکتا ہے کہ اس صورت حال میں اس کے لیے وہی ایک ٹھیک قدم تھا۔ اس نے اپنے سارے فیصلے ملتوی کر دیے۔ اس نے برطانوی حکومت سے سوال کیا کہ وہ پہلے اپنا فیصلہ دنیا کے سامنے رکھ دے جس پر نہ صرف ہندوستان کا' بلکہ دنیا کے امن و انصاف کے سارے مقصدوں کا فیصلہ موقوف ہے۔ اگر اس لڑائی میں شریک ہونے کی ہندوستان کو دعوت دی گئی ہے' تو ہندوستان کو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ لڑائی کیوں لڑی جارہی ہے؟ اس کا مقصد کیا ہے؟ اگر انسانی ہلاکت کی اس سب سے بڑی المناکی (tragedy) کا بھی وہی نتیجہ نکلنے والا نہیں ہے' جو پچھلی لڑائی کا نکل چکا ہے اور یہ واقعی اس لیے لڑی جارہی ہے کہ آزادی' جمہوریت اور امن کے ایک نئے نظم (order) سے دنیا کو آشنا کیا جائے' تو پھر یقیناً ہندوستان کو اس مطالبے کا حق حاصل ہے کہ وہ معلوم کرے' خود اس کی قسمت پر ان مقصدوں کا کیا اثر پڑے گا؟

ورکنگ کمیٹی نے اپنے اس مطالبے کو ایک مفصل اعلان کی صورت میں مرتب کیا اور 14 ستمبر 1939ء کو یہ شائع ہوگیا۔ اگر میں امید کروں کہ یہ اعلان ہندوستان کی نئی سیاسی تاریخ میں اپنے لیے ایک مناسب جگہ کا مطالبہ کرے گا' تو مجھے یقین ہے' میں آنے والے مورخ سے کوئی بے جا توقع نہیں کررہا ہوں۔ یہ سچائی اور معقولیت (reson) کا ایک سادہ مگر ناقابل رد نوشتہ (document) ہے' جس کو صرف مسلح طاقت کا بے پروا گھمنڈ ہی رد کرسکتا ہے۔ اس کی آواز اگرچہ ہندوستان میں اٹھی' لیکن فی الحقیقت یہ صرف ہندوستان ہی کی آواز نہ تھی' یہ عالمگیر انسانیت کی زخمی امیدوں کی چیخ تھی۔ پچیس برس ہوئے کہ دنیا بربادی اور ہلاکت کے ایک سب سے بڑے عذاب میں' جسے تاریخ کی نگاہیں دیکھ سکی ہیں' مبتلا کی گئی اور صرف اس لیے مبتلا کی گئی' تاکہ اس کے بعد اس سے بھی زیادہ ایک سخت عذاب کی تیاریوں میں لگ جائے۔ کمزور

قوموں کی آزادی، امن کی ضمانت، خود اختیاری فیصلہ (self determination) ہتھیاروں کی حدبندی، بین القومی (international) پنچایت کا قیام، یہ اور اسی طرح کے سارے اونچے اور خوش نما مقصدوں کی صداؤں سے قوموں کے کانوں پر جادو کیا گیا۔ ان کے دلوں میں امیدیں سلگائی گئیں۔ مگر بالاخر کیا نتیجہ نکلا؟ ہر صدا فریب نکلی! ہر جلوہ خواب و خیال ثابت ہوا! آج پھر قوموں کے گلوں کو خون اور آگ کی ہولناکیوں میں دھکیلا جارہا ہے۔ کیا معقولیت (reson) اور حقیقت کی موجودگی سے ہمیں اس درجہ مایوس ہو جانا چاہیے کہ ہم موت اور بربادی کے سیلاب میں کودنے سے پہلے یہ بھی معلوم نہیں کرسکتے کہ یہ سب کچھ کیوں ہورہا ہے؟ اور خود ہماری قسمت پر اس کا کیا اثر پڑے گا؟

برطانوی حکومت کا جواب اور کانگرس کا پہلا قدم

کانگرس کے اس مطالبہ کے جواب میں برطانوی حکومت کی جانب سے بیانوں کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا، جو ہندوستان اور انگلستان میں ہوتے رہے۔ اس سلسلے کے لیے پہلی کڑی وایسرائے ہند کا وہ اعلان بہم پہنچاتا ہے جو 17 اکتوبر کو دہلی سے شائع ہوا۔ یہ اعلان جو شاید حکومت ہند کے سرکاری علم ادب (official literature) کے الجھے ہوئے انداز، اور تھکا دینے والی طوالت کا سب سے زیادہ مکمل نمونہ ہے، صفحوں کے صفحے پڑھ جانے کے بعد بھی، اس قدر بتانے پر بمشکل آمادہ ہوتا ہے کہ لڑائی کے مقصد کے لیے برطانوی وزیراعظم کی ایک تقریر پڑھنی چاہیے، جو صرف یورپ کے امن اور بین القومی (international) رشتوں کی درستگی کا ذکر کرتی ہے۔ "جمہوریت" اور "قوموں کی آزادی" کے لفظ اس میں نہیں ڈھونڈے جا سکتے۔ جہاں تک ہندوستان کے مسئلہ کا تعلق ہے، وہ ہمیں بتاتا ہے کہ برطانوی حکومت نے 1919ء کے قانون کی تمہید میں اپنی جس پالیسی کا اعلان کیا تھا اور جس کا نتیجہ 1935ء کے قانون کی شکل میں نکلا، آج بھی وہی پالیسی اس کے سامنے ہے۔ اس سے زیادہ اور اس سے بہتر وہ کچھ نہیں کہہ سکتی۔

17 اکتوبر 1939ء کو وائسرائے کا اعلان شائع ہوا' اور 22 اکتوبر کو ورکنگ کمیٹی اس پر غور کرنے کے لیے واردھا میں بیٹھی۔ وہ بغیر کسی بحث کے اس نتیجہ پر پہنچی کہ یہ جواب کسی طرح بھی اسے مطمئن نہیں کر سکتا' اور اب اسے اپنا وہ فیصلہ بلا تامل کر دینا چاہیے جو اس وقت تک اس نے ملتوی کر رکھا تھا۔ جو فیصلہ کمیٹی نے کیا' وہ اس کی تجویز کے لفظوں میں یہ ہے:

ان حالات میں کمیٹی کے لیے ممکن نہیں کہ وہ برطانوی حکومت کی سامراجی پالیسی کو منظور کر لے۔ کمیٹی کانگرس وزارتوں کو ہدایت کرتی ہے کہ جو راہ اب ہمارے سامنے کھل گئی ہے' اس کی طرف بڑھتے ہوئے بطور ایک ابتدائی قدم کے اپنے اپنے صوبوں کی حکومتوں سے مستعفی ہو جائیں۔"

چنانچہ آٹھوں صوبوں میں وزارتوں نے استعفا دے دیا۔

یہ تو اس سلسلہ کی ابتدا تھی۔ اب دیکھنا چاہیے کہ یہ سلسلہ زیادہ سے زیادہ کہاں تک پہنچا ہے؟ وائسرائے ہند کا ایک کمیون کے جو 5 فروری کو دہلی سے شائع ہوا اور جو اس گفتگو کا خلاصہ بیان کرتا ہے' جو مہاتما گاندھی سے ہوئی تھی اور پھر خود مہاتما گاندھی کا بیان جو انہوں نے 6 فروری کو شائع کیا' اس کی آخری کڑی سمجھی جاسکتی ہے۔ اس کا خلاصہ ہم سب کو معلوم ہے۔ برطانوی حکومت اس بات کی پوری خواہش رکھتی ہے کہ ہندوستان جلد سے جلد وقت میں جو صورت حال کے لحاظ سے ممکن ہو' برطانوی نوآبادیوں کا درجہ حاصل کر لے' اور درمیانی زمانے کی مدت جہاں تک ممکن ہو کم کی جائے۔ مگر وہ ہندوستان کا یہ حق ماننے کے لیے تیار نہیں کہ بغیر باہر کی مداخلت کے وہ اپنا دستور اساسی (کانسٹی ٹیوشن) خود اپنے چنے ہوئے نمائندوں کے ذریعہ بنا سکتا ہے' اور اپنی قسمت کا فیصلہ کر سکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں برطانوی حکومت ہندوستان کے لیے خوداختیاری فیصلے (self-determination) کا حق تسلیم نہیں کر سکتی۔

حقیقت کی ایک چھوت (touch) سے دکھلاوے کا سارا طلسم کس طرح نابود ہو گیا! پچھلے چار برسوں سے جمہوریت اور آزادی کی حفاظت کے نعروں سے دنیا گونج رہی

تھی۔ انگلستان اور فرانس کی حکومتوں کی زیادہ سے زیادہ ذمہ دار زبانیں اس بارے میں جو کچھ کہتی رہی ہیں' وہ ابھی اس قدر تازہ ہیں کہ یاد دلانے کی ضرورت نہیں۔ مگر جونہی ہندوستان نے یہ سوال اٹھایا' حقیقت کو بے پردہ ہو کر سامنے آجانا پڑا۔ اب ہمیں بتایا جاتا ہے کہ قوموں کی آزادی کی حفاظت بلاشبہ اس لڑائی کا مقصد ہے' مگر اس کا دائرہ یورپ کی جغرافیائی حدوں سے باہر نہیں جا سکتا۔ ایشیا اور افریقہ کے باشندوں کو یہ جرات نہیں کرنی چاہیے کہ امید کی نگاہ اٹھائیں۔ مسٹر چیمبرلین نے 24 فروری کو برمنگھم میں تقریر کرتے ہوئے یہ حقیقت اور زیادہ واضح کر دی ہے' اگرچہ ان کی تقریر سے پہلے بھی ہمیں اس بارے میں کوئی شبہ نہ تھا۔ انہوں نے ہمارے لیے برطانوی حکومت کے صاف طرز عمل کے ساتھ صاف قول بھی بہم پہنچا دیا۔ وہ لڑائی کے برطانوی مقاصد کا اعلان کرتے ہوئے دنیا کو یہ یقین دلاتے ہیں:

"ہماری لڑائی اس لیے ہے کہ ہم اس امر کی ضمانت حاصل کر لیں کہ یورپ کی چھوٹی قومیں آئندہ اپنی آزادی کو بے جا زیادتیوں کی دھمکیوں سے بالکل محفوظ پائیں گی۔"

برطانوی حکومت کا یہ جواب اس موقع پر اگرچہ برطانی زبان سے نکلا ہے' مگر فی الحقیقت وہ اپنی قسم میں خالص برطانی نہیں ہے' بلکہ ٹھیک ٹھیک براعظم یورپ کی اس عام ذہنیت کی ترجمانی کر رہا ہے' جو تقریباً دو صدیوں سے دنیا کے سامنے رہی ہے۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی میں انسان کے انفرادی اور جماعتی آزادی کے جس قدر اصول قبول کیے گئے' ان کے مطالبے کا حق صرف یورپی قوموں ہی کے لیے خاص سمجھا گیا' اور یورپ کی قوموں میں بھی مسیحی یورپ کے تنگ دائرے سے کبھی باہر نہ جا سکا۔ آج بیسویں صدی کے درمیانی حد میں دنیا اس قدر بدل چکی ہے' کہ پچھلی صدی کے فکر اور عمل کے نقشے تاریخ کی پرانی کہانیوں کی طرح سامنے آتے ہیں' اور ہمیں ان نشانوں کی طرح دکھائی دیتے ہیں' جنہیں ہم بہت دور پیچھے چھوڑ آئے' لیکن ہمیں تسلیم کرنا چاہیے کہ کم از کم ایک نشان اب بھی ہمارے پیچھے نہیں ہے' وہ ہمارے ساتھ ساتھ آرہا ہے۔ وہ انسانی حقوق کے لیے یورپ کا امتیازی نشان ہے۔

ٹھیک ٹھیک معاملہ کا ایسا ہی نقشہ ہندوستان کے سیاسی اور قومی حق کے سوال نے بھی ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے۔ ہم نے جب اعلان جنگ کے بعد یہ سوال اٹھایا کہ لڑائی کا مقصد کیا ہے' اور ہندوستان کی قسمت پر اس کا کیا اثر پڑنے والا ہے؟ تو ہم اس بات سے بے خبر نہ تھے کہ برطانوی حکومت کی پالیسی 1917ء اور 1919ء میں کیا رہ چکی ہے۔ ہم معلوم کرنا چاہتے تھے کہ 1939ء کی اس دنیا میں جو دنوں کے اندر صدیوں کی چال سے بدلتی اور پلٹتی ہوئی دوڑ رہی ہے' ہندوستان کو برطانوی حکومت کس جگہ سے دیکھنا چاہتی ہے! اس کی جگہ اب بھی بدلی ہے یا نہیں؟ ہمیں صاف جواب مل گیا کہ نہیں بدلی۔ وہ اب بھی سامراجی مزاج میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کر سکی ہے۔ ہمیں یقین دلایا جاتا ہے کہ برطانوی حکومت بہت زیادہ اس کی خواہش مند ہے کہ ہندوستان جہاں تک جلد ممکن ہو' نوآبادیات (dominion status) کا درجہ حاصل کر لے۔ ہمیں معلوم تھا کہ برطانوی حکومت نے اپنی یہ خواہش ظاہر کی ہے۔ اب ہمیں یہ بات بھی معلوم ہو گئی کہ وہ اس کی بہت زیادہ خواہش مند ہے۔ مگر سوال برطانوی حکومت کی خواہش اور اس کی خواہش کے مختلف درجوں کا نہیں ہے۔ صاف اور سادہ سوال ہندوستان کے حق کا ہے۔ ہندوستان کو یہ حق حاصل ہے یا نہیں کہ وہ اپنی قسمت کا خود فیصلہ کرے؟ اسی سوال کے جواب پر وقت کے سارے سوالوں کا جواب موقوف ہے۔ ہندوستان کے لیے یہ سوال بنیاد کی اصلی اینٹ ہے۔ وہ اسے نہیں ہلنے دے گا اگر یہ ہل جائے' تو اس کی قومی ہستی کی ساری عمارت ہل جائے گی۔

جہاں تک لڑائی کے سوال کا تعلق ہے' ہمارے لیے صورت حال بالکل واضح ہو گئی۔ ہم برطانوی سامراج کا چہرہ اس لڑائی کے اندر بھی اسی طرح صاف صاف دیکھ رہے ہیں جس طرح ہم نے پچھلی لڑائی میں دیکھا تھا۔ ہم تیار نہیں کہ اس چہرے کی فتح مندیوں کے لیے لڑائی میں حصہ لیں۔ ہمارا مقصد بالکل صاف ہے۔ ہم اپنی محکومیت کی عمر بڑھانے کے لیے برطانوی سامراج کو زیادہ طاقتور اور زیادہ فتح مند نہیں دیکھنا چاہیے۔ ہم ایسا کرنے سے صاف صاف انکار کرتے ہیں۔ ہماری راہ یقیناً بالکل اس کے مقابل سمت جا رہی ہے۔

ہم آج کہاں کھڑے ہیں؟

اب ہم اس جگہ پر واپس آجائیں' جہاں سے ہم چلے تھے۔ ہم نے اس سوال پر غور کرنا چاہا تھا کہ 3 ستمبر کے اعلان جنگ کے بعد جو قدم ہم اٹھا چکے ہیں' اس کا رخ کس طرف ہے؟ اور ہم آج کہاں کھڑے ہیں؟ میں یقین کرتا ہوں کہ ان دونوں سوالوں کا جواب اس وقت ہم میں سے ہر شخص کے دل میں اس طرح صاف صاف ابھر آیا ہوگا کہ اب اسے صرف زبانوں تک پہنچنا ہی باقی رہ گیا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ آپ کے لب ہلیں' میں آپ کے لبوں کو ہلتا ہوا دیکھ رہا ہوں۔ ہم نے عارضی تعاون (cooperation) کا جو قدم 1931ء میں اٹھایا تھا' ہم نے اعلان جنگ کے بعد واپس لے لیا۔ اس لیے قدرتی طور پر ہمارا رخ ترک تعاون (Non cooperation) کی طرف تھا۔ ہم آج اس جگہ کھڑے ہیں' جہاں ہمیں فیصلہ کرنا ہے کہ اس رخ کی طرف آگے بڑھیں' یا پیچھے ہٹیں؟ جب قدم اٹھا دیا جائے' تو وہ رک نہیں سکتا۔ اگر رکے گا تو پیچھے ہٹے گا۔ ہم پیچھے ہٹنے سے انکار کرتے ہیں۔ ہم صرف یہی کر سکتے ہیں کہ آگے بڑھیں۔ مجھے یقین ہے کہ میں آپ سب کے دلوں کی آواز اپنی آواز کے ساتھ ملا رہا ہوں' جب میں یہ اعلان کرتا ہوں کہ ہم آگے بڑھیں گے!

باہمی مفاہمت

اس سلسلے میں قدرتی طور پر ایک سوال سامنے آجاتا ہے۔ تاریخ کا فیصلہ ہے کہ قوموں کی کشاکش میں ایک طاقت جبھی اپنا قبضہ چھوڑ سکتی ہے جبکہ دوسری طاقت اسے ایسا کرنے پر مجبور کر دے۔ معقولیت اور اخلاق کے اعلیٰ اصول افراد کا طرز عمل بدلتے رہے ہیں' مگر غلبہ جمائی ہوئی قوموں کی خود غرضیوں پر کبھی اثر نہیں ڈال سکے۔ آج بھی ہم عین بیسویں صدی کے درمیانی عہد میں دیکھ رہے ہیں کہ یورپ کی نئی ارتجاعی (reactionary) قوموں نے کس طرح انسان کے انفرادی اور قومی حقوق کے تمام عقیدے تہہ و بالا کر دیے' اور انصاف اور معقولیت (reason) کی جگہ صرف وحشیانہ طاقت کی دلیل فیصلوں کے لیے اکیلی دلیل رہ گئی' لیکن ساتھ ہی جہاں دنیا تصویر کا یہ

مایوس رخ ابھار رہی ہے' وہیں امید کا ایک دوسرا رخ بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ بلا امتیاز دنیا کے بے شمار انسانوں کی ایک نئی عالمگیر بیداری بھی ہے۔ جو نہایت تیزی کے ساتھ ہر طرف ابھر رہی ہے۔ یہ دنیا کے پرانے نظم (order) کی نامرادیوں سے تھک گئی ہے اور معقولیت' انصاف اور امن کے ایک نئے نظم کے لیے بے قرار ہے۔ دنیا کی یہ نئی بیداری جس نے پچھلی لڑائی کے بعد سے انسانی روحوں کی گہرائیوں میں کروٹ بدلنا شروع کر دیا تھا' اب روز بروز دماغوں اور زبانوں کی سطح پر ابھر رہی ہے اور اس طرح ابھر رہی ہے کہ شاید تاریخ میں کبھی نہیں ابھری۔ ایسی حالت میں کیا یہ بات وقت کے امکانوں کے دائرے سے باہر تھی کہ تاریخ میں اس کے پرانے فیصلوں کے خلاف ایک نئے فیصلے کا اضافہ ہوتا؟ کیا ممکن نہیں کہ دنیا کی دو بڑی قومیں جنہیں حالات کی رفتار نے حکومت اور محکومیت کے رشتے سے جمع کر دیا تھا' آیندہ کے لیے معقولیت' انصاف اور امن کے رشتوں سے اپنا نیا تعلق جوڑنے کے لیے تیار ہو جائیں؟ عالمگیر جنگ کی مایوسیاں کس طرح امیدوں کی ایک نئی زندگی میں بدل جاتیں' معقولیت اور انصاف کے دور کی ایک نئی صبح کس طرح دنیا کو ایک نئے سورج کا پیام دینے لگتیں۔ انسانیت کی کیسی بے مثال اور عالمگیر فتح مندی ہوتی' اگر آج برطانوی قوم سر اٹھا کر دنیا سے کہہ سکتی کہ اس نے تاریخ میں ایک نئی مثال بڑھانے کا کام انجام دیا ہے!

یقیناً یہ ناممکن نہیں ہے' مگر دنیا کی تمام دشواریوں سے کہیں دشوار ہے!

وقت کی ساری پھیلی ہوئی اندھیاریوں میں انسانی فطرت کا یہی ایک روشن پہلو ہے' جو مہاتما گاندھی کی عظیم روح کو کبھی تھکنے نہیں دیتا۔ وہ باہمی مفاہمت کے دروازے میں جو ان پر کھولا جاتا ہے' بغیر اس کے کہ اپنی جگہ کو ذرا بھی کمزور محسوس کریں' بلا تامل قدم رکھنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔

برطانوی کابینہ (Cabinet) کے متعدد ممبروں نے لڑائی کے بعد دنیا کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی ہے کہ برطانوی سامراج کا پچھلا دور اب ختم ہو چکا' اور آج برطانوی قوم صرف امن اور انصاف کے مقصدوں کو اپنے سامنے رکھتی ہے۔ ہندوستان

سے بڑھ کر اور کونسا ملک ہو سکتا ہے' جو آج کسی ایسے اعلان کا استقبال کرتا' لیکن واقعہ یہ ہے کہ باوجود ان اعلانوں کے' برطانوی سامراج آج بھی اسی طرح امن اور انصاف کی راہ روکے کھڑا ہے' جس طرح لڑائی سے پہلے تھا۔ ہندوستان کا مطالبہ اس طرح کے تمام دعوؤں کے لیے ایک حقیقی کسوٹی تھی۔ دعوے کسوٹی پر کسے گئے' اور اپنی سچائی کا ہمیں یقین نہ دلا سکے!

ہندوستان کا سیاسی مستقبل اور اقلیتیں

جہاں تک وقت کے اصلی سوال کا تعلق ہے' معاملہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے' جو میں نے اختصار کے ساتھ آپ کے سامنے رکھ دیا۔ گزشتہ ستمبر میں جب اعلان جنگ کے بعد کانگرس نے اپنا مطالبہ ترتیب دیا' تو اس وقت ہم میں سے کسی شخص کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں گزری تھی کہ اس صاف اور سادہ مطالبہ میں جو ہندوستان کے نام پر کیا گیا ہے' اور جس سے ملک کے کسی فرقہ اور کسی گروہ کو بھی اختلاف نہیں ہو سکتا' فرقہ وارانہ مسئلہ کا سوال اٹھایا جا سکے گا' بلاشبہ ملک میں ایسی جماعتیں موجود ہیں' جو سیاسی جدوجہد کے میدان میں وہاں تک نہیں جا سکتیں' جہاں تک کانگریس کے قدم پہنچ گئے ہیں' اور براہ راست اقدام عمل (ڈائرکٹ ایکشن) کے طریقہ سے جو سیاسی ہندوستان کی اکثریت نے اختیار کرلیا ہے' متفق نہیں ہیں۔ لیکن جہاں تک ملک کی آزادی اور اس کے قدرتی حق کے اعتراف کا تعلق ہے' ہندوستان کی ذہنی بیداری اب ان ابتدائی منزلوں سے بہت دور نکل چکی کہ ملک کا کوئی گروہ بھی اس مقصد سے اختلاف کرنے کی جرات کر سکے۔ وہ جماعتیں بھی جو اپنے طبقہ (کلاس) کے خاص مفاد کے تحفظ کے لیے مجبور ہیں کہ موجودہ سیاسی صورت حال کی تبدیلی کی خواہش مند نہ ہوں' وقت کی عام آب و ہوا کے تقاضہ سے بے بس ہو رہی ہیں اور انہیں بھی ہندوستان کی سیاسی منزل مقصود کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ تاہم جہاں وقت کے آزمائشی سوال نے صورت حال کے دوسرے گوشوں پر سے پردے اٹھا دیے' وہیں اس گوشے کو بھی بے نقاب کر دیا۔ ہندوستان اور انگلینڈ' دونوں جگہ یکے بعد دیگرے اس طرح کی

کوششیں کی گئیں کہ وقت کے سیاسی سوال کو فرقہ وارانہ مسئلہ کے ساتھ غلط ملط کرکے سوال کی اصلی حیثیت مشتبہ کردی جائے۔ بار بار دنیا کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی گئی کہ ہندوستان کے سیاسی مسئلہ کے حل کی راہ میں اقلیتوں کا مسئلہ حارج ہو رہا ہے۔

اگر پچھلے ڈیڑھ سو برس کے اندر ہندوستان میں برطانوی شہنشاہی کا یہ طرزِ عمل رہ چکا ہو کہ ملک کے باشندوں کے اندرونی اختلافات کو ابھار کر نئی نئی صفوں میں تقسیم کیا جائے' اور پھر ان صفوں کو اپنی حکومت کے استحکام کے لیے کام میں لائے' تو یہ ہندوستان کی سیاسی محکومیت کا ایک قدرتی نتیجہ تھا' اور ہمارے لیے اب بے سود ہے کہ اس کی شکایت سے اُپنے جذبات میں کڑواہٹ پیدا کریں۔ ایک اجنبی حکومت یقیناً اس ملک کے اندرونی اتحاد کی خواہش مند نہیں ہوسکتی جس کی اندرونی پھوٹ ہی اس کی موجودگی کے لئے سب سے بڑی ضمانت ہے۔ لیکن ایک ایسے زمانہ میں جبکہ دنیا کو یہ باور کرانے کی کوششیں کی جارہی ہیں کہ برطانوی شہنشاہیت کی ہندوستانی تاریخ کا پچھلا دور ختم ہو چکا۔ یقیناً یہ کوئی بڑی توقع نہ تھی اگر ہم برطانوی مدبروں سے امید رکھتے تھے کہ کم از کم اس گوشے میں وہ اپنے طرزِ عمل کو پچھلے عہد کی دماغی وراثت سے بچانے کی کوشش کریں گے' لیکن پچھلے پانچ مہینوں کے اندر واقعات کی جو رفتار رہ چکی ہے' اس نے ثابت کردیا کہ ابھی ایسی امیدوں کے رکھنے کا وقت نہیں آیا' اور جس دور کی نسبت دنیا کو یقین دلایا جارہا ہے کہ ختم ہوگیا' اسے ابھی ختم ہونا باقی ہے۔

بہرحال اسباب خواہ کچھ ہی رہے ہوں لیکن ہم تسلیم کرتے ہیں کہ دنیا کے تمام ملکوں کی طرح ہندوستان بھی اپنے اندرونی مسائل رکھتا ہے' اور ان مسئلوں میں ایک اہم مسئلہ فرقہ وارانہ مسئلہ کا ہے۔ ہم برطانوی حکومت سے یہ توقع نہیں رکھتے' اور ہمیں رکھنی بھی نہیں چاہیے کہ وہ اس مسئلہ کی موجودگی کا اعتراف نہیں کرے گی۔ یہ مسئلہ موجود ہے اور اگر ہم آگے بڑھنا چاہتے ہیں' تو ہمارا فرض ہے کہ اس کی موجودگی مان کر قدم اٹھائیں۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ہر قدم جو اس کی موجودگی سے بے پروا رہ کر اٹھے گا' یقیناً ایک غلط قدم ہوگا' لیکن فرقہ وارانہ مسئلہ کی موجودگی کے اعتراف کے

معنی صرف یہی ہونے چاہئیں کہ اس کی موجودگی کا اعتراف کیا جائے۔ یہ معنی نہیں ہونے چاہئیں کہ اسے ہندوستان کے قومی حق کے خلاف بطور ایک آلہ کے استعمال کیا جائے۔ برطانوی شہنشاہی ہمیشہ اس مسئلہ کو اسی غرض سے کام میں لاتی رہی۔ اگر اب وہ اپنی ہندوستانی تاریخ کا پچھلا دور ختم کرنے پر مائل ہے' تو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ سب سے پہلا گوشہ جس میں ہم قدرتی طور پر اس تبدیلی کی جھلک دیکھنی چاہیں گے' وہ یہی گوشہ ہے۔

کانگرس نے فرقہ وارانہ مسئلہ کے بارے میں اپنے لیے جو جگہ بنائی ہے' وہ کیا ہے؟ کانگرس کا اول دن سے دعویٰ رہا ہے کہ وہ ہندوستان کو بہ حیثیت مجموعی اپنے سامنے رکھتی ہے اور جو قدم بھی اٹھانا چاہتی ہے' ہندوستانی قوم کے لیے اٹھانا چاہتی ہے۔ ہمیں تسلیم کرنا چاہیے کہ کانگرس نے یہ دعویٰ کرکے دنیا کو اس بات کا حق دے دیا ہے کہ وہ جس قدر بے رحم نکتہ چینی کے ساتھ چاہے' اس کے طرزِ عمل کا جائزہ لے' اور کانگرس کا فرض ہے کہ اس جائزہ میں اپنے کو کامیاب ثابت کرے۔ میں چاہتا ہوں کہ معاملہ کا یہ پہلو سامنے رکھ کر ہم آج کانگرس کے طرزِ عمل پر نئے سرے سے ایک نگاہ ڈال لیں۔

جیسا کہ میں نے ابھی آپ سے کہا ہے' اس بارے میں قدرتی طور پر تین باتیں ہی سامنے آسکتی ہیں' فرقہ وارانہ مسئلہ کی موجودگی' اس کی اہمیت اور اس کے فیصلے کا طریقہ۔

کانگرس کی پوری تاریخ اس کی گواہی دیتی ہے کہ اس نے اس مسئلہ کی موجودگی کا ہمیشہ اعتراف کیا۔ اس نے اس کی اہمیت کو گھٹانے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ اس نے اس کے فیصلہ کے لئے وہی طریقہ تسلیم کیا' جس سے زیادہ قابلِ اطمینان طریقہ اس بارے میں کوئی نہیں بتلایا جا سکتا' اور اگر بتلایا جا سکتا ہے' تو اس کی طلب میں اس کے دونوں ہاتھ ہمیشہ بڑھے رہے اور آج بھی بڑھے ہوئے ہیں!

اس کی اہمیت کا اعتراف اس سے زیادہ ہمارے تخیل پر کیا اثر ڈال سکتا ہے کہ اسے ہندوستان کے قومی مقصد کی کامیابی کے لیے سب سے پہلی شرط یقین کریں؟ میں

اس واقعہ کو بطور ایک ناقابل انکار حقیقت کے پیش کروں گا کہ کانگرس کا ہمیشہ ایسا ہی یقین رہا۔

کانگرس نے ہمیشہ اس بارے میں دو بنیادی اصول اپنے سامنے رکھے اور جب کبھی کوئی قدم اٹھایا تو ان دونوں اصولوں کو صاف صاف اور قطعی شکل میں مان کر اٹھایا:

1- ہندوستان کا جو دستور اساسی (کانسٹی ٹیوشن) بھی آیندہ بنایا جائے' اس میں اقلیتوں کے حقوق اور مفاد کی پوری ضمانت ہونی چاہیے۔

2- اقلیتوں کے حقوق اور مفاد کے لیے کن کن تحفظات (سیف گارڈز) کی ضرورت ہے؟ اس کے لیے جج خود اقلیتیں ہیں' نہ کہ اکثریتیں۔ اس لیے تحفظات کا فیصلہ ان کی رضامندی سے ہونا چاہیے' نہ کہ کثرت رائے سے۔

اقلیتوں کا مسئلہ صرف ہندوستان ہی کے حصے میں نہیں آیا ہے۔ دنیا کے دوسرے حصوں میں بھی رہ چکا ہے۔ میں آج اس جگہ سے دنیا کو مخاطب کرنے کی جرات کرتا ہوں۔ میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ کیا اس سے بھی زیادہ کوئی صاف اور بے لاگ طرزعمل اس بارے میں اختیار کیا جا سکتا ہے؟ اگر کیا جا سکتا ہے تو وہ کیا ہے؟ کیا اس طرزعمل میں کوئی بھی ایسی خامی رہ گئی ہے' جس کی بنا پر کانگرس کو اس کا فرض یاد دلانے کی ضرورت ہو؟ کانگرس اپنے اداء فرض کی خامیوں پر غور کرنے کے لیے ہمیشہ تیار رہی ہے اور آج بھی تیار ہے۔

میں انیس برس سے کانگرس میں ہوں۔ اس تمام عرصے میں کانگرس کا کوئی اہم فیصلہ ایسا نہیں ہوا' جس کے ترتیب دینے میں مجھے شریک رہنے کی عزت حاصل نہ رہی ہو۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ اس انیس برس میں ایک دن بھی ایسا کانگرس کے دماغ پر نہیں گزرا' جب اس نے اس مسئلہ کا فیصلہ اس کے سوا کسی طریقہ سے بھی کرنے کا خیال کیا ہو۔ یہ صرف اس کا اعلان ہی نہ تھا' اس کا مضبوط اور طے کیا ہوا طرزعمل تھا۔ پچھلے پندرہ برسوں کے اندر بار بار اس طرزعمل کے لیے سخت سے سخت آزمائشیں پیدا ہوئیں' مگر یہ چٹان اپنی جگہ سے کبھی نہ ہل سکی۔

آج بھی اس نے دستور ساز مجلس (کانسٹی ٹوانٹ اسمبلی) کے سلسلے میں اس مسئلہ

کا جس طرح اعتراف کیا ہے' وہ اس کے لیے کافی ہے کہ ان دونوں اصولوں کو ان کی زیادہ سے زیادہ صاف شکل میں دیکھ لیا جائے۔ تسلیم شدہ اقلیتوں کو یہ حق حاصل ہے کہ اگر وہ چاہیں تو خالص اپنے ووٹوں سے اپنے نمائندوں کو چن کر بھیجیں۔ ان کے نمائندوں کے کاندھوں پر اپنے فرقہ کی رایوں کے سوا اور کسی کی رائے کا بوجھ نہ ہوگا۔ جہاں تک اقلیتوں کے حقوق اور مفاد کے مسائل کا تعلق ہے' فیصلہ کا ذریعہ مجلس (اسمبلی) کی کثریت رائے نہیں ہوگی' خود اقلیتوں کی رضامندی ہوگی۔ اگر کسی مسئلہ میں اتفاق نہ ہوسکے' تو کسی غیرجانبدار پنچایت کے ذریعہ فیصلہ کرایا جا سکتا ہے' جسے اقلیتوں نے بھی تسلیم کرلیا ہو۔ آخری تجویز محض ایک احتیاطی پیش بندی ہے' ورنہ اس کا بہت کم امکان ہے کہ اس طرح کی صورتیں پیش آئیں گی۔ اگر اس تجویز کی جگہ کوئی دوسری قابل عمل تجویز ہوسکتی ہے' تو اسے اختیار کیا جا سکتا ہے۔

اگر کانگرس نے اپنے طرزعمل کے لیے یہ اصول سامنے رکھ لیے ہیں' اور پوری کوشش کرچکی ہے' اور کررہی ہے کہ ان پر قائم رہے' تو پھر ان کے بعد اور کونسی بات رہ گئی ہے' جو برطانوی مدبروں کو اس پر مجبور کرتی ہے کہ اقلیتوں کے حقوق کا مسئلہ ہمیں بار بار یاد دلائیں؟ اور دنیا کو اس غلط فہمی میں مبتلا کریں کہ ہندوستان کے مسئلہ کی راہ میں اقلیتوں کا مسئلہ راستہ روکے کھڑا ہے؟ اگر فی الحقیقت اسی مسئلہ کی وجہ سے رکاوٹ پیش آرہی ہے' تو کیوں برطانوی حکومت ہندوستان کی سیاسی قسمت کا صاف صاف اعلان کرکے ہمیں اس کا موقع نہیں دے دیتی کہ ہم سب مل کر بیٹھیں اور باہمی رضامندی سے اس مسئلہ کا ہمیشہ کے لیے تصفیہ کرلیں؟ ہم میں تفرقے پیدا کیے گئے اور ہمیں الزام دیا جاتا ہے کہ ہم میں تفرقے ہیں۔ ہمیں تفرقوں کے مٹانے کا موقع نہیں دیا جاتا۔ اور ہم سے کہا جاتا ہے کہ ہمیں تفرقے مٹانے چاہئیں۔ یہ صورت حال ہے جو ہمارے چاروں طرف پیدا کردی گئی ہے۔ یہ بندھن ہیں جو ہمیں ہر طرف سے جکڑے ہوئے ہیں۔ تاہم اس حالت کی کوئی مجبوری بھی ہمیں اس سے باز نہیں رکھ سکتی کہ سعی اور ہمت کا قدم آگے بڑھائیں' کیونکہ ہماری راہ تمام تر دشواریوں کی راہ ہے اور ہمیں ہر دشواری پر غالب آنا ہے۔

ہندوستان کے مسلمان اور ہندوستان کا مستقبل

یہ ہندوستان کی اقلیتوں کا مسئلہ تھا۔ لیکن کیا ہندوستان میں مسلمانوں کی حیثیت ایک ایسی اقلیت کی ہے' جو اپنے مستقبل کو شک اور خوف کی نظر سے دیکھ سکتی ہے اور وہ تمام اندیشے اپنے سامنے لا سکتی ہے' جو قدرتی طور پر ایک اقلیت کے دماغ کو مضطرب کر دیتے ہیں؟

مجھے نہیں معلوم' آپ لوگوں میں کتنے آدمی ایسے ہیں' جن کی نظر سے میری وہ تحریریں گزر چکی ہیں جو آج سے اٹھائیس برس پہلے میں الہلال کے صفحوں پر لکھتا رہا ہوں۔ اگر چند اشخاص بھی ایسے موجود ہیں' تو میں ان سے درخواست کروں گا کہ وہ اپنا حافظہ تازہ کرلیں۔ میں نے اس زمانے میں بھی اپنے اس عقیدے کا اظہار کیا تھا اور اسی طرح آج بھی کرنا چاہتا ہوں کہ ہندوستان کے سیاسی مسائل میں کوئی بات بھی اس درجہ غلط نہیں سمجھی گئی ہے' جس درجہ یہ بات کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی حیثیت ایک سیاسی اقلیت کی حیثیت ہے اور اس لیے انہیں ایک جمہوری ہندوستان میں اپنے حقوق و مفاد کی طرف سے اندیشہ ناک رہنا چاہیے۔ اس ایک بنیادی غلطی نے بے شمار غلط فہمیوں کی پیدائش کا دروازہ کھول دیا۔ غلط بنیادوں پر غلط دیواریں چنی جانے لگیں۔ اس نے ایک طرف تو خود مسلمانوں پر ان کی حقیقی حیثیت مشتبہ کردی۔ دوسری طرف دنیا کو ایک ایسی غلط فہمی میں مبتلا کر دیا' جس کے بعد وہ ہندوستان کو اس کی صحیح صورت حال میں نہیں دیکھ سکتی۔

اگر وقت ہوتا تو میں آپ کو تفصیل کے ساتھ بتلاتا کہ معاملہ کی یہ غلط اور بناوٹی شکل گزشتہ ساٹھ برس کے اندر کیونکر ڈھالی گئی اور کن ہاتھوں سے ڈھلی؟ دراصل یہ بھی اسی پھوٹ کی پیداوار ہے' جس کا نقشہ انڈین نیشنل کانگرس کی تحریک کے شروع ہونے کے بعد ہندوستان کے سرکاری دماغوں میں بننا شروع ہوگیا تھا اور جس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو اس نئی سیاسی بیداری کے خلاف استعمال کرنے کے لیے تیار کیا جائے۔ اس نقشہ میں دو باتیں خاص طور سے ابھاری گئی تھیں۔ ایک یہ کہ ہندوستان

میں دو مختلف قومیں آباد ہیں: ایک ہندو قوم ہے' اور ایک مسلمان قوم ہے۔ اس لیے متحدہ قومیت کے نام پر یہاں کوئی مطالبہ نہیں کیا جا سکتا۔ دوسری یہ کہ مسلمانوں کی تعداد ہندوؤں کے مقابلہ میں بہت کم ہے' اس لیے یہاں جمہوری اداروں کے قیام کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہندو اکثریت کی حکومت قائم ہو جائے گی' اور مسلمانوں کی ہستی خطرہ میں پڑ جائے گی۔ میں اس وقت اور زیادہ تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ میں صرف اتنی بات آپ کو یاد دلا دوں گا کہ اگر اس معاملہ کی ابتدائی تاریخ آپ معلوم کرنا چاہتے ہیں' تو آپ کو ایک سابق وائسرائے ہند' لارڈ ڈفرن اور ایک سابق لفٹننٹ گورنر مغربی و شمالی (اب یونائیٹڈ پراونس ز) سر آکلینڈ کالون کے زمانے کی طرف لوٹنا چاہیے۔

برطانوی سامراج نے ہندوستان کی سرزمین میں وقتاً فوقتاً جو بیج ڈالے' ان میں سے ایک بیج یہ تھا۔ اس نے فوراً پھول پتے پیدا کیے اور گو پچاس برس گزر چکے ہیں' مگر ابھی تک اس کی جڑوں میں نمی خشک نہیں ہوئی!

سیاسی بول چال میں جب کبھی "اقلیت" کا لفظ بولا جاتا ہے' تو اس سے مقصود یہ نہیں ہوتا کہ ریاضی کے عام حسابی قاعدے کے مطابق انسانی افراد کی ہر ایسی تعداد جو ایک دوسری تعداد سے کم ہو' لازمی طور پر اقلیت ہوتی ہے اور اسے اپنی حفاظت کی طرف سے مضطرب ہونا چاہیے۔ بلکہ اس سے مقصود ایک ایسی کمزور جماعتی ہوتی ہے' جو تعداد اور صلاحیت' دونوں اعتباروں سے اپنے کو اس قابل نہیں پاتی کہ ایک بڑے اور طاقتور گروہ کے ساتھ رہ کر اپنی حفاظت کے لیے خود اپنے اوپر اعتماد کر سکے۔ اس حیثیت کے تصور کے لیے صرف یہی کافی نہیں کہ ایک گروہ کی تعداد کی نسبت دوسرے گروہ سے کم ہو' بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ بجائے خود کم ہو' اور اتنی کم ہو کہ اس سے اپنی حفاظت کی توقع نہ کی جا سکے۔ ساتھ ہی اس میں تعداد (Number) کے ساتھ نوعیت (kind) کا سوال بھی کام کرتا ہے۔ فرض کیجئے' ایک ملک میں دو گروہ موجود ہیں۔ ایک کی تعداد ایک کروڑ ہے' دوسرے کی دو کروڑ ہے۔ اب اگرچہ ایک کروڑ' دو کروڑ کا نصف ہوگا اور اس لیے دو کروڑ سے کم ہوگا' مگر سیاسی نقطہ خیال سے ضروری نہ ہوگا کہ صرف اس نسبتی فرق کی بنا پر ہم اسے ایک اقلیت فرض کر کے اس

کی کمزور ہستی کا اعتراف کرلیں اس طرح کی اقلیت ہونے کے لیے تعداد کے نسبی فرق کے ساتھ دوسرے عوامل (factors) کی موجودگی بھی ضروری ہے۔

اب ذرا غور کیجیے کہ اس لحاظ سے ہندوستان میں مسلمانوں کی حقیقی حیثیت کیا ہے؟ آپ کو دیر تک غور کرنے کی ضرورت نہ ہوگی۔ آپ صرف ایک ہی نگاہ میں معلوم کرلیں گے کہ آپ کے سامنے ایک عظیم گروہ اپنی اتنی بڑی اور پھیلی ہوئی تعداد کے ساتھ سر اٹھائے کھڑا ہے کہ اس کی نسبت "اقلیت" کی کمزوریوں کا گمان بھی کرنا اپنی نگاہ کو صریح دھوکا دینا ہے۔

اس کی مجموعی تعداد ملک میں آٹھ نو کروڑ کے اندر ہے۔ وہ ملک کی دوسری جماعتوں کی طرح معاشرتی اور نسلی تقسیموں میں بٹی ہوئی نہیں ہے۔ اسلامی زندگی کی مساوات اور برادرانہ یک جہتی کے مضبوط رشتے نے اسے معاشرتی تفرقوں کی کمزوریوں سے بہت حد تک محفوظ رکھا ہے۔ بلاشبہ یہ تعداد ملک کی پوری آبادی میں ایک چوتھائی سے زیادہ نسبت نہیں رکھتی۔ لیکن سوال تعداد کی نسبت کا نہیں ہے' خود تعداد اور اس کی نوعیت کا ہے۔ کیا انسانی مواد کی اتنی عظیم مقدار کے لیے اس طرح کے اندیشوں کی کوئی جائز وجہ ہو سکتی ہے کہ وہ ایک آزاد اور جمہوری ہندوستان میں اپنے حقوق و مفاد کی خود نگہداشت نہیں کرسکے گی؟

یہ تعداد کسی ایک ہی رقبہ میں سمٹی ہوئی نہیں ہے' بلکہ ایک خاص تقسیم کے ساتھ ملک کے مختلف حصوں میں پھیل گئی ہے۔ ہندوستان کے گیارہ صوبوں میں سے چار صوبے ایسے ہیں' جہاں اکثریت مسلمانوں کی ہے' اور دوسری مذہبی جماعتیں اقلیت کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اگر برٹش بلوچستان کا بھی اس میں اضافہ کردیا جائے' تو چار کی جگہ مسلم اکثریت کے پانچ صوبے ہو جائیں گے۔ اگر ہم ابھی مجبور ہیں کہ مذہبی تفریق کی بنا پر ہی اکثریت اور اقلیت کا تصور کرتے رہیں' تو بھی اس تصور میں مسلمانوں کی جگہ محض ایک اقلیت کی دکھائی نہیں دیتی۔ وہ اگر سات صوبوں میں اقلیت کی حیثیت رکھتے ہیں تو پانچ صوبوں میں انھیں اکثریت کی جگہ حاصل ہے۔ ایسی حالت میں کوئی وجہ نہیں کہ انھیں کو ایک اقلیتی گروہ ہونے کا احساس مضطرب کرسکے۔

ہندوستان کا آیندہ دستور اساسی (Constitution) اپنی تفصیلات میں خواہ کسی نوعیت کا ہو' مگر اس کی ایک بات ہم سب کو معلوم ہے۔ وہ کامل معنوں میں ایک آل انڈیا وفاق (Federations) کا جمہوری' دستور ہوگا' جس کے تمام حلقے (Units) اپنے اپنے اندرونی معاملات میں خودمختار ہوں گے' اور فیڈرل مرکز کے حصے میں صرف وہی معاملات رہیں گے' جن کا تعلق ملک کے عام اور مجموعی مسائل سے ہوگا۔ مثلاً بیرونی تعلقات' دفاع' کسٹم وغیرہ۔ ایسی حالت میں کیا ممکن ہے کہ کوئی دماغ جو ایک جمہوری دستور کے پوری طرح عمل میں آنے اور دستوری شکل میں چلنے کا نقشہ تھوڑی دیر کے لیے بھی اپنے سامنے لاسکتا ہے' ان اندیشوں کو قبول کرنے کے لیے تیار ہو جائے' جنھیں اکثریت اور اقلیت کے اس پرفریب سوال نے پیدا کرنے کی کوشش کی ہے؟ میں ایک لمحہ کے لیے یہ باور نہیں کرسکتا کہ ہندوستان کے مستقبل کے نقشے میں ان اندیشوں کے لیے کوئی جگہ نکل سکتی ہے۔ دراصل یہ تمام اندیشے اس لیے پیدا ہورہے ہیں کہ ایک برطانوی مدبر کے مشہور لفظوں میں جو اس نے آئرلینڈ کے بارے میں کہے تھے : ہم ابھی تک دریا کے کنارے کھڑے ہیں اور گو تیرنا چاہتے ہیں' مگر دریا میں اترتے نہیں۔ ان اندیشوں کا صرف ایک ہی علاج ہے۔ ہمیں دریا میں بے خوف و خطر کود جانا چاہیے۔ جوں ہی ہم نے ایسا کیا' ہم معلوم کرلیں گے کہ ہمارے تمام اندیشے بے بنیاد تھے!

مسلمانانِ ہند کے لیے ایک بنیادی سوال

تقریباً تیں برس ہوئے' جب میں نے بحیثیت ایک ہندوستانی مسلمان کے اس مسئلہ پر پہلی مرتبہ غور کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ مسلمانوں کی اکثریت سیاسی جدوجہد کے میدان سے یک قلم کنارہ کش تھی' اور عام طور پر وہی ذہنیت ہر طرف چھائی ہوئی تھی' جو 1888ء میں کانگرس سے علیحدگی اور مخالفت کی اختیار کرلی گئی تھی۔ وقت کی یہ آب و ہوا میرے غور و فکر کی راہ نہ روک سکی۔ میں بہت جلد ایک آخری نتیجہ تک پہنچ گیا اور اس نے میرے سامنے یقین اور عمل کی راہ کھول دی۔ میں

نے غور کیا کہ ہندوستان اپنے تمام حالات کے ساتھ ہمارے سامنے موجود ہے اور اپنے مستقبل کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ہم بھی اس کشتی میں سوار ہیں' اور اس کی رفتار سے بے پروا نہیں رہ سکتے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اپنے طرزِ عمل کا ایک صاف اور قطعی فیصلہ کرلیں۔ یہ فیصلہ ہم کیونکر کرسکتے ہیں؟ صرف اس طرح کہ معاملہ کی سطح پر نہ رہیں۔ اس کی بنیادوں تک اتریں' اور پھر دیکھیں کہ ہم اپنے آپ کو کس حالت میں پاتے ہیں۔ میں نے ایسا کیا' اور دیکھا کہ سارے معاملے کا فیصلہ صرف ایک سوال کے جواب پر موقوف ہے۔ ہم ہندوستانی مسلمان ہندوستان کے آزاد مستقبل کو شک اور بے اعتمادی کی نظر سے دیکھتے ہیں' یا خود اعتمادی اور ہمت کی نظر سے؟ اگر پہلی صورت ہے' تو بلاشبہ ہماری راہ بالکل دوسری ہو جاتی ہے۔ وقت کا کوئی اعلان' آئندہ کا کوئی وعدہ' دستور اساسی کا کوئی تحفظ' ہمارے شک اور خوف کا اصلی علاج نہیں ہو سکتا۔ ہم مجبور ہو جاتے ہیں کہ کسی تیسری طاقت کی موجودگی برداشت کریں۔ یہ تیسری طاقت موجود ہے اور اپنی جگہ چھوڑنے کے لیے تیار نہیں۔ اور ہمیں بھی خواہش رکھنی چاہیے کہ وہ اپنی جگہ نہ چھوڑ سکے' لیکن اگر ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہمارے لیے شک اور خوف کی کوئی وجہ نہیں' ہمیں خوداعتمادی اور ہمت کی نظر سے مستقبل کو دیکھنا چاہیے' تو پھر ہماری راہ عمل بالکل صاف ہو جاتی ہے۔ ہم اپنے آپ کو بالکل ایک دوسرے عالم میں پانے لگتے ہیں۔ شک' تذبذب' بے عملی اور انتظار کی درماندگیوں کی یہاں پرچھائیں بھی نہیں پڑ سکتی۔ یقین' جماؤ' عمل اور سرگرمی کا سورج یہاں کبھی نہیں ڈوب سکتا۔ وقت کا کوئی الجھاؤ' حالات کا کوئی اتار چڑھاؤ' معاملوں کی کوئی چبھن' ہمارے قدموں کا رخ نہیں بدل سکتی۔ ہمارا فرض ہو جاتا ہے کہ ہندوستان کے قومی مقصد کی راہ میں قدم اٹھائے بڑھے جائیں!

مجھے اس سوال کا جواب معلوم کرنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگی۔ میرے دل کے ایک ایک ریشے نے پہلی حالت سے انکار کیا۔ میرے لیے ناممکن تھا کہ اس کا تصور بھی کرسکوں۔ میں کسی مسلمان کے لیے بشرطیکہ اس نے اسلام کی روح اپنے دل کے ایک ایک کونے سے ڈھونڈ کر نکال نہ پھینکی ہو' یہ ممکن نہیں سمجھتا کہ اپنے کو پہلی حالت

میں دیکھنا برداشت کرے!

میں نے 1916ء میں "الہلال" جاری کیا اور اپنا یہ فیصلہ مسلمانوں کے سامنے رکھا۔ آپ کو یہ یاد دلانے کی ضرورت نہیں کہ میری صدائیں بے اثر نہیں رہیں۔ 1912ء سے 1916ء تک کا زمانہ مسلمانانِ ہند کی نئی سیاسی کروٹ کا زمانہ تھا۔ 1920ء کے اواخر میں جب چار برس کی نظربندی کے بعد میں رہا ہوا' تو میں نے دیکھا کہ مسلمانوں کی سیاسی ذہنیت اپنا پچھلا سانچا توڑ چکی ہے اور نیا سانچا ڈھل رہا ہے۔ اس واقعہ پر بیس برس گزر چکے۔ اس عرصے میں طرح طرح کے اتار چڑھاؤ ہوتے رہے۔ حالات کے نئے نئے سیلاب بہے۔ خیالات کی نئی نئی لہریں اٹھیں۔ تاہم ایک حقیقت بغیر کسی تبدیلی کے اب تک قائم ہے۔ مسلمانوں کی عام رائے پیچھے لوٹنے کے لیے تیار نہیں۔

ہاں' وہ اب پیچھے لوٹنے کے لیے تیار نہیں۔ لیکن آگے بڑھنے کی راہ اس پر پھر مشتبہ ہورہی ہے۔ میں اس وقت اسباب میں نہیں جاؤں گا۔ میں صرف اثرات دیکھنے کی کوشش کروں گا۔ میں اپنے ہم مذہبوں کو یاد دلاؤں گا کہ میں نے 1912ء میں جس جگہ سے انہیں مخاطب کیا تھا' آج بھی میں اسی جگہ کھڑا ہوں۔ اس تمام مدت نے حالات کا جو انبار ہمارے سامنے کھڑا کردیا ہے' ان میں سے کوئی حالت ایسی نہیں' جو میرے سامنے سے نہ گزری ہو۔ میری آنکھوں نے دیکھنے میں اور میرے دماغ نے سوچنے میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔ حالات میرے سامنے سے صرف گزرتے ہی نہ رہے' میں ان کے اندر کھڑا رہا اور میں نے ایک ایک حالت کا جائزہ لیا۔ میں مجبور ہوں کہ اپنے مشاہدے کو نہ جھٹلاؤں' میرے لیے ممکن نہیں کہ اپنے یقین سے لڑوں۔ میں اپنے ضمیر کی آواز کو نہیں دبا سکتا۔ میں اس تمام عرصے میں ان سے کہتا رہا ہوں' اور آج بھی ان سے کہتا ہوں کہ ہندوستان کے نو کروڑ مسلمانوں کے لیے صرف وہی راہ عمل ہوسکتی ہے جس کی میں نے 1912ء میں انہیں دعوت دی تھی۔

میرے جن ہم مذہبوں نے 1912ء میں میری صداؤں کو قبول کیا تھا' مگر آج انہیں مجھ سے اختلاف ہے' میں انہیں اس اختلاف کے لیے ملامت نہیں کروں گا' مگر میں ان کے اخلاص اور سنجیدگی سے اپیل کروں گا۔ یہ قوموں اور ملکوں کی قسمتوں کا معاملہ

ہے' ہم اسے وقتی جذبات کی رو میں بہہ کر طے نہیں کرسکتے۔ ہمیں زندگی کی ٹھوس حقیقتوں کی بنا پر اپنے فیصلوں کی دیواریں تعمیر کرنی ہیں۔ ایسی دیواریں روز بنائی اور ڈھائی نہیں جاسکتیں۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ بدقسمتی سے وقت کی فضا غبار آلود ہو رہی ہے۔ مگر انہیں حقیقت کی روشنی میں آنا چاہیے۔ وہ آج بھی ہر پہلو سے معاملے پر غور کرلیں' وہ اس کے سوا کوئی راہ عمل اپنے سامنے نہیں پائیں گے۔

مسلمان اور متحدہ قومیت

میں مسلمان ہوں اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ مسلمان ہوں۔ اسلام کی تیرہ سو برس کی شاندار روایتیں میرے ورثے میں آئی ہیں۔ میں تیار نہیں کہ اس کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی ضائع ہونے دوں۔ اسلام کی تعلیم' اسلام کی تاریخ' اسلام کے علوم و فنون' اسلام کی تہذیب' میری دولت کا سرمایہ ہے اور میرا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کروں۔ بحیثیت مسلمان ہونے کے میں مذہبی اور کلچرل دائرے میں اپنی ایک خاص ہستی رکھتا ہوں۔ اور میں برداشت نہیں کرسکتا کہ اس میں کوئی مداخلت کرے۔ لیکن ان تمام احساسات کے ساتھ میں ایک اور احساس بھی رکھتا ہوں' جسے میری زندگی کی حقیقتوں نے پیدا کیا۔ اسلام کی روح مجھے اس سے نہیں روکتی' وہ اس راہ میں میری رہنمائی کرتی ہے۔ میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندوستانی ہوں۔ میں ہندوستان کی ایک اور ناقابل تقسیم متحدہ قومیت کا ایک عنصر ہوں۔ میں اس متحدہ قومیت کا ایک ایسا اہم عنصر ہوں' جس کے بغیر اس کی عظمت کا ہیکل ادھورا رہ جاتا ہے۔ میں اس کی تکوین (بناوٹ) کا ایک ناگزیر عامل (factor) ہوں' میں اپنے اس دعوے سے کبھی دست بردار نہیں ہوسکتا۔

ہندوستان کے لیے قدرت کا یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ اس کی سرزمین انسان کی مختلف نسلوں' مختلف تہذیبوں' اور مختلف مذہبوں کے قافلوں کی منزل بنے۔ ابھی تاریخ کی صبح بھی نمودار نہیں ہوئی تھی کہ ان قافلوں کی آمد شروع ہوگئی اور پھر ایک کے بعد ایک سلسلہ جاری رہا۔ اس کی وسیع سرزمین سب کا استقبال کرتی رہی' اور اس کی فیاض گود

نے سب کے لیے جگہ نکالی۔ ان ہی قافلوں میں ایک آخری قافلہ ہم پیروان اسلام کا بھی تھا۔ یہ بھی پچھلے قافلوں کے نشان راہ پر چلتا ہوا یہاں پہنچا اور ہمیشہ کے لیے بس گیا۔ یہ دنیا کی دو مختلف قوموں اور تہذیبوں کے دھاروں کا ملان تھا۔ یہ گنگا اور جمنا کے دھاروں کی طرح پہلے ایک دوسرے سے الگ الگ بہتے رہے' لیکن پھر جیسا کہ قدرت کا اٹل قانون ہے' دونوں کو ایک سنگم میں مل جانا پڑا۔ ان دونوں کا میل تاریخ کا ایک عظیم واقعہ تھا۔ جس دن یہ واقعہ ظہور میں آیا' اسی دن سے قدرت کے مخفی ہاتھوں نے' پرانے ہندوستان کی جگہ ایک نئے ہندوستان کے ڈھالنے کا کام شروع کر دیا۔

ہم اپنے ساتھ اپنا ذخیرہ لائے تھے' یہ سرزمین بھی اپنے ذخیروں سے مالامال تھی۔ ہم نے اپنی دولت اس کے حوالے کر دی اور اس نے اپنے خزانوں کے دروازے ہم پر کھول دیئے۔ ہم نے اسے اسلام کے ذخیرے کی وہ سب سے زیادہ قیمتی چیز دے دی' جس کی اسے سب سے زیادہ احتیاج تھی۔ ہم نے اسے جمہوریت اور انسانی مساوات کا پیام پہنچا دیا۔

تاریخ کی پوری گیارہ صدیاں اس واقعے پر گزر چکی ہیں۔ اب اسلام بھی اس سرزمین پر ویسا ہی دعویٰ رکھتا ہے' جیسا دعویٰ ہندو مذہب کا ہے۔ اگر ہندو مذہب کئی ہزار برس سے اس سرزمین کے باشندوں کا مذہب رہا ہے' تو اسلام بھی ایک ہزار برس سے اس کے باشندوں کا مذہب چلا آتا ہے۔ جس طرح آج ایک ہندو فخر کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ وہ ہندوستانی ہے اور ہندو مذہب کا پیرو ہے' ٹھیک اسی طرح ہم بھی فخر کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہم ہندوستانی ہیں اور مذہب اسلام کے پیرو ہیں۔ میں اس دائرے کو اس سے زیادہ وسیع کروں گا۔ میں ہندوستانی مسیحی کا بھی یہ حق تسلیم کروں گا کہ وہ آج سر اٹھا کے کہہ سکتا ہے کہ میں ہندوستانی ہوں اور باشندگان ہند کے ایک مذہب یعنی مسیحیت کا پیرو ہوں۔

ہماری گیارہ صدیوں کی مشترک (ملی جلی) تاریخ نے ہماری ہندوستانی زندگی کے تمام گوشوں کو اپنے تعمیری سامانوں سے بھر دیا ہے۔ ہماری زبانیں' ہماری شاعری' ہمارا ادب' ہماری معاشرت' ہمارا ذوق' ہمارا لباس' ہمارے رسم و رواج' ہماری روزانہ زندگی

کی بے شمار حقیقتیں، کوئی گوشہ بھی ایسا نہیں ہے، جس پر اس مشترکہ زندگی کی چھاپ نہ لگ گئی ہو۔ ہماری بولیاں الگ الگ تھیں، مگر ہم ایک ہی زبان بولنے لگے۔ ہمارے رسم و رواج ایک دوسرے سے بیگانہ تھے، مگر انہوں نے مل جل کر ایک نیا سانچا پیدا کرلیا۔ ہمارا پرانا لباس تاریخ کی پرانی تصویروں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ مگر اب وہ ہمارے جسموں پر نہیں مل سکتا۔ یہ تمام مشترک سرمایہ ہماری متحدہ قومیت کی ایک دولت ہے، اور ہم اسے چھوڑ کر اس زمانے کی طرف لوٹنا نہیں چاہتے، جب ہماری یہ ملی جلی زندگی شروع نہیں ہوئی تھی۔ ہم میں اگر ایسے ہندو دماغ ہیں، جو چاہتے ہیں کہ ایک ہزار برس پہلے کی ہندو زندگی واپس لائیں، تو انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ وہ ایک خواب دیکھ رہے ہیں اور وہ کبھی پورا ہونے والا نہیں۔ اسی طرح اگر ایسے مسلمان دماغ موجود ہیں جو چاہتے ہیں کہ اپنی اس گزری ہوئی تہذیب اور معاشرت کو پھر تازہ کریں، جو وہ ایک ہزار برس پہلے ایران اور وسط ایشیا سے لائے تھے، تو میں ان سے بھی کہوں گا کہ اس خواب سے جس قدر جلد بیدار ہو جائیں، بہتر ہے۔ کیونکہ یہ ایک غیر قدرتی تخیل ہے اور حقیقت کی زمین میں ایسے خیالات اگ نہیں سکتے۔ میں ان لوگوں میں ہوں، جن کا اعتقاد ہے کہ تجدید (revival) کی مذہب میں ضرورت ہے، مگر معاشرت میں یہ ترقی سے انکار کرنا ہے۔

ہماری اس ایک ہزار سال کی مشترک زندگی نے ایک متحدہ قومیت کا سانچا ڈھال دیا ہے ایسے سانچے بنائے نہیں جا سکتے۔ وہ قدرت کے مخفی ہاتھوں سے صدیوں میں خودبخود بنا کرتے ہیں۔ اب یہ سانچا ڈھل چکا اور قسمت کی مہر اس پر لگ چکی۔ ہم پسند کریں، یا نہ کریں، مگر اب ہم ایک ہندوستانی قوم، اور ناقابل تقسیم ہندوستانی قوم بن چکے ہیں۔ علیحدگی کا کوئی بناوٹی تخیل ہمارے اس ایک ہونے کو دو نہیں بنا دے سکتا۔ ہمیں قدرت کے فیصلے پر رضامند ہونا چاہیے اور اپنی قسمت کی تعمیر میں لگ جانا چاہیے۔

خاتمہ

حضرات! میں اب آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ میں اب اپنی تقریر ختم کرنا

چاہتا ہوں۔ لیکن قبل اس کے کہ ختم کروں، مجھے ایک بات کے یاد دلانے کی اجازت دیجئے۔ آج ہماری ساری کامیابیوں کا دارومدار تین چیزوں پر ہے۔ اتحاد، ڈسپلن (discipline) اور مہاتما گاندھی کی رہنمائی پر اعتماد۔ یہی ایک تنہا رہنمائی ہے، جس نے ہماری تحریک کا شاندار ماضی تعمیر کیا اور صرف اسی سے ہم ایک فتح مند مستقبل کی توقع کر سکتے ہیں۔

ہماری آزمائش کا ایک نازک وقت ہمارے سامنے ہے۔ ہم نے تمام دنیا کی نگاہوں کو نظارے کی دعوت دے دی ہے۔ کوشش کیجئے کہ ہم اس کے اہل ثابت ہوں۔

عربی نصاب کمیٹی

لکھنؤ' 22 فروری 1947ء

22 فروری 1947ء کو 2 بجے دن سے 4 بجے دن تک کمرہ نمبر 8 لکھنؤ کونسل ہاؤس میں عربی و فارسی نصاب تعلیم کی اصلاحی کمیٹی کا جلسہ زیر صدارت مولانا ابوالکلام آزاد وزیر تعلیم' حکومت ہند منعقد ہوا۔ مولانا موصوف نے حسب ذیل تقریر فرمائی۔

اگر آپ حضرات اجازت دیں تو مجھے جو کچھ عرض کرنا ہے' وہ بیٹھے بیٹھے عرض کروں۔ میں کمیٹی کی طرف سے آپ تمام حضرات کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے کمیٹی کی دعوت منظور کی اور اس موقع کے لیے وقت نکالا۔ اس سلسلے میں سب سے پہلی بات جس پر میں آپ حضرات کی توجہ دلاؤں گا' وہ اس کمیٹی کے کاموں کی نوعیت ہے۔ یہ کمیٹی جس کام کے لیے مقرر کی گئی ہے' وہ کام اپنے دائرے کے لحاظ سے' نہ تو کوئی بڑا وسیع دائرہ رکھتا ہے' نہ اس کی ویسے کوئی خاص اہمیت ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ یہ کمیٹی اس غرض سے بنی تھی کہ اس صوبے کے جو عربی فارسی کے قدیم مدارس ایسے ہیں' جن کو گورنمنٹ امداد دے رہی ہے ان مدارس کے نصاب تعلیم کے اصلاح کے مسئلہ پر غور کیا جائے۔ یہ دائرہ بہت محدود ہے۔ گورنمنٹ جن مدرسوں کو امداد دے رہی ہے' ان کی تعداد بہت زیادہ نہیں ہے۔ جو امداد دی جارہی ہے' اس کی مقدار

بھی بہت محدود ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ سالانہ 60 یا 70 ہزار کی رقم نہیں ہے' جو دی جا رہی ہے۔ اس اعتبار سے دراصل کوئی بڑا کاموں کا دائرہ نہیں آتا کہ جس کے لیے یہ کمیٹی مقرر کی گئی ہوتی۔ اگر یہ کمیٹی مقرر کرنا تھی' تو بہرحال اس کی نوعیت ایسی نہ تھی کہ میں اپنے کو مجبور پاتا کہ اس کے لیے وقت نکالوں۔ لیکن میں نے وقت نکالا۔ جب آپ کے صوبے کے قابل وزیر تعلیم سمپورنا نند جی نے پچھلی مرتبہ اس بات کی تحریک کی۔ انہوں نے سنسکرت کی تعلیم کی اصلاح کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی تھی۔ اس کمیٹی کی رپورٹ میں نے راستے میں ہوائی جہاز میں پڑھی۔ اس کمیٹی نے قابل قدر طریقہ سے اپنا کام پورا کیا۔ مجھے اس کمیٹی کی رپورٹ پڑھ کر تعجب ہوا کہ علمی حقیقت کا میدان کس طرح ایک دوسرے سے جڑتا ہوا چلتا ہے۔ سنسکرت کی تعلیم' اس کا طریقہ' تعلیم' نصاب' تعلیم کے جو نقائص تھے' اور اصلاح کے جو طریقے تجویز کیے گئے' مجھے یہ محسوس ہوا کہ اگر وہاں سنسکرت کے بجائے عربی کا لفظ رکھ دیا جائے' تو معاملہ بالکل یکساں ہے۔ بہرحال وہ کمیٹی مقرر کی گئی اور اس سلسلے میں یہ چیز سامنے آئی کہ عربی مدارس کی اصلاح کے لیے بھی ایک کمیٹی مقرر ہونی چاہیے۔ یہ میں آپ سے کہہ رہا ہوں کہ 1938ء کی بات ہے۔ خط کتابت ہوئی یہ کمیٹی تو مقرر ہو جاتی' مگر چیزیں کچھ ایسی میرے سامنے آئیں کہ خود میں نے ایسی تحریک کی کہ اس کمیٹی کا کام میری نگرانی میں ہونا چاہیے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں نے محسوس کیا کہ اگرچہ اس کمیٹی کا کام محدود ہے' صرف ان مدرسوں کے لیے' جنہیں سرکاری امداد مل رہی ہے' لیکن تاہم جو اس کمیٹی کا مقصد ہے یا جس کام کو یہ انجام دینا چاہتی ہے' وہ کام اپنی نوعیت میں اتنا اہم ہے اور اس درجہ اہمیت رکھتا ہے کہ نہ صرف ہندوستان میں بلکہ تمام اسلامی ممالک اس خواب کی تعبیر ڈھونڈنے میں بیزار ہو چکے ہیں' اور میں نے یہ محسوس کیا کہ اگر نصاب کے پہلو سے میں قدم اٹھا سکتا ہوں اصلاح کا' تو یہ ایک عظیم الشان خدمت ہوگی۔ یہ چیز میرے سامنے آئی' اور قدرتی طور پر یہ کمیٹی اس وقت جو سفارشیں کرے گی' وہ صرف ان مدرسوں کے لیے کرے گی جن کو سرکاری امداد مل رہی ہے۔ وہ مدرسے مجبور ہیں' جو گورنمنٹ سے امداد لیتے ہیں کہ تعلیم کی اصلاح کے

متعلق گورنمنٹ جو بھی نقشہ ان کے سامنے رکھے وہ اسے منظور کرلیں کیونکہ امداد کی ضرورت ان کو مجبور کرے گی۔ لیکن اگر کسی طرح یہ گتھی ایک مرتبہ سلجھائی جا سکتی ہے' اور کم از کم محدود میدان میں اگر ایک بہتر نمونہ ہم پیش کر سکتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اس کے اثرات پھیلیں گے اور وہ تمام دائرے کو اپنے اندر لے سکتے ہیں۔ یہ چیزیں میرے سامنے آئیں۔ اور اس وجہ سے میں نے خود یہ تجویز پیش کی کہ میں اس کمیٹی میں رہوں گا اور صدر کی حیثیت سے کام کروں گا۔ لیکن آپکو معلوم ہے کہ ملک کے حالات نے اس طرح کروٹیں لیں کہ وزارت مستعفی ہوگئی اور یہ تمام کام ملتوی ہوگیا۔ اب پچھلے سال پھر جب نیا نقشہ بنا اور کانگرس نے فیصلہ کیا کہ وہ وزارتوں کو قبول کرے گی اور اس سلسلے میں' میں لکھنؤ آیا اور آپ کے وزیر تعلیم سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے ملتے ہی' باوجود اس کے کہ اس وقت تک کوئی منسٹری نہیں بنی تھی اور صرف گفتگو ہی ہو رہی تھی' انہوں نے سب سے پہلی بات یہی یاد دلائی' جس سے پتا چلتا ہے کہ خود ان کی طبیعت اس بات پر لگی ہوئی تھی انہوں نے کہا کہ وہ کمیٹی پورے طور پر بنی نہیں تھی کچھ نام تجویز کیے گئے تھے اور اس وقت وہ چیز ادھوری رہ گئی تھی' تو سب سے پہلے اس کام کو ہاتھ میں لینا چاہیے۔ میں نے ان سے کہاکہ یہ چیز خود میرے سامنے ہے اور میں کوشش کروں گا کہ جلد سے جلد اس کام کو شروع کردیا جائے۔ چنانچہ وہ کمیٹی بنی اور اس نے کام شروع کردیا' اور اس کا ابتدائی جلسہ بھی ہو چکا ہے اور اس سلسلے میں کچھ سب کمیٹیاں بنی ہیں۔ کاموں نے قدم آگے بڑھالیا ہے۔ لیکن پھر بھی جو چیز ہمارے سامنے آئی' وہ یہ تھی کہ اس کمیٹی نے اپنا کام شروع کر دیا اور بہرحال کسی نہ کسی شکل میں یہ اپنا کام پورا کرے گی۔ اپنی رپورٹ پیش کرے گی اور گورنمنٹ اس رپورٹ کو یقیناً منظور کرے گی۔ اس سلسلے میں جو بھی اصلاح کے مقاصد سامنے ہیں ان کا نقشہ بنے گا اور اس کی امید کی جا سکتی ہے کہ اس نقشہ کا اثر دوسرے حلقوں پر بھی پڑے گا اور آئندہ مزید اصلاح کے دروازے کھلیں گے۔ لیکن پھر بھی یہ بہت دور کی چال ہے۔ اور نتیجے میں کافی انتظار کرنا پڑے گا۔ کیوں نہ اس امر کی کوشش کی جائے کہ براہ راست اس میں ایسا قدم اٹھے کہ جس کی وجہ

سے بجائے اس کے کہ اس دھیمی چال سے کسی نتیجے کا انتظار کیا جائے' ہم فوراً کسی نتیجے پر پہنچ سکیں۔ تب مجھے یہ خیال ہوا کہ میں آپ حضرات کو دعوت دوں اور زحمت دوں' اور ایک ایسی کانفرنس بلائی جائے کہ اس صوبے کے جو اہم اور قدیم ترین مدارس موجود ہیں' اور جن کے حلقہ اثر میں سینکڑوں نہیں' بلکہ ہزاروں انسانوں کے دماغ ہیں' انہیں زحمت دی جائے اور ان کے آگے یہ مسئلہ رکھا جائے اور اس امر پر غور کیا جائے کہ یہ کمیٹی جس غرض سے بنی ہے اس کو ہم اور پھیلائیں اور خود کمیٹی میں مزید اضافہ کریں۔ اور جو طریقہ بھی گفتگو اور مشورے کے بعد قرار پائے اور جس سے اس معاملے میں اصلاحی صورت ہونا چاہیے یعنی بجائے اس کے کہ اس کو کسی محدود دائرے میں پکڑا جائے اور معاملے کی جو اصلی نوعیت ہے یعنی نصاب تعلیم کی اصلاح کی مستقل طور پر ضرورت کا مسئلہ' اس مسئلے کو ہم کسی نہ کسی طرح ازسرنو اٹھا سکیں اور اس کے متعلق کسی نتیجے پر پہنچ سکیں۔ چنانچہ بعض دوستوں سے میں نے اس بات میں مشورہ کیا اور انہوں نے اس سے اتفاق کیا اور آپ حضرات کو زحمت دی گئی۔ یہ زحمت وہی موثر ثابت ہوئی تو میں شکرگزار ہوں گا اور امید ہے کہ یہ زحمت وہی موثر ثابت ہوگی۔ میں پھر آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے ایک اہم مقصد کے لیے زحمت گوارا فرمائی اور مجھے امید ہے کہ یہ زحمت سودمند ہوگی۔ اب مجھے آپ بزرگوں سے جو کچھ بھی عرض کرنا ہے' ابھی ہوائی جہاز میں راستہ میں آتے ہوئے کوشش کی کہ میں اپنے خیالات میں ترتیب پیدا کروں۔ معاملہ بہت وسیع ہے۔ یہ ایک طول طویل داستان ہے۔ علم عربیہ کی تعلیم کا مسئلہ' اس کی پچھلی تاریخ' درمیان عہد کے تغیرات اور اصلاح کی تحریک۔ اس تحریک کے سلسلے میں جو قدم اٹھائے گئے ہیں ان کی کہانی اور پھر آج جو معاملہ منزل پر پہنچ کر رکا ہوا ہے' اس کی سرگزشت۔ یہ ایک بڑی کہانی ہے۔ نہ تو اس کانفرنس کے حصے میں اتنا وقت آیا ہے' جو اس کا متحمل ہو سکتا ہے' اور نہ میں سمجھتا ہوں کہ اس کے جو بہت سے پہلو ہیں' آپ حضرات علم کے سامنے ان کو پیش کر کے وقت کو ضائع کیا جائے۔ میں کوشش کروں گا کہ جو اہم نکات ہیں' جو اہم پوائنٹس (points) ہیں' جن پر ہمیں جلد سے جلد پہنچ جانا چاہیے' ان کی طرف آپ

دوستوں کی توجہ دلاؤں گا۔ لیکن تاہم مشکل یہ ہے کہ وہ داستان ایسی ہے کہ اس کو شروع کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی ابتدائی مقدمہ سامنے لانا پڑتا ہے اور اس لیے چند منٹ ضرور اس میں صرف ہوں گے۔ یہ چیز تو آپ حضرات کے سامنے ہے کہ قدرتی طور سے ہر علم تین مختلف دوروں سے' تین مختلف منزلوں سے گزرتا ہے۔ پہلا دور جو اس کی پیدائش کا ہوتا ہے' جس کو عربی میں کہیں گے تدوین کا دور۔ تو علم کا بحیثیت علم مدون ہونا' وہ اینٹیں جو فی الواقع متفرق دماغوں میں پڑی تھیں' ان اینٹوں کا ایک کے اوپر ایک رکھا جانا اور ایک دیوار بننا' اس کو کہتے ہیں تدوین۔ تو پہلا دور تو علم کی تدوین کا ہوتا ہے' اس کی بناوٹ کا ہوتا ہے۔ لیکن اس پر کام ختم نہیں ہو جاتا۔ دیوار چن دی گئی' لیکن ابھی اس کے نقش و نگار بہت کچھ باقی ہیں۔ تب دوسرا دور آتا ہے' جس کو ترقی کی منزل کہنا چاہیے' تنقیح علوم کا۔ پہلا دور تدوین کا ہے' دوسرا دور تہذیب کا ہے۔ اب اس کی کاٹ چھانٹ کرنا' اس کو سنوارنا' اس کو بڑھانا' اس کی نوک و پلک کا بنانا' یہ تہذیب ہے۔ تو قدرتی طور پر پہلے دور کے بعد ہر علم پر دوسرا دور جو گزرتا ہے' وہ اس کی تنقیح و تہذیب کا ہوتا ہے۔ تنقیح کا لفظ زیادہ موزوں نہیں ہے۔ بلکہ تہذیب کا لفظ زیادہ موزوں ہے۔ تہذیب کے معنی چھانٹنا' سنوارنا ہیں' تو دوسرا دور تہذیب کا ہوتا ہے۔ تو اب نہ صرف دیوار بن گئی' بلکہ اس دیوار کے نقش و نگار بھی بن گئے۔ نوک و پلک درست ہو گئے۔ تب تیسرا دور آتا ہے' جس کو کہ آپ بلوغ اور تکمیل کا دور کہتے ہیں۔ یعنی وہی چیز اب اپنے کمال تک پہنچ گئی۔ اور اب اس میں کوئی چیز ایسی باقی نہیں رہ گئی ہے' جس کی نوک و پلک درست کی جائے۔ اب اس کی اشاعت' اس کا پھیلانا اور بڑھانا ہے۔ درس و تدریس سے اس کو زیادہ استوار کرنا ہے۔ تو تیسرا دور بلوغ و تکمیل کا آتا ہے۔ قدرتی طور پر یہ تین دور اسلامی علوم پر بھی گزرے۔ پہلا دور تدوین کا تھا۔ دوسرا تہذیب کا۔ اور تیسرا بلوغ و تکمیل کا۔ اگر ان تین دوروں اور زمانوں کی جستجو کی جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ تیسری صدی ہجری کا زمانہ تدوین علوم کا زمانہ تھا۔ تیسری صدی ہجری کے بعد سے پانچویں صدی تک کا زمانہ اگر آپ تاریخ کے اوراق الٹیں گے تو معلوم ہو گا کہ پانچویں صدی کا زمانہ تہذیب علوم کا

زمانہ ہے۔ ان دو صدیوں کے اندر جو علوم پچھلی تین صدیوں کے اندر مدون ہو چکے تھے' ان کی تہذیب' ان کی مزید نقش آرائی ان کی ترتیب' یہ داستان ہوئی۔ آپ کو پانچویں صدی ہجری تک نمایاں دکھائی دے گی۔ اس کے بعد کا زمانہ اسلامی علوم کے بلوغ و تکمیل کا اور ان کی اشاعت کا زمانہ تھا۔ یہ' اگر دقت نظر کے ساتھ تاریخ کے صفحات پر نظر ڈالی جائے تو میں سمجھتا ہوں' ساتویں صدی ہجری تک پہنچتا ہے۔ یعنی ساتویں صدی ہجری تک ہم کو ایسے ائمہ فن نظر آتے ہیں' جن کا کام اگرچہ بنیادی طور پر نہیں کہا جا سکتا ہے کہ وہ علوم کی تہذیب کا تھا لیکن اس میں شبہ نہیں ہے کہ بہت سے تہذیب کے کام تھے' جن کو انہوں نے پورا کیا۔ نام ان کے میری زبان پر ہیں' مگر میں اس کے آگے نہیں بڑھنا چاہتا ہوں' اور اس ٹکڑے کو جلد سے جلد ختم کرنا چاہتا ہوں۔ ساتویں صدی کے بعد آپ دیکھیں گے کہ اچانک اسلامی تاریخ کا ایک نیا باب شروع ہوتا ہے' ایک نیا ورق الٹتا ہے' اور یکایک آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ پچھلی چند صدیاں جن علوم کی تدوین میں' ان کی تہذیب میں' اور ان کی درس و تدریس میں اور بلوغ و تکمیل میں' صرف ہو چکی ہیں' اچانک اب ایک نئے دور سے آشنا ہوتی ہیں۔ اب ایک نئے دور سے دوچار ہوتی ہیں۔ اس دور کو میں دور تنزل اور ذہنی تنزل کا دور قرار دیتا ہوں۔ علم و فن کے ہر گوشے میں یہ چیز آپ کو نظر آئے گی کہ جو درخت تہذیب و تدوین کا پھل پھول رہا تھا' اس کی شاخیں ساتویں صدی تک کمال مرتبہ تک پہنچ گئیں اور بجائے اس کے کہ پھلتا پھولتا' اچانک آپ کو نظر آئے گا کہ اب پت جھڑ شروع ہو گئی اور درخت بڑھنے کی جگہ گھٹ رہا ہے۔ چنانچہ ساتویں صدی ہجری کے بعد اسلامی علوم پر ایک عالمگیر تنزل کا دور شروع ہو گیا۔ سب سے پہلی چیز جو نمایاں نظر آتی ہے' وہ یہ ہے کہ علم کی ترقی کے لیے جو بنیادی چیز ہے' جس کو عربی میں نظر و اجتہاد سے تعبیر کیا جاتا ہے' اچانک غائب ہو جاتی ہے اور ساتویں صدی کے بعد جمود ہر گوشے پر چھا گیا۔ چنانچہ اس کے بعد سے کسی علم و فن میں الا یہ کہ کسی گوشے میں کبھی کبھی کوئی نادر شخصیت پیدا ہو گئی' جیسے علامہ ابن تیمیہ پیدا ہوئے۔ ساتویں صدی ہجری میں۔ مگر عام رفتار تنزل کی شروع ہو چکی تھی اور اب کوئی قوت ایسی باقی نہیں رہی کہ

علم کے کسی زاویے میں' کسی نئے گوشے کو ابھارے۔ اب جو کچھ بھی سرمایہ رہ گیا ہے' وہ یہ ہے کہ جو دیواریں اٹھ چکی ہیں' ان کی لیپا پوتی کی جائے۔ چنانچہ یہ دور وہ پیدا ہوتا ہے' جس کو شروح کا دور کہا جا سکے لیکن اس سے پہلے بھی شرحیں لکھی گئی تھیں جو علمی جگہ رکھتی تھیں۔ مگر اب دماغی قوت ختم ہو چکی تھی۔ چنانچہ آپ کو معلوم ہو گا کہ بڑے سے بڑے ائمہ فن جو پیدا ہوتے ہیں' ان کی زندگی کن کاموں میں ختم ہوتی ہے؟ وہ تلخیص میں مصروف ہوتے ہیں' وہ خلاصہ کرتے ہیں' یا شرح نویسی۔ لیکن کسی علم و فن میں نظر و اجتہاد کے ساتھ قدم اٹھے' یہ چیز ختم ہو چکی تھی۔ اور لازمی طور پر اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسلامی علم و فن کے جو کارخانے قائم ہوئے تھے' وہ ایک بنیادی انقلاب سے زائل ہو گئے اور درس و تدریس بجائے اس کے کہ اس ڈھنگ پر چلے' جس ڈھنگ پر چھ صدیوں تک چلا تھا ایک نیا ڈھنگ شروع ہو گیا۔ یہ ڈھنگ دور تنزل کی پیداوار تھا اور روزبروز یہ تنزل بڑھتا گیا۔ اب یہ جو انقلاب ہوا' میں اس کی تفصیل میں نہ جاؤں گا۔ اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ آپ حضرات علم و فضل سے لیے اس کی ضرورت بھی نہیں ہے' کہ میں تفصیل میں جاؤں۔ اس تنزل کا نتیجہ جو کچھ نکلا' اس نے علم و فضل کے مختلف صیغوں پر کیا اثر ڈالا' اس کی داستان بہت طول طویل ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد میں ایسے ارباب نظر موجود تھے کہ جنہوں نے اس چیز کو محسوس کیا۔ اس چیز کو جسے چھ صدیاں گزرنے کے بعد آج ہم محسوس کر رہے ہیں اور اس پر ہم ماتم کر رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایسی گہری نظریں جو باہر کی تمام سطحوں سے گزر کر حقیقت کے اندرونی گوشوں تک پہنچنے والی تھیں' ایسی نظریں اس وقت پیدا ہوئیں' جنہوں نے اس صدی میں اس حقیقت کو محسوس کیا جیسے علامہ ابن خلدون۔ معلوم ہوتا ہے کہ علامہ ابن خلدون نے یہ حقیقت محسوس کی جیسا کہ اس نے اپنے مقدمے میں اشارہ کیا۔ بہرحال یہ خال خال نظریں تھیں۔ ان کا اثر وقت کی عام رفتار پر نہیں پڑا۔ تنزل کا دور شروع ہو چکا تھا اور وہ برابر آگے بڑھتا گیا۔ اب اس دور میں آ کر ہمیں جو تبدیلیاں معلوم ہوئیں' وہ بھی اتنی مختصر نہیں ہیں کہ میں چند منٹوں میں سمجھانے کی کوشش کر سکوں۔ سب سے بڑا بنیادی انقلاب جو پڑھنے پڑھانے کے طریقے

میں ہم کو نظر آتا ہے، وہ یہ ہے کہ اس وقت تک قدماء یعنی پچھلوں کے طریقہ تعلیم کا ایک خاص ڈھنگ تھا۔ وہ طریقہ تعلیم آہستہ آہستہ بدلنے لگا۔ ساتویں صدی کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ وہ بالکل مبدل ہو گیا۔ متقدمین کے طریقہ تعلیم میں آپ کو معلوم ہے کہ علوم و فنون عالیہ کے درس میں ایک قسم ہے آلات کی اور ایک قسم ہے نفس علوم کی۔ عربی میں دو قسمیں کر دی گئی ہیں ایک ہے فنون عالیہ اور ایک ہے نفس علوم۔ تو پچھلوں کا جو طریقہ تعلیم تھا وہ آپ کو معلوم ہے کہ وہ طریقہ تھا املا کا۔ املا عربی کی خاص اصطلاح ہے۔ تعلیم کی وجہ سے یہ اصطلاح اس شکل میں ابھری۔ املا کے جو طریقے متقدمین کے تھے، وہ آپ کو معلوم ہے کہ کیا ہوئے؟ آج کچھ کتابوں کی نقل نکل آئی ہے اور اس سے آپ انداز کر سکتے ہیں کہ املا کسے کہہ سکتے ہیں۔ مثلاً شریف مرتضیٰ کی کتاب ہے امالی۔ املا کے معنی ٹھیک وہی ہیں، جیسے آج آپ کسی کالج میں چلے جائیں، وہاں پروفیسر جس طریقے پر تقریر کرتا ہے لیکچر دیتا ہے، ٹھیک اسی معنی میں املا ہے۔ ایک صاحب علم کو خاص کتاب اپنے سامنے نہیں رکھتا تھا۔ وہ بیٹھتا تھا اور طالب علم اس کے سامنے بیٹھتے تھے۔ طالب علم کاغذ رکھ لیتے تھے اور جو موضوع اس کے پیش نظر ہوتا تھا مثلاً اس نے علم ادب، حدیث، تفسیر لے لیا، اس کے اوپر وہ زبانی تقریر کرتا تھا اور جو طلاب اس کے حلقہ درس میں بیٹھے ہوتے تھے وہ سنتے تھے، اور اس کے نوٹس لیتے تھے اور یہ نوٹس جمع کر لیتے تھے جو کتابیں آج آپ کو مل گئی ہیں، مثلاً قاری کی کتاب، شریف مرتضیٰ کی کتاب، یہ وہی نوٹس ہیں، جو لیکچر کے وقت مستعد طالب علموں نے لیے ہیں۔ اس سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس طریقہ تعلیم کی بلندی کتنی تھی اور آج کل کا جو موجودہ سسٹم ہے، وہ ٹھیک اس کے مطابق چلتا تھا، لیکن بنیادی فرق آپ کو ساتویں صدی کے بعد نظر آئے گا، اگرچہ یہ اس سے پہلے شروع ہو چکا تھا اور اگر ہم اس کی کھوج میں نکلیں، تو معلوم ہو گا کہ ساتویں صدی ہجری کے بعد کا جو زمانہ آتا ہے، تو املا کا طریقہ عربی اور اسلامی مدرسوں میں بالکل مفقود اور ناپید ہو جاتا ہے اور کہیں اس کی پرچھائیں نظر نہیں آتی اور بدقسمتی سے املا کی جگہ کتابیں لے لیتی ہیں۔ یاد رکھیے کہ قدماء کے طریقہ تعلیم میں کیا تھا! ان کا اعتماد املا کے اوپر تھا نہ کہ

کتابوں کے اوپر' حتیٰ کہ اگر میں آپ سے کہوں کہ علوم عالیہ اور صرف و نحو یعنی گرامر ایسی چیز ہے کہ آپ اس کے لیے کہیں گے کہ کتابیں ہونا چاہئیں آج بھی طریقہ تعلیم یہ ہے کہ ان چیزوں کا دارومدار کتابوں پر ہے۔ لیکن آپ کو تعجب ہوگا کہ متقدمین اور مسلمانوں کا جو طریقہ رہا تھا' اسلامی علوم اور صرف و نحو اور ادب یا اس قسم کی جو چیزیں ہیں' اس میں اعتماد املا پر تھا۔ کتابیں بن چکی تھیں' دوسری صدی ہجری سے کتابیں مرتب ہو چکی تھیں' وہ کتابیں اس زمانہ میں مل سکتی تھیں' لیکن اعتماد جو کچھ تھا وہ املا پر تھا۔ آپ غور کیجئے کہ کتنی مسافت اس تنزل کے دور میں اسلامی دماغ نے طے کی ہے۔ اس نکتے سے۔ جہاں اعلیٰ علوم کی تعلیم ہی نہیں بلکہ علوم عالیہ یعنی صرف و نحو و گرامر وغیرہ کی تعلیم بھی زبانی درس کے ذریعے سے ہوتی تھی' جس کو املا کہتے ہیں۔ وہاں سے تنزل کے کارواں کا سفر شروع ہوتا ہے۔ ساتویں صدی میں آپ یہاں تک پہنچ گئے۔ جو اعلیٰ علوم ہیں جیسے کہ حدیث' تفسیر اور فلسفہ' ان کی تعلیم تمام تر کتاب پر ہوتی ہے' کتابوں کے ورق پڑھنے والے کے سامنے ہیں اور دماغ کے سارے دروازے جو اس موقع پر کھلنا چاہئیں' ایک صاحب نظر و علم کے' وہ اس موقع پر بند ہو گئے اوپر قفل چڑھا دیا گیا۔ اس طریقہ تعلیم کو رائج کیا گیا تھا۔ بظاہر آپ کہیں گے کہ یہ ایک نہایت معصوم تبدیلی ہے' جس میں کوئی حرج نہیں' قدماء کے پاس اتنی کتابیں کہاں تھیں! قدماء کے پاس یہ عجیب و غریب طریقہ متون و شروح کا کہاں تھا' متن نویسی کا طریقہ نکلا اور شرحیں لکھی گئیں۔ اور حواشی لکھے گئے۔ یہ تمام سرمایہ پچھلوں کے پاس کہاں تھا! وہ محض تقریر کے ذریعے اپنا کام چلاتے تھے۔ کتابیں بن گئی تھیں۔ وہ مرتب اور مدون ہو گئی تھیں۔ لیکن نہیں۔ کاش معاملہ اس تک ہوتا۔ لیکن معاملہ یہاں تک نہیں ہے۔ بلکہ اس کے پیچھے' اس ظاہری پردے کے پیچھے' ایک بڑی دماغی تبدیلی بیٹھی ہوئی ہے۔ چیز یہ تھی کہ جس علم کو آپ حاصل کرنا چاہتے ہیں' اس علم کے لیے آپ کے دماغ کو کسی ایک معین کتاب کے اوراق میں بند کرنا چاہیے' مقفل کرنا چاہیے۔ یا کہ ایک کتاب سے رد لیتے ہوئے پڑھنے والے کا دماغ اور پڑھانے والے کا دماغ علم و فن کی وادیوں میں کھلے طور پر پڑھ سکے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ تعلیم کے لیے

ایک خاص حد تک کسی معین کتاب کا رکھنا ضروری ہے۔ وہ پڑھنے والے کو مدد دیتی ہے۔ وہ اس کے دماغ کو عبارت کے حل کرنے کی مشق کراتی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ ہر حقیقت اس وقت تک حقیقت ہے' جب تک اعتقاد کے درجے میں ہو۔ وہاں سے جہاں وہ ادھر ادھر ہوئی' اس کے بعد وہ گر گئی۔ یہ چیز اس حد تک صحیح تھی' جس حد تک اسے جانا چاہیے تھا' لیکن جب کتابوں کا راستہ کھل گیا' تو اب تمام تر دارومدار ہو گیا کتاب پر۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ 12 برس سے 14 برس تک آپ اپنا دماغ صرف کرتے ہیں' مگر نتیجہ کیا نکلتا ہے؟ مجھے معاف کیا جائے؟ یہ کہنے کی میں جرات کروں کہ چند کتابوں کا علم حاصل کرنے میں اور نفس علم حاصل کرنے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس تبدیلی سے روزبروز تمام تر اعتمو کتابوں پر ہوتا گیا اور وہ جو پچھلا طریقہ املا کا تھا اور زبانی درس کا تھا' وہ روز بروز ختم ہوتا گیا۔ یہ ایک عجیب مصیبت ہے کہ دنیا ان منزلوں سے گزر چکی اور صدیوں کا فرق ہو گیا۔ آپ کو تعجب ہو گا اگر اب آپ کے سامنے اس چیز کو پیش کروں۔ مثلاً آپ علم تفسیر کا درس لے رہے ہیں اور آپ کا دارومدار بیضاوی اور جلالین پر ہے۔ کیا ہو گا کہ بیضاوی اور جلالین کی لفظی عبارت' اس کے مرجع اور ضمائر کا علم حاصل ہو جائے گا' نہ کہ علم تفسیر کا' بلکہ اس کی پرچھائیں تک نظر نہ آئے گی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ درس و تدریس میں علمی قوت کمزور ہو گئی۔ یہ داستان بہت طویل ہے۔ میں اس کے پھیلاؤ کو سمیٹ نہیں سکتا۔ اس لیے کچھ چیزیں نظر انداز کرنا پڑیں گی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ روز بروز تعلیم کا ڈھانچا بگڑتا گیا۔ تعلیم گرتی گئی۔ ایک بڑی غلط چیز جو پیدا ہوئی' وہ تھا متون و شروح کا حد اعتدال سے آگے بڑھ جانا۔ متین و شرح لکھنے کا طریقہ فی نفسہ صحیح تھا۔ یہ چیز ہر علم و فن میں اور ہر زبان میں اچھی ہوتی ہے لیکن یہ چیز جب حد سے زائد بڑھ جائے گی تب ظاہر ہے کہ اس سے نفس علم کو سخت نقصان پہنچتا ہے۔ بجائے اس کے آپ کسی علم میں کوئی ایک کتاب نپی تلی زبان میں وضاحت کے ساتھ' مرتب کریں اور وہ ایک طالب علم کے آگے رکھیں تاکہ اس کو موقع ملے کہ وہ پورے طور پر اس کتاب پر چھا جائے آپ نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ آپ نے ایک چیز لکھی کہ جس کا نام متین اور گن گن

کر اتنے الفاظ رکھ دیئے کہ کم سے کم الفاظ ہوں اور وہ ایک معمہ اور چیستاں بن سکے۔ جو شرح جو لکھنی چاہیے تو اس شرح میں مبحث آگئے' مثلاً اس نیک بخت نے ایک متن لکھا اور اس امر کی کوشش کی کہ عبارت کو سخت بنانے میں کوئی بھی دروازہ اور کھڑکی کھلی نہ چھوڑی جائے' جس سے دماغ اپنی راہ پر آجائے۔ اگر اس کو عبارت میں اشارہ کرنا تھا' تو وہ ان ذریعوں سے کام لیتا۔ اگر وہ ان ذریعوں کو یعنی مرجع اور ضمائر کو اس عبارت میں رکھ دیتا' تو معاملہ صاف ہے۔ مثلاً اس کو یہ کہنا ہے کہ ایسی صورت میں اس سے نتیجہ یہ نکلے۔ اگر وہاں وہ اس چیز کا نام بھی رکھ دے' تو یہ بحث غیرضروری ہو جاتی ہے' مگر وہ نیک بخت نہیں رکھتا ہے۔ اور یہ ناممکن ہے۔ اب اس سے ایک اہم بحث پیدا ہوئی کہ "اس سے" جو لفظ آیا ہے' وہ کس طرف جاتا ہے۔ چنانچہ اس پر بحث چلی قیاس یہ چاہتا ہے کہ یہ طریقہ جو اختیار کیا گیا' تو یہ اس لیے اختیار کیا گیا کہ اس سے دماغ کو عبارت کے حل کرنے اور سمجھنے کی قوت پیدا ہو۔ حل عبارت بہرحال ضروری چیز ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ایک طالب علم کے لیے تو یہ بہت ہی ضروری ہے کہ وہ کسی کتاب کو پڑھنے اور اس کی عبارت کو سمجھنے میں اور مباحث کو قابو میں لانے کے لیے اپنے اندر صلاحیت پیدا کرسکے۔ لیکن اس کے لیے آپ بہت سے طریقے اختیار کرسکتے ہیں۔ اس کی کیا ضرورت ہے کہ تمام علوم و فنون کی جو آپ تعلیم دیں' ان کی تمام کتابوں کو آپ اسی طریقے سے غارت کریں اور دماغی قوت کا بڑا حصہ اصلی علم کو حاصل نہ کرسکے بلکہ وہ بیکار کی بحث میں خرچ ہو۔ آپ غور کیجئے کہ ایک شخص کو منطق پڑھا رہے ہیں۔ آپ کے لیے جو چیز ضروری ہے' وہ یہ ہے کہ آپ منطق میں اس شخص کے دماغ میں زیادہ سے زیادہ جو براہ راست رشتہ پیدا کرسکتے ہیں پیدا کریں۔ یہ رشتہ جتنا زیادہ مضبوط ہوگا' اتنا ہی زیادہ دماغ اس کے لیے تیار ہوگا اور منطق اور لاجک (Logic) کو پکڑ میں لے گا۔ لیکن آپ نے طریقہ کیا اختیار کیا ہے؟ وہ ایک کتاب شروع کرتا ہے۔ اس کے دماغ کی ساری قوت اس کتاب میں صرف ہوتی ہے۔ دماغ کو صرف کیا جاتا ہے منطق کے مبادیات' مسائل' مباحث' مقاصد کے اوپر۔ کس چیز پر جو ایک خاص نام کی کتاب ہے' اس کا ایک خاص نام کا

مصنف ہے۔ اس نے ایک متن لکھا ہے' اس کی جو ایک خاص سطر ہے' اس کا کیا مطلب ہے؟ آپ خیال کیجئے کہ اس کے اصلی موضوع سے' آپ اس کے دماغ کو بھٹکا کر' کہاں سے کہاں لے گئے! یہ سب کچھ آپ اس لیے کر رہے ہیں کہ عبارت کے حل کرنے کی اسے مشق ہو۔ مگر یہاں معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ آپ اس کے دماغ کو غارت کرتے ہیں۔ مصیبت یہ ہے کہ ہر علم کے لیے گرامر بہت زیادہ ضروری ہے اور بیک وقت آپ دو بوجھ اس پر لادتے ہیں' اور ہندوستان میں تین بوجھ۔ پہلا بوجھ ہے' اصل علم کا۔ دوسرا' حل عبارت کا۔ اس کی ساری قوت عبارت کے حل کرنے میں صرف ہو جاتی ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دماغ کی پکڑ میں چیز نہیں آتی ہے۔ پھر آپ شکایت کرتے ہیں کہ لوگ کوڑھ مغز ہیں لیکن جو طریقہ ہم نے اختیار کیا ہے' وہ ان کو کوڑھ مغز بنانے کے لیے مجبور کرتا ہے۔ میں اس چیز میں زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ طریقہ درس میں جو تبدیلی ہوئی' اس سے اسلامی علوم کو بہت سخت نقصان پہنچا۔ قدماء کے طریقہ املا کو ترک کر دیا۔ اعلیٰ علوم کی تعلیم زبانی درس کے ذریعے سے اور لکچرز (Lectures) سے دی جاتی تھی' یہ بالکل ناپید ہو گیا اور تمام تر کتابوں پر انحصار ہو گیا۔ اور جو طریقہ اختیار کیا گیا' وہ اصولی تعلیم کے لحاظ سے بالکل غلط طریقہ اختیار کیا گیا۔ اب اس سلسلے میں جو بہت سی چیزیں ہیں' ان سب کو بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہو گی' آپ سب حضرات علم و فضل کی موجودگی میں۔ برسوں سے میرا خیال یہ ہے' تیس برس سے میرا خیال ہے کہ علامہ تفتازانی ایک غیر معمولی شخصیت کے مالک تھے اور تیس برس سے میری یہ رائے ہے کہ انھوں نے جو متن و شرح لکھے' وہ ان کی زندگی میں بہت مقبول تھے اور ان کے علم و فضل کا سکہ سب پر جما ہوا تھا اور جو چیز ان کے قلم سے نکلتی تھی' وہ تمام ملک میں چھا جاتی تھی اور بعض تصنیفات ان کی زندگی میں داخل درس ہو گئیں اور آج تک ہم سب منت گزار ہیں' ان کی تصنیفات کے۔ کوئی صاحب یہاں پر ایسے نہ ہوں گے جنھوں نے علامہ موصوف کی تصنیفات نہ پڑھی ہوں۔ علامہ تفتازانی کی کتابوں کی مقبولیت اس زمانے میں اس لیے ہونے لگی تھی کہ اسلامی علوم کا دماغی تنزل شروع ہو چکا تھا اور ترقی کا دور ختم ہو گیا تھا۔ اور ان

کتابوں سے بجائے اس کے کہ آگے چل کر ترقی کے دروازے کھلے ہوں' ایک حد تک نقصان پہنچا۔ یہ میں ڈرتے ڈرتے ایک لفظ آپ حضرات سے کہہ رہا ہوں' تاکہ آپ حضرات کو گراں نہ گزرے۔ یہ بھی میرا عقیدہ کہ ادب عربی اور عربی بلاغت کو مطول نے سخت نقصان پہنچایا۔ قدماء کی کتابیں نکل آئی ہیں' جیسے دلائل الاعجاز اور اسرار البلاغت۔ اس کے علاوہ اور بھی چیزیں نکل آئی ہیں' جن سے ہم اندازہ کرسکتے ہیں کہ بلاغت عربی کی تعلیم کہاں تک تھی۔ ہم بدقسمتی سے کہاں سے گر کر کہاں آگئے۔ جرجانی کی تصنیفات کو چھوڑ دیجئے۔ سکاکی اس دور کی پیداوار تھا۔ دراصل ترقی کا دور ختم ہو چکا تھا' اس نے مفتاح لکھی۔ کاش وہ اصلی شکل میں رہتی۔ لیکن نہیں رکھی گئی۔ بہرحال یہ داستان طولانی ہے۔ میں جس چیز کی طرف آپ کی توجہ دلانا چاہتا ہوں' وہ یہ ہے کہ ساتویں صدی ہجری میں ایک بنیادی تبدیلی ہوئی اور اس نے اسلامی علوم اور اس کی بنیاد کو ہلا دیا۔ اس سلسلے میں یہ بات آپ یاد رکھیے کہ ترقی اور تنزل کا معاملہ ایک عجیب معاملہ ہے۔ کتنی کھلی ہوئی اس تنزل کی باتیں ہوں' یا ترقی کی باتیں ہوں' ان کو آپ یا آپ کا زمانہ فوراً نہیں پکڑ سکتا یا محسوس نہیں کرسکتا۔ ترقی اور تنزل حقیقتاً دونوں بڑی دھیمی چال چلتے ہیں۔ ایسی دھیمی چال چلتے ہیں کہ آپ کو پتا ہی نہیں چلتا کہ کوئی چل رہا ہے۔ لیکن کافی وقت گزر جاتا ہے اور کافی مسافت جب زمانہ طے کرلیتا ہے' تب آپ چونکتے ہیں' مورخ چونکتا ہے' اور لکھتا ہے کہ حقیقت یہاں سے یہاں آگئی۔ لیکن وہ اچانک نہیں آئی ہے۔ پچاس ساٹھ یا سو برس میں یہاں آئی ہے۔ لیکن اس سو برس میں اس کی چال اتنی دھیمی تھی کہ اس چال کو کوئی پکڑ نہیں سکتا تھا۔ منٹوں کو آپ پکڑ سکتے ہیں' گھنٹوں کو آپ پکڑ سکتے ہیں کیونکہ ساٹھ منٹ کا گھنٹہ ہوتا ہے' مگر اس کو آپ نہیں پکڑ سکتے۔ اس کی چال اتنی دھیمی ہے کہ اس کو آپ کی آنکھ بھی نہیں پکڑ سکتی۔ اسی طرح دنیا کی تمام حقیقتیں دھیمی چال چلتی ہیں اور یہ دھیمی چال پکڑ میں نہیں آتی ہے۔ جب زمانہ بہت کافی مسافت طے کرلیتا ہے اور جب ایک نقطے کو چھوڑ کر دوسرے نقطے تک پہنچتا ہے تب آپ چونکتے ہیں کہ کتنی مسافت طے کرلی' تو اس طریقہ پر دماغی ترقی اور تنزل کا افسانہ ہے۔ ترقی شروع ہوتی

ہے' تو کوئی مورخ اس کو پکڑ نہیں سکتا کہ فلاں سنہ' فلاں برس یہ ترقی شروع ہوئی۔ یا بجائے اس کے تنزل کے کارواں کا سفر شروع ہو جاتا ہے' لیکن آنکھ اس کو پکڑ نہیں سکتی کہ وہ بتلا سکے کہ فلاں سنہ میں اتنے بجے اسلامی علوم کے کارواں کے تنزل کا سفر شروع ہوا۔ لیکن وہ چیز شروع ہو جاتی ہے' اور پھر ایک لمبی مسافت طے کر لیتی ہے' تب مورخ کا قلم آشنا ہوتا ہے۔ اس لیے اگر آپ کوشش کریں گے کہ ساتویں صدی ہجری کا زمانہ تخمیناً" مقرر کر دیا ہے' تو ساتویں صدی ہجری کے بعد دماغی تنزل کا زمانہ کھلے طور پر کھڑا ہر جگہ نظر آجائے' تنزل اس طرح شروع نہیں ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ اس نے سر اٹھایا اور ساری نگاہوں نے دیکھ لیا کہ وہ تنزل کھڑا ہے' وہ تو اس طرح آتا ہے کہ لوگوں کو پتہ بھی نہیں چلتا ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم ترقی کے میدان میں ہیں' مگر وہ آہستہ آہستہ اپنا کام کرتا جاتا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ ساتویں صدی ہجری میں اسلامی اور عربی علوم کے مدارس آباد ہیں۔ ہر جگہ علماء و فضلاء درس دے رہے ہیں' جن کے حلقہ درس سے سیکڑوں عالم و فاضل فیض یاب ہوکر زندگی کے بلند سے بلند مرتبے تک پہنچتے ہیں۔ لیکن تنزل کے کارواں کا جو بیج تھا وہ زمین پکڑ چکا تھا اور اس نے اپنے برگ و بار پیدا کرنا شروع کر دیے تھے اب کافی وقت تھا کہ وہ درخت جو پیدا ہوا تھا' وہ جب اس حد تک پہنچا اور بلند ہوا' تو اس کی پھیلی ہوئی شاخیں ہر ایک کو نظر آنے لگیں۔ اگر آپ تاریخ کا مطالعہ کریں' تو یہ بنیادی حقیقت سامنے ابھرے گی۔ میں اس چیز کی طرف آپ کی توجہ دلا رہا تھا کہ ساتویں صدی ہجری کے بعد اسلامی علوم کے تنزل کا دور شروع ہوا۔ اب جب ہم نے اس زمانے کو ایک حد تک معین کرلیا' تو ہمارے لیے یہ چیز صاف ہوگئی کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے درس و تدریس کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا' تو وہ کس خمیر سے پیدا ہوا تھا۔ ترقی کے خمیر سے یا تنزل کے خمیر سے۔ ہندوستان میں اول ہی روز سے اسلامی علوم کے درس و تدریس کی بنیاد جو قائم ہوئی تھی' وہ تنزل کے دور کا نتیجہ تھی' ترقی کے دور کا نتیجہ نہیں تھی۔ اس کے خمیر میں تنزل کا مواد موجود تھا۔ ساتویں صدی ہجری سے پہلے اسلامی علوم کی ترقی کا دور ختم ہو چکا تھا۔ چھٹی صدی میں تاتاریوں کی بغاوت' خلافت کا خاتمہ اور بغداد کا قتل عام'

ان تمام چیزوں کا جو عالمگیر اثر پڑا علوم اسلامیہ اور نیز ان کی دماغی اور علمی حالت پر' اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہر گوشے میں خرابیاں پیدا ہوئیں اور قدرتی طور سے یہ جو ایک گوشہ تھا درس و تدریس علوم کا' وہ بھی اس سے متاثر ہوا' لیکن بہرحال اس کی تفصیل میں نہیں جانا چاہیے۔ لیکن سب سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ اب موجودہ حالت میں جو معاملہ ہمارے پاس موجود ہے' اس کو کس شکل میں حل کرنا چاہیے۔ میں چاہتا ہوں کہ جلد سے جلد وہاں تک پہنچوں۔ یہ چیز کہ جس ڈھنگ پر اسلامی اور عربی علوم کا طریقہ سلسلہ جاری ہے' اس میں اصلاح ہونا چاہیے۔ موجودہ زمانے میں اس کا احساس کب شروع ہوا' یہ بھی کہنا مشکل ہے۔ لیکن میری نظر سے جو چیز گزری ہے۔ اسے میں یہاں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ شاید سب سے پہلے ایک شخص بیرن تو سی نے انیسویں صدی میں' ممالک اسلامیہ کا سفر کیا اور گیارہ جلدوں میں اپنا سفرنامہ مرتب کیا اور خاص اہتمام سے اسے مصر میں چھپوایا۔ میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ دور کو آپ لے لیں اس صدی میں ایک مسیحی عالم یہ کہتے ہوئے نظر آتا ہے کہ جن طریقوں پر اسلامی اور عربی علوم کا ڈھانچا چل رہا ہے' وہ کامیاب نہیں ہے۔ یہ عالم بیرن توسی ہے۔ اس کے بعد پھر جو شخص اس کے خلاف پوری قوت سے اٹھا وہ مرحوم شیخ عبدہ (1) تھا۔ یہ جب مصر سے جلا وطن کیے گئے' تو بیروت گئے۔ اور پھر سید جمال الدین (2) سے مل کر بیروت میں 1892ء میں ایک لائحہ' ایک سکیم تیار کی اور یہ مرتب کر کے ترکی کے شیخ الاسلام کے پاس بھیجی۔ ان کا خیال ہوا کہ یہ ایک اہم مسئلہ ہے' اور اگر اس مسئلہ کو چھیڑا جا سکتا ہے' تو اس کے لیے شیخ الاسلام موزوں ہیں کہ وہ اس مسئلہ کو اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ اس کی بنیاد یہ ہے کہ عربی اور اسلامی علوم کا جو سلسلہ اس وقت قائم ہے' وہ غلط ہے' اور اس سے امید نہیں ہے کہ صحیح نتائج پیدا ہو سکیں۔ اس لیے اس میں اصلاح ہونا چاہیے اور اصلاح کا طریقہ یہ ہے کہ ترکی کے شیخ الاسلام ایک نیا مدرسہ اور کالج قسطنطنیہ یا استنبول میں قائم کریں۔ چنانچہ شیخ رشید رضا (3) کے مضامین میں یہ سکیم موجود ہے۔ یہ نہایت قیمتی تحریک تھی لیکن اس کو اس قابل نہیں سمجھا گیا کہ شیخ محمد عبدہ کے خط کا کوئی جواب دیا جائے اور ظاہر ہے کہ ترکی میں یہ سلسلہ جس شکل میں

قائم تھا اور جو لوگ اس عہدے پر مقرر کیے جاتے تھے' ان سے کسی تبدیلی کی امید نہیں کی جا سکتی تھی۔ لیکن وہ اسکیم ایک قیمتی چیز ہے۔ اس کے بعد سید جمال الدین نے عربی میں ایک اخبار نکالا جس کا نام "العروۃ الوثقیٰ" تھا۔ چودہ نمبر اس اخبار کے نکلے۔ یہ اخبار پیرس سے نکلتا تھا۔ مہینے میں دو نمبر نکلتے تھے۔ حقیقتاً یہ ایک انقلاب انگیز چیز تھی۔ وہ اسکیم اس اخبار میں بھی شائع ہوئی۔ عربی بولنے والی دنیا پر اس اخبار نے اور اس اسکیم نے ایک انقلاب انگیز اثر ڈالا۔ بہرحال وہ مضامین کتاب کی شکل میں چھپ چکے ہیں۔ آپ کو معلوم ہو گا کہ ایک سے زیادہ مضامین شیخ محمد عبدہ نے اس موضوع پر لکھے' مگر ان کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔

آج جب' ہم اس وقت لکھنؤ میں اکٹھا ہوئے ہیں' اس کی یاد دلانا بہت آسان ہے۔ اگر اس مسئلے کو کسی انجمن نے پوری قوت کے ساتھ اٹھایا تو وہ ندوۃ العلماء تھا۔ ندوۃ العلماء کے مدرسے کا قیام 1311ھ میں ہوا۔ بلکہ اسکے بعد ندوۃ العلماء علم کی تحریکوں کا مرکز بن گیا' اور آج بھی وہ بہت سے امتیازات رکھتا ہے۔ ندوۃ العلماء نے پوری قوت کے ساتھ یہ مسئلہ اٹھایا جس میں ارباب فہم حضرات موجود تھے' جو اس مسئلے کی گہرائی کو سمجھ سکتے تھے۔ ندوۃ العلماء نے اپنا بنیادی مقصد اصلاح نصاب تعلیم قرار دیا تھا۔ مگر میں اس کی تفصیلات میں نہیں جاؤں گا۔ اس کے مختلف وجوہ تھے کہ ندوۃ العلماء اس معاملے میں قدم آگے نہ بڑھا سکا' اور یہ گتھی سلجھ نہ سکی۔ اور ابھی تک الجھی ہوئی ہے۔ حال آں کہ بارہا ندوۃ العلماء نے اس سلسلہ میں جو قیمتی خدمات انجام دی ہیں' وہ ہمیشہ اس مسئلے کو سلجھانے میں مدد دیں گی۔ مجھے بہت جلد اپنی داستان کو ختم کرنا ہے۔ جہاں تک اس چیز کا تعلق ہے کہ عربی اور اسلامی علوم کی تعلیم جس ڈھنگ پر دی جا رہی ہے' اس کی اصلاح ہو' اس کے بارے میں اہم اور بنیادی چیزیں کہی گئی ہیں۔ وہ چیزیں سرسری طور پر ہمارے سامنے ہیں۔ ایک' دو' تین' چار' پانچ۔ اور اس کے بعد ہم کو موقع ملے گا کہ ہم غور کر سکیں کہ کیا واقعی ان اصلاحوں کی ضرورت ہے؟ کیا اب بھی وقت نہیں آیا ہے کہ جو حضرات مسلمانوں کی تعلیم کی باگ اپنے ہاتھ میں رکھتے ہیں' اسلامی علوم کی تعلیم کی باگ اپنے ہاتھ میں رکھتے ہیں' وہ اپنی

ذمہ داریوں کو محسوس کریں؟ ان کی ذمہ داریاں بہت ہیں۔ وہ صرف ملک کے سامنے' بلکہ تمام عالم اسلام کے آگے جوابدہ ہیں۔ کیا اب بھی وقت نہیں آیا ہے کہ وہ اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کریں اور اس عظیم الشان خدمت کو انجام دیں۔ اس خواب کو جو سو برس سے لوگوں نے دیکھا ہے' اور جو آج تک شرمندۂ تعبیر نہیں ہوا ہے' کم از کم آج تو اس کی تعبیر عالم اسلامی کے سامنے آئے۔ اس سلسلے میں اس پر غور کرنا چاہیے کہ جو طریقے اصلاح کے ہیں' ان کی اہم باتیں کیا ہیں۔ اور مہمات کیا ہیں۔ سب سے پہلی چیز مختصراً میں آپ سے کہوں گا کہ وہ فنون آلیہ کے متعلق ہے۔ میں نے فنون آلیہ کے متعلق آپ سے کہا۔ وہ فن خود مقصود نہ ہو' بلکہ وسیلہ ہو کچھ ایسی چیزوں کا جو مقصود ہوں' تو اس لیے وہ بھی ضروری ہو گئے۔ کچھ چیزیں تو بطور وسیلے کے ہیں اور کچھ چیزیں بطور مقصود کے ہیں۔ اس سے بڑھ کر کوئی غلطی نہیں ہو سکتی' علم و نظر کے کسی میدان میں کہ ہم وسیلے کو مقصد بنا دیں۔ بدقسمتی یہ ہے کہ ہر گوشے میں سب سے پہلی ٹھوکر جو انسانی دماغ لیتا ہے' وہ یہ ہے کہ جس چیز کو اس نے بطور وسیلے کے پکڑا تھا' اس نے اسے مقصود بنا لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ علم و حقیقت کے ہر میدان میں ہم مقصد سے اتنا دور جا پڑے ہیں کہ ہم کسی حالت میں بھی اس کے نزدیک نہیں پہنچ سکتے ہیں۔ یہاں دیکھنا یہ ہے کہ کون سی چیز وسیلہ ہے' اور کون سی چیز مقصود ہے۔ اگر ہم نے وسیلہ کو مقصود بنالیا اور اسی وسیلہ کو سمجھ لیا کہ یہ ہمارا مقصود ہے' تب ہم نے شیرازے کو درہم برہم کر دیا۔ تو اس کو ڈھونڈنا پڑے گا کہ وہ فنون آلیہ کون کون ہیں' صرف و نحو (گرامر)۔ تو صرف و نحو ایک بنیادی چیز ہے کہ جس کے بغیر عربی زبان کو ہم نہیں سیکھ سکتے ہیں۔ آپ جس چیز کو ڈھونڈنے نکلے ہیں' وہ عربی گرامر نہیں ہے' بلکہ وہ اسلامی علوم و فنون ہیں' جو صندوق میں بند ہیں اور ان پر قفل چڑھا ہوا ہے۔ آپ کو کنجی کی تلاش ہے۔ جو چیز آپ کو ڈھونڈنا ہے اور جو صندوق کے اندر ہے' اس کو بغیر کنجی کے آپ نہیں پا سکتے اور صرف و نحو وہ کنجی ہے جس سے اس صندوق کا قفل کھل سکتا ہے۔ اس طرح علم ادب' عربی علم ادب ہے۔ جب تک آپ کی قابلیت پورے طور پر نہیں ہوتی ہے اور وہ قابلیت صحت کے ساتھ پیدا ہوتی ہے' اس وقت

تک آپ اپنے مقصود سے آشنا نہیں ہوسکتے۔ اس طریقے سے لاجک اور منطق بھی ضروری ہے۔ منطق بجائے خود مقصود نہیں ہے۔ اصلی مقصد تو آپ کا ہے کسی نتیجے تک پہنچنا' کسی بحث کو اس طریقے سے ترتیب دینا کہ صحیح نتیجے تک آپ پہنچیں۔ یہ چیز آپ کو حاصل نہیں ہوسکتی' جس کی آپ کو ضرورت ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ منطق بھی بہرحال وسیلہ ہوئی اور مقصود نہیں ہوئی۔ اور وہ فنون آلیہ میں داخل ہوئی۔ آپ کو توجہ دلاؤں گا کہ اگر آپ تھوڑی دور تک بھی میرے ساتھ چلیں۔ میں زیادہ دور تک آپ کو لے جانے کی ہمت نہیں کروں گا۔ چند قدم آپ میرے ساتھ چلیں' اور مجھے یقین ہے کہ آپ میری طرح مطمئن ہو جائیں گے کہ ان فنون آلیہ کی تعلیم جو ہمارے مدرسوں میں وہی جاری ہے' وہ صحیح نہیں ہے اور جو کام تھوڑے وقت میں کیا جاتا ہے' اس کام کو ہم زیادہ وقت میں کر رہے ہیں' اور بہتر نتیجہ نہیں نکل رہا ہے' تو کوئی فائدہ نہیں ہے۔ ابھی میں نے آپ سے کہا تھا کہ طالب علموں پر دوسری جگہ دو بوجھ ڈالے جاتے ہیں' مگر ہمارے یہاں ہندوستان میں طالب علم پر بیک وقت تین بوجھ پڑ رہے ہیں۔ سب سے پہلی بات جو میں آپ کو یاد دلاؤں گا' وہ یہ ہے کہ نہ عربی ہماری مادری زبان ہے' اور نہ فارسی ہماری مادری زبان ہے۔ جو طالب علم تیار کیا جاتا ہے' اس کے سامنے یہ اجنبی زبانیں ہوتی ہیں اور اس کو ایک لمبی چوڑی مسافت عربی زبان میں طے کرنا پڑتی ہے۔ آپ ایک طالب علم کو ایک مدرسے میں بٹھاتے ہیں اور اس کے سامنے عربی کتابیں رکھتے ہیں۔ آپ یہ چیزیں محسوس نہیں کرتے ہیں کہ عربی زبان میں آپ نے اس کے اوپر ایک وقت میں تین بوجھ ڈالے۔ پہلا بوجھ خود عربی زبان کا ہے۔ دوسرا بوجھ کتاب کا اور جو اس میں عبارت لکھی گئی ہے اور تیسرا بوجھ یہ کہ اس زبان کو سیکھے' جو اس کی مادری زبان نہیں ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہمارا پرانا طریقہ یہ تھا کہ عربی صرف و نحو اور گرامر' میزان اور منشعب سے شروع ہوتی تھی۔ اور صرف میرا اور نحو میر پڑھائی جاتی تھی۔ یہ کتابیں جس زمانے کے لیے لکھی گئی تھیں' اس زمانے کے لیے صحیح تھیں کیونکہ فارسی زبان اس زمانے میں عام طور پر پھیلی ہوئی تھی۔ جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے' یہاں فارسی اجنبی زبان ہے۔ ہندوستان میں کبھی ایسا

دور نہیں گزرا کہ فارسی' مادری زبان ہوئی ہو' لیکن اس میں شبہ نہیں ہے کہ فارسی زبان کی تعلیم اتنی عام تھی کہ لوگوں کو اس سے توحش نہ تھا۔ اس لیے عربی صرف و نحو کی کتابیں فارسی زبان میں لکھی گئی تھیں۔

جو چیز میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں' وہ ایک گہری چیز ہے' مگر بہت صاف ہے اور وہ بغیر کسی کدو کاوش کے آپ کے سامنے ابھر آئے گی۔ ایک شخص عربی زبان سے ناآشنا ہے۔ ایک بچہ آٹھ برس کا عربی زبان کو شروع کرتا ہے۔ آپ میزان اور منشعب سے شروع کراتے ہیں۔ فارسی زبان اس کے لیے اجنبی زبان ہے' اس کی مادری زبان اردو ہے۔ آپ ایک ہی وقت میں اس پر تین بوجھ ڈالتے ہیں۔ پہلا بوجھ یہ ہے کہ وہ فارسی عبارت کو حل کرے' جو اس کے لیے بالکل بیگانہ زبان ہے۔ دوسرا بوجھ یہ ہے کہ وہ کتابیں اور وہ رسائل اس ڈھنگ پر لکھے گئے ہیں کہ فن تعلیم کے لحاظ سے جو سہل آسان اور سمویا ہوا ڈھنگ ہونا چاہیے' اس ڈھنگ پر وہ نہیں لکھے گئے۔ تیسرا بوجھ ہے عربی صرف و نحو کے سمجھنے کا۔ تو اب آپ غور کیجئے کہ اسکا دماغ ایک ہی وقت میں آپ کتنی قوتوں میں ضائع کر رہے ہیں۔ اس کی ساری دماغی قوت تین خانوں میں بٹ رہی ہے۔ فارسی زبان کا سمجھنا' عبارت کا حل کرنا اور عربی گرامر یعنی صرف و نحو کے مسائل کو سمجھنا اور حل کرنا ہے۔ ان تینوں خانوں میں اس کا دماغ بٹ جاتا ہے۔ اگر آپ نے یہ طریقہ اختیار کیا ہوتا کہ اس کا دماغ ایک ہی چیز میں صرف ہوتا یعنی صرف و نحو حاصل کرنا' تو کیا وہ عربی زبان کے صرف و نحو کو زیادہ مضبوطی کے ساتھ اپنے دماغ میں جگہ نہ دیتا؟ اور عربی زبان کا صرف و نحو اس کے دماغ میں راسخ نہ ہو جاتا؟ لیکن آپ ایک ہی وقت میں اس کے دماغ پر تین بوجھ ڈالتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس کی دماغی قوت منتشر ہو جاتی ہے اور جو چیز آپ اس کو سکھا رہے ہیں یعنی صرف و نحو اس کی دماغی قوت اس کو مرکز بنا کر سامنے نہیں رکھتی۔ دماغ بھٹکتا ہے۔ چونکہ فارسی ایک اجنبی زبان ہے۔ فارسی کی عبارت کا مطلب اول سمجھے۔ عبارت پیچیدہ ہے' اس کے حل کرنے میں اسے وقت ہوتی ہے' اور عربی صرف و نحو کے حاصل کرنے میں مزید مشکل پڑتی ہے۔ بہرحال اب مجھے جلد ختم کرنا ہے۔ ایک بنیادی

غلطی جو عربی تعلیم میں ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اس چیز کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی ہے کہ اگر ہم اصلاح چاہتے ہیں' تو بہرحال ہمیں تسلیم کرنا ہے کہ ہندوستان میں عربی علم اور تعلیم میں جس فن کی تعلیم بھی شروع کی جائے' اس کی پہلی رونمائی مادری زبان میں ہونا چاہیے' تاکہ وہ اس کو فوراً پکڑ لے اور اگر پہلی رونمائی مادری زبان میں نہیں ہوتی ہے اور ایک اجنبی روپ اس کے سامنے آتا ہے' جسے وہ پہچانتا نہیں ہے' تو پھر کافی وقت اس کے دماغ کو لگ جاتا ہے کہ وہ اپنے دماغ کو اس اجنبی صورت سے آشنا کرے۔ آپ اسکو فارسی پڑھانا چاہتے ہیں' اس کی کیا ضرورت ہے کہ عربی صرف و نحو کی تعلیم کے پیچ و خم سے اس کے دماغ کو متوحش کریں۔ بلکہ بنیادی اصول یہ ہونا چاہیے کہ ہر فن کی ابتدائی رونمائی مادری زبان میں ہوا کرے۔ کوئی علم جو اس کے سامنے آئے' پہلی مرتبہ جو اپنا گھونگھٹ ہٹائے' اپنے چہرہ سے تو وہ یہ سمجھے کہ یہ جانی بوجھی ہوئی صورت ہے۔ تو نتیجہ یہ نکلا کہ عربی کے صرف و نحو کی پہلی کتاب اردو میں ہونی چاہیے۔ اسی طرح سے منطق کی پہلی کتاب اردو میں ہونی چاہیے۔ اس طریقے سے جتنے فنون آگے ہیں' ان کی پہلی کتاب مادری زبان میں ہونی چاہیے' تاکہ بیک وقت حل زبان' حل عبارت' حل موضوع کا بوجھ اس کے اوپر نہ پڑے۔ اس میں بھی بال و پر ہیں' مگر میں اس کو ختم کرتا ہوں۔

دوسری چیز جس کی تفصیل میں' میں نہ جاؤں گا' وہ متون و شرح کی بابت ہے اس کا طریقہ حد اعتدال سے گزر گیا۔ جس حد تک یہ معاملہ پہنچ گیا ہے' وہ ہماری تعلیمی قوت کو نقصان پہنچا رہا ہے۔ تو بہرحال یہ چیز بھی پیش نظر رکھیے۔ ایک اور اہم چیز یہ ہے کہ متون و شروح کے جو طریقہ اختیار کیے گئے ہیں' ان میں بھی اصلاح کی ضرورت ہے۔ تیسری چیز جو آپ سے میں کہوں گا' وہ یہ ہے کہ وہ کیا اسباب تھے جن کی وجہ سے ہندوستان میں عربی علم و ادب کی تعلیم ہمیشہ کمزور رہی۔ آپ کو معلوم ہے کہ عربی علم ادب میں اسلامی علوم کا خزانہ مدفون ہے' اور بغیر اس سے آشنا ہوئے' ہم اسلامی علوم سے آشنا نہیں ہو سکتے۔ ہندوستان میں ادب عربی کی تعلیم کا سلسلہ ہمیشہ کمزور رہا ہے۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہندوستان کی ایک ہزار برس کی زندگی میں' جو یہاں

اسلامی علوم کو آئے ہوئے ہوگئے' اس ایک ہزار برس کی زندگی میں اگر آپ معلوم کرنا چاہیں کہ کون کون اشخاص ایسے پیدا ہوئے' جن کو یہ قدرت تھی کہ وہ ایک عرب کی طرح سلیس اور فصیح عربی لکھ سکیں' جتنے اشخاص پیدا ہوئے ہیں' میں ایک ہاتھ کی انگلیوں پر گن سکتا ہوں' اور پانچوں انگلیوں کا شمار نہیں ختم ہوگا کہ نام ختم ہو جائیں گے۔ یہ چیز ہمیشہ کمزور رہی۔ اس کے کیا اسباب تھے! آپ اگر اس میں جائیں گے تو یہ ایک بڑی داستان معلوم ہوگی۔ اس داستان کا ایک حصہ اس بنیادی غلطی پر مبنی ہے' جو اس کے بارے میں ہوئی۔ آپ کو سن کر تعجب ہوگا کہ ایک چیز فن بدیع ہے اور ایک فن کتابت یہ کتنی بڑی بنیادی غلطی تھی کہ لوگوں نے فن بدیع اور فن کتابت میں فرق نہیں کیا۔ بدیع کیا ہے' یہ آپ سے کہنے کی ضرورت نہیں۔ جہاں جدید تعلیم یافتہ احباب موجود ہیں' فن بدیع ایک طرح کی صنعت گری ہے' جو ابھرتی ہے' تنزل کے زمانے میں۔ پھر ایک وقت آتا ہے کہ لفظوں کا گورکھ دھندا بنانے میں بڑے سے بڑا کمال دکھایا جاتا ہے۔ ہر زبان میں پہلا دور معانی کا دور ہوتا ہے۔ اس کے بعد جو لوگ آئیں گے' تو محسوس کریں گے کہ معانی کی جھولی خالی ہو چکی ہے۔ لہذا وہ لفظوں کے گورکھ دھندے میں پھنس جائیں گے۔ اگر گرمی کا لفظ پہلے مصرع میں آیا' تو سردی کا لفظ دوسرے مصرع میں آنا ضروری ہے۔ اس طرح کی جو لفظی کاریگریاں ہیں' ان کو عربی میں کہتے ہیں فن بدیع۔ یہ تو آپ سمجھ گئے کہ فن بدیع یعنی'لفظ صنعت گری کا فن' یہ ایک الگ چیز ہے' اس کو آپ نثر میں بھی لاسکتے ہیں اور نظم میں بھی۔ صحیح ادبی ڈھنگ پر لکھنا' یہ چیز ہے فن کتابت۔ کتابت میں اگر آپ فن بدیع کو جوڑ دیں گے' تو وہ کتابت نہیں رہے گی۔ اور یہ لفظوں کی صنعت گری۔ لفظوں کا گورکھ دھندا اور کتابت کا معمہ اور چیستان اور تماشا بن جائے گا' لیکن فن کتابت نہ ہوگی۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ فن بدیع کا زیادہ تعلق نثر سے ہے۔ یہ چیز وہ ہے جو عربی میں نثر سے پیدا ہوئی ہے۔ اسے مقامات کا طریقہ کہہ سکتے ہیں۔ اور اس کے لکھنے والے کو اصحاب مقامات کہتے ہیں۔ مثلاً حریری کے مقامات' بدیع الزمان کے مقامات۔ بہرحال یہ فن بدیع میں لکھے گئے تھے۔ اور ان کی وجہ سے ان کی شہرت ہوئی۔ لیکن خود حریری اور بدیع

الزمان کے ذہن میں ایک منٹ کے لیے بھی یہ بات نہیں آئی کہ کوئی زمانہ لفظی صنعت گری کا ایسا آئے گا کہ وہ فن کتابت کا نمونہ سمجھا جائے گا۔ لیکن ہندوستان میں عربی کی تعلیم کا جب خیال پیدا ہوا' تو مقامات حریری طالب علموں کے سامنے رکھ دیے گئے۔ خدارا انصاف کیجئے کہ فن کتابت سے اس کا کیا تعلق ہے اور کیا اس کو درس میں رکھ کر آپ نمونہ پیش کرنا چاہتے ہیں کہ عربی میں اونچی سے اونچی ترقی ہو سکتی ہے' وہ یہ ہے؟ اس طرح سے آپ طالب علم کا وقت خراب کرتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کو لکھنا تک نہیں آتا ہے۔ لیکن کوشش یہ کی جاتی ہے کہ اس کے سامنے نمونہ فن بدیع کا رکھا جائے۔ لفظی کاریگری کا جس کا کتابت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اگر آپ ایک صفحہ لکھیں جس میں قاف (ق) کا لفظ نہ آئے' یا ایسا صفحہ لکھیں کہ جس میں ہر لفظ میں یا ہر سطر میں قاف (ق) آئے' اگر آپ کی عمر کا دامن بہت پھیلا ہوا ہے' تو کیجئے' چشم ماروشن دل ماشاد۔ لیکن آپ نمونہ خطوط لکھنے کا نہیں بنا سکتے ہیں۔ اگر ایک شخص کو خط لکھنا ہے' جس میں کہ (س) نہ آئے' (ب) نہ آئے' اگر اس طریقہ سے کوئی خط لکھنے لگے گا' تو اس کو لوگ مجنون سمجھنے لگیں گے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ فن بدیع الگ ہے اور فن کتابت الگ ہے۔

حضرات! مجھے معاف کیا جائے کہ 14 یا 15 برس تک لڑکے پڑھتے ہیں' اور دس سطریں عربی کی صلاحیت کے ساتھ نہیں لکھ سکتے' اگر لکھیں گے تو ایسی عربی ہوگی' جس کو ایک عرب پہچان نہ سکے گا تو یہ ایک بہت بڑا نقص ہے جو ہندوستان میں پیدا ہوا۔ ضرورت ہے کہ عربی کی تعلیم کی نیو نئے سرے سے قائم کریں۔ بہترین کتابیں موجود ہیں' بہترین مواد موجود ہے' ایسی کتابیں موجود ہیں کہ عربی ادب کے معجزات میں جن کا شمار ہو سکے۔ مقامات قطعاً" درس میں داخل نہ ہونا چاہیے۔ افسوس یہ ہے کہ ایسی اہم چیز کی طرف آتے ہوئے مجھے دیر لگ گئی۔ بہرحال یہ معاملہ اتنا اہم ہے اور اتنا کم وقت مجھے ملا جس کا مجھے افسوس ہے۔ لیکن زیادہ سے زیادہ زور جواب میرے دماغ میں باقی ہے' وہ میں کوشش کروں گا کہ اس میں صرف ہو۔

حضرات! اب میں آتا ہوں معقولات پر۔ آپ کی تعلیم کا بہت بڑا حصہ ان چیزوں

پر مشتمل ہے' جن کو عام بول چال میں معقولات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جہاں تک درس نظامیہ کا تعلق ہے' اول روز سے اس کی بنیاد اس پر رکھی گئی ہے کہ زیادہ سے زیادہ عنصر معقولات کا رکھا جائے۔ خود ملا نظام الدین نے جو کتابیں رکھی ہیں' وہ محدود تھیں۔ ہمارے درس نظامیہ میں معقولات کا عنصر بہت چھا گیا ہے۔ اب میں اس کی مقدار کے متعلق آپ کو متوجہ نہیں کرنا چاہتا۔ بہرحال میں اس چیز کی طرف آپ کو توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ 1947ء میں کیا اس کا وقت نہیں آیا ہے کہ آپ اس حقیقت کو تسلیم کریں کہ جو حقیقت آج سے ڈیڑھ سو برس پہلے دنیا نے تسلیم کرلی تھی' کب تک آپ اس سے انکار کرتے رہیں گے؟ کب تک آپ اس کو جھٹلائیں گے؟ کیا آپ نے اس کو محسوس کیا ہے کہ دنیا کہاں جارہی ہے اور اب کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے! میں نے بھی بچھی ہوئی چٹائیوں پر بیٹھ کر ان کتابوں کو پڑھا ہے اور میری ابتدائی تعلیم کا وہ سرمایہ ہیں۔ ایک منٹ کے لیے بھی میرے اندر مخالفت کا خیال نہیں پیدا ہو سکتا ہے۔ مگر اس بارے میں میرا دل زخمی ہے۔ یہ معاملہ تو ایسا تھا کہ آج سے ایک سو برس پہلے ہم نے اس چیز کو محسوس کیا ہوتا اور اس حقیقت کو تسلیم کیا ہوتا کہ اب دنیا کہاں سے کہاں آگئی ہے اور اس کے بارے میں کیا تبدیلی ہمیں کرنا ہے۔ لیکن اگر سو برس پہلے ہم نے تبدیلی نہیں کی' تو کم از کم یہ تبدیلی ہم کو پچاس برس پہلے کرنا چاہیے تھی۔ لیکن آج 1947ء میں اپنے مدرسوں میں جن چیزوں کو ہم معقولات کے نام سے پڑھا رہے ہیں' وہ وہی چیزیں ہیں' جن سے دنیا کا دماغی کارواں دو سو برس پہلے گزر چکا۔ آج ان کی دنیا میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ اگر میں اس معاملے کی تفصیل میں جاؤں اور میں آپ کو توجہ دلاؤں' تو کم از کم تین چار گھنٹے چاہییں کہ حقیقتاً معاملات کی نوعیت کیا ہے' لیکن میں سمجھتا ہوں کہ کم از کم جس زمانہ میں ندوۃ العلماء قائم ہوا تھا' آج سے چالیس برس پہلے' اس وقت شاید یہ دقتیں ہوں' لیکن اب یہ حقیقت اتنی کھل چکی ہے کہ اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ جہاں تک معقولات کا تعلق ہے' آپ اس حقیقت پر غور کریں کہ معقولات کا جو کچھ ذخیرہ ہے' وہ سب بیکار ہے۔ سوائے اس کے کہ دماغ کو اس سے بیکار کریں اور

کوئی نتیجہ نہیں ہے۔ بہرحال اب میں تفصیل میں نہیں جاؤں گا لیکن اس پر توجہ دلاؤں گا کہ اس میں شک نہیں ہے کہ فلسفہ اور تاریخ میں ایک عہد متوسط ہے اور آج کل کی بول چال میں فلسفہ تاریخ کے جو خاص حصے کیے گئے ہیں' اس میں ایک زمانہ ہے' دور وسطیٰ کا۔ یہ درمیانی عہد حقیقتاً ایک کڑی ہے' جو یونانی فلسفے کو موجودہ زمانے کے فلسفے سے قریب کرتی ہے اور یہ کڑی دراصل عربوں کا فلسفہ ہے۔ اس میں شک نہیں ہے کہ عربوں نے اپنے فلسفیانہ جدوجہد کے زمانہ میں جو یادگاریں چھوڑی ہیں' وہ فلسفہ کے مختلف صیغوں پر چھائی ہوئی ہیں کہ ان کو دیکھ کر ہم اندازہ کرسکتے ہیں کہ یونان نے' ہندوستان نے' معاملت کو جس حد تک پہنچایا تھا' اب اس کے بعد عربوں نے آج کل کے فلسفہ کو جس جگہ پہنچایا ہے' اس کے بیچ کی ایک جگہ ہے' پچھلی جگہ سے ملتی ہوئی' آنے والی جگہ سے جڑتی ہوئی' یہ عربوں کا فلسفہ ہے۔ اگر یہ کڑی بیچ کی نہ ہوتی' تو شاید نئے دور میں جو اٹھان ہوئی ہے' وہ اٹھان اس شکل میں نہ ہوتی۔ بہرحال یہ وہ دور ہے' جسے موجودہ زمانے کے لوگوں نے تسلیم کیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ وہ نہایت عظیم اور بلند چیز ہے۔ لیکن وہ اس لیے نہیں ہے کہ اس فلسفہ کی تعلیم میں وقت صرف کریں اور فائدہ اٹھائیں۔ وہ ایک قیمتی میراث ہے اور ہمارا فرض ہے کہ اس کو محفوظ رکھیں' اس کی بلندی اور عظمت کو نمایاں رکھیں۔ اس لیے زمانے کو اس کی ضرورت ہے کہ کوئی ایک کتاب تو ایسی ہو کہ جس سے اہل علم کو معلوم ہوسکے کہ فلسفہ عربوں نے جو یونانیوں سے لیا' اس کو انہوں نے کس طریقہ سے محفوظ رکھا اور آنے والی نسلوں تک پہنچایا۔ نیز اس کے مباحث میں انہوں نے کتنے نئے قدم اٹھائے۔ بلاشبہ کوئی نہ کوئی ایسی چیز ضرور ہونا چاہیے کہ جس کے ذریعہ سے ہم اس چیز کو محفوظ رکھ سکیں۔ آج جو طریقہ ہے فلسفہ کا۔ مثلاً انہوں نے گریک فلسفہ کو لیا' یونانی فلسفہ کو لیا۔ اس کے خاص مسائل پر روشنی ڈالی۔ بیچ کا جو دور آیا اس کی کہانی سنائی۔ اس کے بعد ماڈرن زمانہ آیا جسے عہدحاضر کہتے ہیں۔ اب یہ دماغ اس کا مطالعہ کرتا ہے۔ اس کے آگے جو ایک تصویر آجاتی ہے' فلسفہ کے مختلف عہدوں کی' مختلف دوروں کی' وہ اس کے لیے کفایت کرتا ہے کہ دماغ آگے بڑھنے کے

لیے تیار ہو جائے۔ اب ہمیں کوئی نہ کوئی چیز اس طریقے کی رکھنا ہے کہ جو قدیم ذخیرہ موجود ہے' اس کو ہم پورے طور پر محفوظ رکھ سکیں اور نمایاں رکھیں' کہ ایک طالب علم جو ہمارے مدرسے میں آیا ہے' وہ اس سے بے خبر نہ رہے۔ لیکن ساتھ ہی اس کے ضرورت ہے کہ یہ حقیقت مان لی جائے کہ دراصل جو فلسفہ آپ کو پڑھاتا ہے' وہ مختلف مسائل ہیں' جو کہ اس وقت مسخ ہو چکے ہیں۔ اگر یہ چیز آپ نہیں کرتے' تو میں آپ سے کہوں گا کہ آپ زمانہ سے واقف نہیں ہیں۔ بلکہ آپ زمانے سے لڑ رہے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ تاریخ کی ایک لمبی چوڑی داستان ہمارے سامنے ہے' جو ہم کو یقین دلاتی ہے کہ قدامت پرستی نے جب ہتھیار اٹھایا' تو نتیجہ یہ نکلا کہ کش مکش ہوئی' مگر اس کشمکش کا یہ نتیجہ نکلا کہ قدامت پرستی کو ہارنا پڑا اور وقت کو جیتنا پڑا۔ اب اس کشمکش کی عمر بڑھ سکتی ہے۔ لیکن آخر میں ہار ماننا پڑے گی' قدامت پرستی کو۔ تو اس سلسلے میں جیسا میں نے کہا کہ آپ وقت سے لڑ نہیں سکتے۔ ایک چیز میں نے آپ سے کہی کہ آپ وقت سے نہیں لڑ سکتے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ آپ نے اتنی لمبی چوڑی کہانی سنائی' اور یہ کہہ دیا کہ ساتویں صدی کے بعد سے جو دور رہا' وہ تنزل کا دور رہا۔ لیکن اس ساتویں صدی کے بعد یہی مدرسے تھے' یہی تعلیم گاہیں تھیں' اور یہی نصاب تعلیم تھا' یہی پڑھانے والے تھے' جن سے ایسے لوگ پیدا ہوئے' جن کی قابلیت کا یہ حال تھا کہ علوم و فنون تو چھوڑ دیجیے' ملک کے انتظام کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں رہتی۔ اگر یہ تعلیم اور اس تعلیم کا طریقہ غلط تھا تو کیونکر ممکن تھا کہ اس کے پڑھے ہوئے ایسا انقلاب پیدا کرسکتے' اور شہنشاہی امور میں اونچے سے اونچے عہدہ پر پہنچ سکتے۔ ابوالفضل (4) اور فیضی (5) کہاں کے پڑھے ہوئے تھے! نظام الملک طوسی (6) کہاں کے پڑھے ہوئے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے ملک کے انتظام کی باگیں اپنے ہاتھ میں لیں اور اپنے نقوش اور یادگار ہمیشہ کے لیے چھوڑے۔ آپ کو معلوم ہے کہ زمین کی پیمائش اور اس کے بندوبست کا خیال اور بندوبست کے لفظ کی اصطلاح آپ کو معلوم ہے کہ بنیادی طور پر بندوبست آج بھی ان ہی کھمبوں پر قائم ہے' جن کھمبوں پر اکبر (7) کے زمانے میں قائم ہوا تھا۔ پہلی بنیاد تو شیر شاہ (8) کے زمانے میں

پڑی۔ لیکن اکبر کے زمانے میں اس کی تنقیح کی گئی اور ٹوڈرمل (9) نے اس کو مکمل کردیا۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس کا نقشہ کس نے بنایا تھا؟ حکیم فتح اللہ شیرازی (10) ایک شخص تھا' وہ شیراز کا ایک پروفیسر تھا۔ وہ ہندوستان آیا' اکبر کے زمانے میں۔ یہ پیمائش کا معاملہ اس کے سپرد کیا گیا۔ فتح اللہ نے اک رسالہ اس کے اوپر لکھا اور راجہ ٹوڈرمل سے مل کر اس کام کو انجام دیا۔ آخر یہی تو تعلیم تھی' جس تعلیم سے ایسے لوگ پیدا ہوئے۔ نہ صرف علوم و فنون کے صیغے میں' بلکہ ملک کے انتظامی معاملات میں بھی ان کا ہمیشہ دخل رہا۔ آج میں کہوں گا کہ کسی اونچے عہدے پر کسی مولوی کو رکھ دیجئے تو لوگ ہمیں پریشان کریں گے۔ لیکن یہی مولوی تھے' جن کے ہاتھ میں سول (Civil) اور دیوانی کے انتظامات تھے۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے' وہی لوگ تھے جو ان ہی مدرسوں سے تعلیم حاصل کرکے آئے تھے اور جہاں تک ہندوؤں کا تعلق ہے' وہ پاٹھ شالاؤں کے پڑھے ہوئے تھے۔ مگر ایک چیز آپ بھول گئے۔ وہ چیز ہے تعلیم۔ اور وقت اور زندگی کی چال کے متعلق کوئی تعلیم کامیاب نہیں ہوسکتی اگر وہ وقت اور زندگی کی چال کے ساتھ نہ ہو' جو تعلیم ہو وہ ایسی ہونی چاہیے کہ زمانہ کی جو چال ہے' وہ اس کے ساتھ جڑ سکتی ہو۔ اگر آپ دونوں ٹکڑوں کو الگ الگ رکھیں گے' تو وہ تعلیم کامیاب نہیں ہوسکتی۔ یہی عربی کی اور فارسی کی تعلیم تھی۔ لیکن اس وقت زمانہ 1947ء کا نہ تھا۔ اس تعلیم میں اور وقت میں رشتہ تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے تھے۔ نتیجہ یہ تھا کہ ان مدرسوں سے جو لوگ پیدا ہوئے' زمانہ ان کا استقبال کرتا تھا۔ بہرطور وہ زمانہ گزر گیا۔ لیکن اس کے بعد کیا ہوا کہ زمانہ تو اپنی پوری تیز رفتاری کے ساتھ چلتا رہا' اور آپ وہیں بیٹھے رہے آپ ان ہی مدرسوں میں بیٹھے رہے' جن مدرسوں میں آپ نے آج سے پانچ سو برس پہلے قدم رکھا تھا۔ اس پانچ سو برس کے اندر دنیا بیٹھی نہیں رہی۔ زمانہ بھی چلتا رہا۔ وہ پانچ سو برس کی مسافت طے کرچکا ہے اور آپ وہیں کے وہیں بیٹھے ہوئے ہیں۔ آج جو تعلیم آپ ان مدرسوں میں دے رہے ہیں' آپ وقت کی چال سے اسے کیسے جوڑ سکتے ہیں؟ نہیں جوڑ سکتے۔ نتیجہ یہ ہے کہ زمانہ میں اور آپ میں ایک اونچی دیوار کھڑی ہوگئی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہ

تعلیم کہ جس تعلیم سے ملک کے بہترین مدبر' ملک کے بہترین منتظم اور ملک کے بہترین عہدہ دار پیدا ہوتے تھے۔ آج ان ہی مدرسوں کو یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ یہ لوگ بالکل نکمے ہیں' ان مدرسوں سے نکلنے کے بعد مسجدوں میں بیٹھ کر یہ لوگ بس خیرات کی روٹیاں توڑ لیں۔ کتنے افسوس کی بات ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جو لوگ ایسا سمجھتے ہیں' انہوں نے حقیقت کو نہیں سمجھا ہے۔ لیکن ہمیں یہ ماننا پڑے گا اور اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ ہم زمانے سے دور ہو گئے ہیں۔ میرے پاس ایک بہت ہی نپی تلی بہتر طریقے سے لکھی ہوئی ایک تحریر آئی کہ چونکہ آپ گورنمنٹ آف انڈیا کے صیغہ تعلیم میں موجود ہیں' تو کیا یہ توقع کی جائے کہ جو عربی فارسی علوم کے مدرسے موجود ہیں' جہاں سے بہتر سے بہتر مستعد طلبا فارغ ہو کر ڈگریاں حاصل کر کے نکلتے ہیں' کونسی وجہ ہے کہ ان کے لیے ملک کی انتظامی زندگی میں وہ دروازے کھلے نہ ہوں' جو انگریزی تعلیم کے حاصل کیے ہوئے اور پڑھے ہوئے لوگوں کے لیے کھلے ہوئے ہیں؟ کون سی وجہ ہے کہ جو تعلیم ہمارے ملک کی اصلی تعلیم مدرسوں اور پاٹھ شالاؤں میں دی جاتی تھی اور جس تعلیم کو حاصل کر کے فتح اللہ شیرازی اور ٹوڈر مل پیدا ہوتے تھے۔ آج اس تعلیم سے جو لوگ نکلے ہیں' ان پر ملک کے انتظامی دروازہ بند ہوں؟ مجھے ان کے جواب دینے کی مہلت نہیں ہوئی۔

لیکن میں آپ سے کہتا ہوں کہ اس کا جواب اسی میں موجود ہے۔ آپ نے کبھی اس کی کوشش نہیں کی کہ آپ اپنے مدرسوں کو زمانہ کی چال کے ساتھ جوڑ سکیں۔ زمانہ چلتا رہا اور ترقی پر پہنچ گیا۔ اور آپ وہیں رہے' جہاں تھے' نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کی تعلیم کو زمانہ کی مانگوں سے کوئی رشتہ نہیں رہا۔ اور زمانہ نے آپ کے خلاف آپ کو نکما سمجھ کر فیصلہ کر دیا۔ زمانہ نے آپ کو بیکار سمجھا ہے' آپ کو نکما سمجھا ہے۔ مدرسہ میں عربی آن کر پڑھنا ہے' تو یہ مجبوری ہے کہ کسی نہ کسی مولوی کو رکھ لیا۔ لیکن کوئی حقیقی وقعت آپ کے دل میں مولوی کی نہیں ہے۔ یہ کتنے افسوس کی بات ہے۔ آپ کے دل میں اس کی عزت ہونا چاہیے۔ تو میں آپ سے کہتا ہوں کہ اس کی تہہ میں جو چیز ہے وہ زمانے کی ناقدر شناسی ہے۔

ہم کو اپنی جگہ اس کے ساتھ یہ بھی ماننا چاہیے کہ ہمارا فرض تھا کہ ہم زمانے کے تقاضوں کا ساتھ دیتے۔ مگر ہم نے زمانے کا ساتھ نہیں دیا۔ بہرحال تقریباً آدھے سے زیادہ باتیں باقی رہ گئی ہیں۔ چار بجنے میں چھ منٹ باقی ہیں' لیکن اب میں زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ اب مجھے آپ سے یہ عرض کرنا ہے کہ کام تو اس وقت ادھورہ رہ گیا ہے' مگر میں آپ سے امید کرتا ہوں کہ آپ کل بھی میرا ساتھ دیں گے اور جس طرح سے آپ نے آج کے لیے وقت نکالا ہے' کل بھی وقت نکالیں گے۔ کام ابھی بہت کرنے کا ہے میں چاہتا تھا کہ اگر آپ متفق ہوں تو کل بجائے دو کے ایک بجے کا وقت رکھا جائے۔ اگر یہ آپ حضرات کے ناپسند نہ ہو' تو بہتر ہے۔ اصلی کام ابھی باقی ہے۔ میں اس لیے نہیں آیا تھا کہ کچھ کہوں' بلکہ میں اس لیے آیا تھا کہ آپ حضرات سے سنوں۔ مجھے اس کا افسوس ہے۔ میرا ارادہ تھا کہ میں کچھ عرض کرکے درخواست کروں گا کہ آپ حضرات اپنے مشورے سے مدد دیں۔ لیکن تمام وقت میری تقریر میں خراب ہوگیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر ہمارا کام کچھ آگے بڑھے گا اور ہم کامیابی کی حد تک پہنچے' تو زیادہ بہتر ہوگا۔ اس لیے ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم معاملات کو ترتیب کے ساتھ سوچیں اور اس کے بعد طے کرکے ایک سب کمیٹی اس کانفرنس کی بنائی جائے۔ میری پریشان گوئی نے چونکہ سارا وقت لے لیا ہے' اس لیے ڈیڑھ بجے کل پھر یہ کانفرنس ہوگی۔

روابط — بین ایشیائی کانفرنس

نئی دلی' مارچ 1947ء

صدیوں کا سویا ہوا ایشیا عروس نو کی طرح انگڑائی لے کر بیدار ہو رہا ہے۔ ہر طرف آزادی کی لہر پیدا ہو چکی ہے۔ چین نے سالہا سال کی بہادرانہ جنگ کے بعد جاپانی غلبہ سے نجات حاصل کی۔ انڈونیشیا آزاد ہو گیا ہے' فلپائن آزاد ہو گیا ہے' ویٹ نام آزادی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہے' برما سے آزادی کا وعدہ کیا گیا ہے۔ ہندوستان کی آزادی کی تاریخ مقرر ہو گئی ہے' فلسطین آزادی کا عزم کر چکا ہے۔ مصر سے برطانویوں کا انخلا ہو رہا ہے۔

ہندوستان کو ابھی نیم آزادی ہی حاصل ہوئی تھی کہ اس نے اپنے ایشیائی بھائیوں کو دعوت دی کہ آؤ مل بیٹھیں اور مستقبل کے امن و امان' اتحاد و اخوت' باہمی میل جول کی ایک بنیاد رکھیں اور الحمدللہ کہ ہمارے ایشیائی بھائیوں نے دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی' اس صدا پر لبیک کہا وہ سب پروانہ وار آئے کہ آئندہ زندہ رہنے کے لیے ایک لائحہ عمل مرتب کریں۔ ایشیا کے

32 ممالک سے تقریباً 250 نمائندے آئے ہیں اور ان میں سے
تقریباً 15 ممالک کے نمائندے اسلامی ملکوں کے نمائندے ہیں۔
اس موقعہ پر امام الہند مولانا آزاد نے اپنی بے مثال تاریخی
بصیرت کی روشنی میں اس اجتماع پر ایک بیان دیا جو حسب ذیل
ہے۔

بین الایشیائی کانفرنس جس کا اجلاس آج کل دہلی میں ہو رہا ہے' تاریخ میں اپنا ثانی نہیں رکھتی۔ اس میں شک نہیں کہ بدھوں کے عہد میں ہندوستان میں بھکشوؤں کے زبردست اجتماع ہوئے ہیں۔ اس میں برما' سیلون اور دور انڈونیشیا سے نمائندے شریک ہوئے ہیں۔ مگر وہ اجتماع خالص مذہبی مقاصد کے پیش نظر ہوئے ہیں اور صرف بدھ مت کے حامیوں کے لیے مخصوص تھے۔ ان میں نہ وسعت مفاد پایا جاتا تھا نہ دہلی کی اس کانفرنس کی سی مختلف قوموں اور مذہبوں اور تمدنوں کی نمائندگی ہوتی تھی۔

اٹھارہویں صدی میں نادر شاہ کو بھی مسلم عقائد کی ایک زبردست کانفرنس بلانے کا خیال ہوا' شیعوں اور سنیوں کے اختلافات سے اسلام کے اتحاد کو خطرہ لاحق تھا۔ خود شیعوں اور سنیوں میں دھڑے بندی اور اختلاف تھا۔ اس مجادلہ کے وقت ان اختلافات کو مٹانے کی کوشش میں بغداد میں علماء کا ایک زبردست اجتماع کیا گیا۔

اس میں عراق' ایران' بخارا' سمرقند اور دوسرے مسلمان مذہبی خیال کے مراکز سے نمائندے جمع ہوئے تھے۔ قدیم ہندوستان کے بدھ مت کے پیروؤں کی یہ کانفرنس بھی ایک عقیدے کے حامیوں تک محدود تھی۔ اس میں بین الایشیائی کانفرنس کی طرح انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر نظر نہ ہونے کی خامی بھی تھی۔

عام مسائل

اس طرح یہ پہلا موقع ہے کہ جب اقوام ایشیا ایک پلیٹ فارم پر ان مسائل پر غور کرنے کو جمع ہوئی ہیں جو کہ ان کے مشترکہ مسائل ہیں۔ وہ قومی آزادی کے مطالبہ کے باطنی مقاصد اور ظاہر صورت پر غور کریں گے۔ وہ اپنے مشترکہ کلچر کی الجھنوں کو

سلجھانے کی کوشش اور رفع اختلافات و باہمی میل جول کے ذرائع تلاش کریں گے وہ اقتصادی مسائل کو سمجھنے کی سعی کریں گے۔ جس نے سوشل طریقوں میں اختلاف کی صورت پیدا کی ہے اور ایسے سوشل طریقوں کو وضع کرنے کی کوشش کریں گے، جن کی رو سے عوام مکمل اور آزاد زندگی بسر کرسکتے ہیں۔

مندوبین میں مختلف ممالک کی عورتیں بھی شامل ہیں اور اب تک کی تاریخ میں پہلی بار وہ بحیثیت ایشیا کی عورتوں کے اپنے مسائل پر غور کریں گی۔

اس سے قبل کبھی ایسا اجتماع نہیں ہوا ہے اور یہ بڑی بدقسمتی ہوگی، اگر کانفرنس لوگوں کے مستقبل اور باہمی اتحاد کے خاکہ کی بنیاد رکھے بغیر ناکامی کے ساتھ ختم ہوگئی۔

اس قسم کی آرگنائزیشن (1) کی بنیاد شاید اب اور یہاں نہیں رکھی جاسکتی، بلکہ مستقبل میں کام کرنے کی تجاویز پر اس کانفرنس میں بحث ہونی چاہیے۔

میں یہ چاہتا ہوں کہ اس میں شریک ہونے والے تمام ممالک کے نمائندوں کی اسٹیڈنگ کمیٹی (2) کی ایک انسٹیٹیوٹ (3) ہونی چاہیے۔ اس انسٹیٹیوٹ کا کام صرف یہی نہ ہونا چاہیے کہ وہ وقتاً" فوقتاً" مختلف ممالک میں کانفرنسیں منعقد کرے۔ بلکہ لائبریریاں بھی بنائے، جہاں پر ان ممالک کی تازہ ترین کتب فراہم کی جائیں۔ انسٹیٹیوٹ اگر ماہنامہ نہیں، تو کم از کم ایک سہ ماہی جریدہ بھی جاری کرے جس میں مشرقی ممالک کے عوام سے متعلقہ سوالات اتحاد اور سوچنے سمجھنے کے جذبہ سے بحث کی جائے۔

سیاسیات کو دخل نہ ہو

ہم سب کو مسرت ہونی چاہیے کہ ایشیائی اقوام کے اس عظیم کام میں رہنمائی کا شرف ہندوستان کو حاصل ہے۔ بہرحال اب وقت آگیا ہے کہ آگے قدم بڑھایا جائے۔ اب عرصہ تک ہماری دنیا خوابوں اور تصورات تک محدود نہیں ہوگی، بلکہ حقائق کی ایک زندہ تصویر بنے گی۔ انسانی اتحاد کے مقاصد کے لیے وقت اور فاصلہ کا سوال ختم ہوگیا ہے۔ لہٰذا یہ ایشیائی کانفرنس ایک عالمگیر کلچر کانفرنس کا خاکہ تیار کرے، جس میں صرف مشرقی ہی نہیں، بلکہ مغربی اقوام بھی شرکت کریں گی۔

میں کانفرنس کے رہنماؤں کو کانفرنس کو غیر سیاسی اور ناطرفدار بنانے پر ان کی فہم و نظر پر مبارک باد دیتا ہوں۔ ایسی کلچرل کانفرنس میں تنگ نظر سیاست کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ اور نہ فرقہ وارانہ اور جماعتی تعصبات پیدا کرنے کی گنجائش ہے۔ مجھے اس بات میں قطعاً" شبہ نہیں ہے کہ شرکائے کانفرنس کے دلوں میں وسیع انسانی اور کلچرل نظریہ پیدا کرنے اور سمجھنے اور باہمی میل جول پیدا کرنے کا جذبہ موجود ہے۔ ہم ان لوگوں کے ممنون ہیں' جنہوں نے ہندوستان کا دعوت نامہ قبول کیا۔ وہ دور دراز ممالک سے آئے ہیں اور مجھے امید ہے کہ جب وہ واپس جائیں گے' تو اپنے ساتھ ہندوستان کی دوستی اور خیر سگالی کا پیغام لے کر جائیں گے۔

مسلمانان دلی کا اجتماع

جامع مسجد، دلی اکتوبر 1947ء

میرے عزیزو! آپ جانتے ہیں کہ وہ کون سی چیز ہے' جو مجھے یہاں لے آئی ہے۔
میرے لیے شاہ جہان کی اس یادگار مسجد میں یہ اجتماع کوئی نئی بات نہیں ہے۔ میں نے
اس زمانہ میں جس پر لیل و نہار کی بہت سی گردشیں بیت چکی ہیں' تمہیں یہیں سے
خطاب کیا تھا۔ جب تمہارے چہروں پر اضمحلال کی بجائے اطمینان تھا اور تمہارے دلوں
میں شک کی بجائے اعتماد۔ آج تمہارے چہروں کا اضطراب اور دلوں کی ویرانی دیکھتا
ہوں' تو مجھے بے اختیار پچھلے چند برسوں کی بھولی بسری کہانیاں یاد آجاتی ہیں۔ تمہیں یاد
ہے' میں نے تمہیں پکارا تم نے میری زبان کاٹ لی' میں نے قلم اٹھایا اور تم نے
میرے ہاتھ قلم کر دیے۔ میں نے چلنا چاہا' تم نے میرے پاؤں کاٹ دیے۔ میں نے
کروٹ لینی چاہی' تم نے میری کمر توڑ دی۔ حتیٰ کہ پچھلے سات برس کی تلخ نوا سیاست
(1) جو تمہیں آج داغ جدائی دے گئی ہے' اسکے عہد شباب میں بھی میں نے تمہیں
خطرے کی شاہراہ پر جھنجھوڑا' لیکن تم نے میری صدا سے نہ صرف احتراز کیا' بلکہ غفلت
و انکار کی ساری سنتیں تازہ کریں۔ نتیجہ معلوم کہ آج ان ہی خطروں نے تمہیں گھیر لیا
ہے' جن کا اندیشہ تمہیں صراط مستقیم سے دور لے گیا تھا۔

سچ پوچھو تو میں ایک جمود ہوں یا ایک دور افتادہ صدا' جس نے وطن میں رہ کر

بھی غریب الوطنی کی زندگی گزاری ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جو مقام میں نے پہلے دن اپنے لیے چن لیا تھا' وہاں میرے بال و پر کاٹ لیے گئے ہیں۔ یا میرے آشیانے کے لیے جگہ نہیں رہی' بلکہ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میرے دامن کو تمہاری دست درازیوں سے گلہ ہے۔ میرا احساس زخمی اور میرے دل کو صدمہ ہے۔ سوچو تو سہی' تم نے کونسی راہ اختیار کی۔ کہاں پہنچے اور اب کہاں کھڑے ہو؟ کیا یہ خوف کی زندگی نہیں؟ کیا تمہارے حواس میں اختلال نہیں آگیا ہے؟ یہ خوف تم نے خود ہی فراہم کیا ہے۔ یہ تمہارے اپنے اعمال کے پھل ہیں۔

ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں بیتا' جب میں نے تم سے کہا تھا کہ دو قوموں کا نظریہ حیات معنوی کے لیے مرض الموت کا درجہ رکھتا ہے' اس کو چھوڑ دو۔ یہ ستون جن پر تم نے بھروسہ کیا ہے۔ نہایت تیزی سے ٹوٹ رہے ہیں' لیکن تم نے سنی ان سنی برابر کر دی اور یہ نہ سوچا کہ وقت اور اس کی تیز رفتار تمہارے لیے اپنا ضابطہ تبدیل نہیں کر سکتے۔ وقت کی رفتار تھمی نہیں۔ تم دیکھ رہے ہو کہ جن سہاروں پر تمہیں بھروسہ تھا' وہ تمہیں لاوارث سمجھ کر تقدیر کے حوالے کر گئے۔ وہ تقدیر جو تمہارے دماغی لغت کی منشاء سے مختلف مفہوم رکھتی ہے یعنی ان کے نزدیک فقدان ہمت کا نام تقدیر ہے۔

انگریز کی بساط تمہاری خواہش کے برخلاف الٹ دی گئی اور راہ نمائی کے وہ بت جو تم نے وضع کیے تھے' وہ بھی دغا دے گئے' حالانکہ تم نے یہی سمجھا تھا کہ یہ بساط ہمیشہ کے لیے بچھائی گئی ہے' اور ان ہی بتوں کی پوجا میں تمہاری زندگی ہے۔ میں تمہارے زخموں کو کریدنا نہیں چاہتا۔ اور تمہارے اضطراب میں مزید اضافہ میری خواہش نہیں ہے لیکن اگر کچھ اور ماضی کی طرف پلٹ جاؤ' تو تمہارے لیے بہت سی گرہیں کھل سکتی ہیں۔ ایک وقت تھا' میں نے ہندوستان کی آزادی کے حصول کا احساس دلاتے ہوئے تمہیں پکارا تھا اور کہا تھا۔

"جو ہونے والا ہے اس کو کوئی قوم اپنی نحوست سے روک نہیں سکتی۔ ہندوستان کی تقدیر میں سیاسی انقلاب لکھا جا چکا ہے اور اس کی غلامانہ زنجیریں بیسویں صدی کی ہوائے حریت سے کٹ کر گرنے والی ہیں۔ اگر تم نے وقت کے پہلو بہ پہلو قدم اٹھانا

سے پہلوتہی کی اور تعطل کی موجودہ زندگی کو اپنا شعار بنائے رکھا' تو مستقبل کا مورخ لکھے گا کہ تمہارے گروہ نے جو سات کروڑ انسانوں کا ایک غول تھا' ملک کی آزادی کے بارے میں وہ رویہ اختیار کیا' جو صفحۂ ہستی سے محو ہو جانے والی قوموں کا شیوہ ہوا کرتا ہے۔ آج ہندوستان کا جھنڈا اپنے پورے شکوہ سے لہرا رہا ہے۔ یہ وہی جھنڈا ہے جس کی اڑانوں سے حاکمانہ غرور کے دل آزار قہقہے تمسخر کیا کرتے تھے۔"

یہ ٹھیک ہے کہ وقت نے تمہاری خواہشوں کے مطابق انگڑائی نہیں لی' بلکہ اس نے ایک قوم کے پیدائشی حق کے احترام میں کروٹ بدلی۔ اور یہی وہ انقلاب ہے' جس کی ایک کروٹ نے تمہیں بہت حد تک خوفزدہ کر دیا ہے۔ تم خیال کرتے ہو کہ تم سے کوئی اچھی شے چھن گئی ہے اور اس کی جگہ بری شے آگئی ہے۔ ہاں تمہاری بے قراری اس لیے ہے کہ تم نے اپنے تئیں اچھی شے کے لیے تیار نہیں کیا تھا۔ اور بری شے کو ملجا و ماویٰ سمجھ رکھا تھا۔ میری مراد غیر ملکی غلامی سے ہے۔ جس کے ہاتھوں تم نے مدتوں حاکمانہ طمع کا کھلونا بن کر زندگی بسر کی ہے۔ ایک دن تھا کہ جب ہماری قوم کے قدم کسی جنگ کے آغاز کی طرف تھے' اور آج تم اس جنگ کے انجام سے مضطرب ہو' آخر تمہاری اس عجلت پر کیا کہوں؟ کہ ادھر سفر کی جستجو ختم نہیں ہوئی اور ادھر گمرہی کا خطرہ بھی پیش آگیا!

میرے بھائی! میں نے ہمیشہ سیاست کو ذاتیات سے الگ رکھنے کی کوشش کی ہے۔ میں نے اس پرخار وادی میں قدم نہیں رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ میری بہت سی باتیں کنایوں کا پہلو لیے ہوتی ہیں۔ لیکن مجھے آج جو کچھ کہنا ہے' اسے بے روک ہو کر کہنا چاہتا ہوں متحد ہندوستان کا بٹوارہ بنیادی طور پر غلط تھا۔ مذہبی اختلافات کو جس ڈھب سے ہوا دی گئی' اس کا لازمی نتیجہ یہی آثار و مظاہر تھے' جو ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھے اور بدقسمتی سے بعض مقامات میں آج بھی دیکھ رہے ہیں۔

پچھلے سات برس کے روداد دہرانے سے کوئی فائدہ نہیں اور نہ اس سے کوئی اچھا نتیجہ نکل سکتا ہے۔ البتہ ہندوستان کے مسلمانوں پر جو ریلا آیا ہے وہ یقیناً مسلم لیگ کی غلط قیادت کی فاش غلطیوں ہی کا نتیجہ ہے لیکن میرے لیے اس میں کوئی نئی بات

نہیں۔ میں پچھلے دنوں ہی سے ان نتائج پر نظر رکھتا تھا۔

اب ہندوستان کی سیاست کا رخ بدل چکا ہے مسلم لیگ کے لیے یہاں کوئی جگہ نہیں ہے۔ اب یہ ہمارے اپنے دماغوں پر منحصر ہے کہ ہم کسی اچھے انداز فکر میں بھی سوچ سکتے ہیں یا نہیں۔ اسی لیے میں نے نومبر کے دوسرے ہفتہ میں ہندوستان کے مسلمان رہنماؤں کو دہلی بلانے کا قصد کیا ہے۔ دعوت نامے بھیج دیے گئے ہیں۔ ہراس کا موسم عارضی ہے۔ میں تم کو یقین دلاتا ہوں کہ ہم کو ہمارے سوا کوئی زیر نہیں کر سکتا۔ میں نے ہمیشہ کہا اور آج پھر کہتا ہوں کہ تذبذب کا راستہ چھوڑ دو' شک سے ہاتھ اٹھا لو' اور بدعملی کو ترک کر دو۔ یہ تین دھار کا انوکھا خنجر لوہے کی اس دو دھاری تلوار سے زیادہ کاری ہے' جس کے گھاؤ کی کہانیاں میں نے تمہارے نوجوانوں کی زبانی سنی ہے۔

یہ فرار کی زندگی جو تم نے ہجرت کے مقدس نام پر اختیار کی ہے' اس پر غور کرو' اپنے دلوں کو مضبوط بناؤ' اور اپنے دماغوں کو سوچنے کی عادت ڈالو' اور پھر دیکھو کہ تمہارے یہ فیصلے کتنے عاجلانہ ہیں۔ آخر کہاں جا رہے ہو اور کیوں جا رہے ہو؟

یہ دیکھو' مسجد کے بلند مینار تم سے اچک کر سوال کرتے ہیں کہ تم نے اپنی تاریخ کے صفحات کو کہاں گم کر دیا ہے؟ ابھی کل کی بات ہے کہ جمنا کے کنارے تمہارے قافلوں نے وضو کیا تھا۔ اور آج تم ہو کہ تمہیں یہاں رہتے ہوئے خوف محسوس ہوتا ہے۔ حالانکہ دہلی تمہارے خون سے سینچی ہوئی ہے۔

عزیزو! اپنے اندر ایک بنیادی تبدیلی پیدا کرو۔ جس طرح آج سے کچھ عرصے پہلے تمہارا جوش و خروش بیجا تھا' اسی طرح آج یہ تمہارا خوف و ہراس بھی بیجا ہے۔ مسلمان اور بزدلی یا مسلمان اور اشتعال' ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ سچے مسلمانوں کو نہ تو کوئی طمع ہلا سکتی ہے' اور نہ کوئی خوف ڈرا سکتا ہے۔ چند انسانی چہروں کے غائب از نظر ہو جانے سے ڈرو نہیں۔ انہوں نے تمہیں جانے کے لیے اکٹھا کیا تھا۔ آج انہوں نے تمہارے ہاتھ سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا ہے' تو یہ عیب کی بات نہیں۔ یہ دیکھو' تمہارے دل تو ان کے ساتھ ہی رخصت نہیں ہو گئے۔ اگر دل ابھی تک تمہارے پاس ہیں' تو اسے

خدا کی جلوہ گاہ بناؤ' جس نے آج سے تیرہ سو برس پہلے عرب کے ایک امی کی معرفت فرمایا تھا: "جو خدا پر ایمان لائے اور اس پر جم گئے تو پھر ان کے لیے نہ تو کسی طرح کا ڈر ہے اور نہ کوئی غم۔" (2) ہوائیں آتی ہیں اور گزر جاتی ہیں۔ یہ صرصر سہی' لیکن اس کی عمر کچھ زیادہ نہیں۔ ابھی دیکھتے دیکھتے آنکھوں ابتلا کا موسم گزرنے والا ہے۔ یوں بدل جاؤ' جیسے تم پہلے کبھی اس حالت ہی میں نہ تھے۔

میں کلام میں تکرار کا عادی نہیں ہوں' لیکن مجھے تمہاری تغافل کیشی کے پیش نظر بار بار یہ کہنا پڑتا ہے کہ تیسری طاقت اپنی گھمنڈ کا پشتارہ اٹھا کر رخصت ہو چکی ہے۔ جو ہونا تھا' وہ ہو کر رہا۔ سیاسی ذہنیت اپنا پچھلا سانچہ توڑ چکی ہے اور اب نیا سانچہ ڈھل رہا ہے۔ اگر اب بھی تمہارے دلوں کا معاملہ بدلا نہیں' اور دماغوں کی چبھن ختم نہیں ہوئی' تو پھر حالت دوسری ہے لیکن اگر واقعی تمہارے اندر سچی تبدیلی کی خواہش پیدا ہو گئی ہے' تو پھر اس طرح بدلو' جس طرح تاریخ نے اپنے تئیں بدل لیا ہے۔ آج بھی کہ ہم ایک دور انقلاب کو پورا کر چکے ہیں' ہمارے ملک کی تاریخ میں کچھ صفحے خالی ہیں اور ہم ان صفحوں میں زیب عنوان بن سکتے ہیں۔ مگر شرط یہ ہے کہ ہم اس کے لیے تیار بھی ہوں۔

عزیزو! تبدیلیوں کے ساتھ چلو یہ نہ کہو کہ ہم اس تغیر کے لیے تیار نہ تھے' بلکہ اب تیار ہو جاؤ۔ ستارے ٹوٹ گئے' لیکن سورج تو چمک رہا ہے۔ اس سے کرنیں مانگ لو اور ان اندھیری راہوں میں بچھا دو' جہاں اجالے کی سخت ضرورت ہے۔

میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ تم حاکمانہ اقتدار کے مدرسے سے وفاداری کا سرٹیفکیٹ حاصل کرو اور کاسہ لیسی کی وہی زندگی اختیار کرو' جو غیر ملکی حاکموں کے عہد میں تمہارا شعار رہا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ جو اجلے نقش و نگار تمہیں اس ہندوستان میں ماضی کی یادگار کے طور پر نظر آ رہے ہیں' وہ تمہارا ہی قافلہ تھا' انہیں بھلاؤ نہیں۔ انہیں چھوڑو نہیں۔ ان کے وارث بن کر رہو' اور سمجھ لو کہ اگر تم بھاگنے کے لیے تیار نہیں' تو پھر تمہیں کوئی طاقت بھگا نہیں سکتی۔ آؤ عہد کرو کہ یہ ملک ہمارا ہے' ہم اس کے لیے ہیں اور اس کی تقدیر کے بنیادی فیصلے ہماری آواز کے بغیر ادھورے ہی رہیں گے۔

آج زلزلوں سے ڈرتے ہو' کبھی تم خود اک زلزلہ تھے' آج اندھیرے سے کانپتے ہو' کیا یاد نہیں کہ تمہارا وجود ایک اجالا تھا! یہ بادلوں نے میلا پانی برسایا ہے تم نے بھیگ جانے کے خدشے سے اپنے پائینچے چڑھا لیے ہیں۔ وہ تمہارے ہی اسلاف تھے' جو سمندروں میں اتر گئے' پہاڑوں کی چھاتیوں کو روند ڈالا' بجلیاں آئیں' تو ان پر مسکرا دیے۔ بادل گرجے' تو قہقہوں سے جواب دیا۔ صرصر اٹھی' تو اس کا رخ پھیر دیا۔ آندھیاں آئیں' تو ان سے کہا کہ تمہارا راستہ یہ نہیں ہے۔ یہ ایمان کی جان کنی ہے کہ شہنشاہوں کے گریبانوں سے کھیلنے والے' آج خود اپنے گریبانوں سے کھیلنے لگے۔ اور خدا سے اس درجہ غافل ہوگئے کہ جیسے اس پر کبھی ایمان ہی نہیں تھا۔

عزیزو! میرے پاس تمہارے لیے کوئی نیا نسخہ نہیں ہے۔ وہی پرانا نسخہ ہے' جو برسوں پہلے کا ہے۔ وہ نسخہ جس کو کائنات انسانی کا سب سے بڑا محسن لایا تھا۔ وہ نسخہ ہے قرآن کا' یہ اعلان کہ لا تھنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان کنتم مومنین۔ (1)

آج کی صحبت ختم ہوگئی۔ مجھے جو کچھ کہنا تھا' وہ اختصار کے ساتھ کہہ چکا ہوں۔ پھر کہتا ہوں اور بار بار کہتا ہوں: اپنے حواس پر قابو رکھو' اپنے گردوپیش اپنی زندگی خود فراہم کرو۔ یہ منڈی کی چیز نہیں کہ تمہیں خرید کر لادوں۔ یہ تو دل کی دکان ہی میں سے اعمال صالحہ کی نقدی سے دستیاب ہوسکتی ہے۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

15

مہاتما گاندھی کی یادگار

نئی دلی' فروری 1948ء

گاندھی جی کے حادثۂ قتل کے چند ہی روز بعد فروری 1948ء میں کانسٹی ٹیوشن کلب (نئی دلی) میں ایک اجتماع ہوا تھا' جہاں یہ مسئلہ زیر بحث تھا کہ گاندھی جی کی یادگار کس شکل میں قائم کی جائے۔ اس جلسے کی صدارت مولانا آزاد نے فرمائی تھی۔ یہ ان کی صدارتی تقریر ہے۔

آج مہاتما گاندھی کے بعد نہ صرف ہندوستان میں' بلکہ تمام دنیا میں ان کی یادگار مختلف شکلوں میں قائم ہے۔ حال ہی کانگریس ورکنگ کمیٹی نے بھی چھ اصحاب پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی ہے۔ جو مہاتما گاندھی کی ایک ایسی یادگار قائم کرنے کے مسئلے پر غور و فکر کرے گی' جو ان کے پاکیزہ مقصد حیات اور اس کی روح کو دنیا کے سامنے نمایاں کردے۔

اس کے علاوہ دوسرے طریقوں سے بھی ان کی خدمات کے تذکرے اور قلمی یادگاریں' ان کے کارنامے محفوظ کیے جارہے ہیں' تاکہ آنے والی نسلیں جب ان کی زندگی کا مطالعہ کریں' تو ایک روشن حقیقت ان کے سامنے آجائے۔ یہ سب کچھ ہے لیکن میں جب بھی سوچتا ہوں ایک چیز بار بار میرے سامنے آتی ہے' اور وہ یہ کہ اس

طرح جو کچھ بھی کیا جارہا ہے' اس میں مجھے ایک بڑا خانہ خالی نظر آتا ہے' اور اگر اس کو پر نہ کیا گیا' تو ایک بڑی کمی رہ جائے گی۔

آپ کو معلوم ہے کہ مہاتما جی کی زندگی مختلف کاموں میں گزری ہے' لیکن ان جیسی شخصیتیں دنیا میں کبھی کبھی ابھرا کرتی ہیں' جو دنیا کی تمام خودساختہ حدبندیوں سے بالاتر ہوا کرتی ہیں۔

تاریخ انسانی کے ہر دور میں آپ دیکھیں گے کہ انسان نے دنیا میں بہت سی حدبندیاں قائم کی ہیں' جیسے جغرافیائی حد بندی' کہا جاتا ہے: یہ یورپ ہے' یہ ایشیا' یہ عرب ہے' یہ ہندوستان وغیرہ' مذہبی حد بندی' ہم کہتے ہیں: یہ مسلمان ہے' یہ عیسائی' یہ ہندو' یہ سکھ وغیرہ۔

قومی حد بندی' کہا جاتا ہے: یہ انگریز ہے' یہ اٹالین' یہ ہندی وغیرہ۔

لسانی حد بندی' کہا جائے گا: یہ فلاں زبان کا بولنے والا ہے اور یہ فلاں زبان کا وغیرہ' ایسے ہی رنگ و نسل کی حد بندی وغیرہ۔

یہ تمام حد بندیاں ہماری زندگی کی قدرتی ضروریات ہیں' لیکن جب تک یہ تعمیری دائرہ میں رہتی ہیں' ہمارے لیے ایک بڑا سہارا بنتی ہیں' اور جب یہ تخریبی رنگ اختیار کر لیتی ہیں تو گروہ انسانی کو تباہ کر دینے والی اور مٹا دینے والی بن جایا کرتی ہیں۔

دنیا کی پوری تاریخ میں' جب بھی ان حد بندیوں کا غلط استعمال ہونے لگتا ہے' تو وہی مقاصد جو ان کے سہارے چمکتے تھے' خاک میں مل جاتے ہیں۔

مثال کے طور پر مذہب کی حد بندی کو لیجیے۔ سب جانتے ہیں کہ مذہب دنیا کی اصلاح کے لیے آیا ہے۔ اور صلح و آشتی' امن و انصاف وغیرہ ایسی چیزیں ہیں' جن کو ہر مذہب بنیادی طور پر صحیح مانتا ہے لیکن یہی مذہبی حد بندی جب تخریبی جامہ پہن لیتی ہے' تو ہزاروں خوں ریزیوں کا باعث بن جاتی ہے۔ دنیا کی تاریخ میں ہزاروں کشت و خون ہیں' جو اسی مذہب کے نام پر ہوئے ہیں۔

اپنے ہی ماحول کو دیکھیے۔ آج ہمارے چاروں طرف جو کچھ ہو چکا ہے' وہ خدا کا نام لے کر ہی کیا گیا ہے۔ ایسے ہی جغرافیائی حد بندی کو لیجیے۔ قرآن کی بولی میں یہ

بندشیں اس لیے تھیں کہ لتعارفوا (1) تم میں باہم پہچان پیدا ہو۔ لیکن یہی حد بندی جب تباہی کی شکل میں آتی ہے تو دنیا میں بڑی بربادیوں کا باعث بن جاتی ہے۔

یہی حال قومی حد بندی کا ہے۔ اس کا مقصد بھی وہی لتعارفوا ہے۔ یعنی آپس کی پہچان کا ذریعہ! لیکن یہی قومیت کی حد بندی' جو ایک ذریعہ پہچان کا تھی' جب اپنی حدوں سے گزر جاتی ہے' تو دنیا میں بڑی خوں ریزیاں اسی قومی حرص و طمع اور غرور و گھمنڈ کے نتیجے میں ہوتی ہیں۔

غرض کہ دنیا میں بہت سی حد بندیاں ہیں جو ہماری زندگی پر چھا گئی ہیں اور ہم ان میں ایسے بندھ گئے ہیں کہ اگرچہ ہم میں بڑی سے بڑی روح بڑائی کی بڑی سے بڑی جگہ پیدا کر سکتی ہے۔ لیکن ان حدود کے اندر ہی اندر رہ کر' ان سے آگے قدم رکھنے کی ان میں جرات ہی پیدا نہیں ہو سکتی۔ لیکن جس طرح نیچر ایک خاص ڈھنگ پر چلتا ہے' لیکن کبھی کبھی اپنا رنگ چھوڑ دیتا ہے' ایسے ہی ہم دیکھتے ہیں کہ تاریخ کے افق پر کبھی کبھی ایسی شخصیتیں ابھرتی ہیں کہ دنیا کی کوئی حد بندی بھی انہیں بڑائی تک پہنچنے سے نہیں روک سکتی۔ مذہب کی حد بندی ان کی آنکھوں کو بند نہیں کر سکتی۔ قومیت کی حد بندی ان کے پاؤں کی زنجیر نہیں بن سکتی۔ وطنیت کی حد بندی ان کے ہاتھوں کو پکڑ نہیں سکتی۔ وہ ان تمام حدود سے بہت اونچے اور بلند ہوتے ہیں۔

جب یہ شخصیتیں ان بندشوں کی حدود سے بالاتر ہو جاتی ہیں' تب آپ دیکھیں گے کہ ان کی آنکھوں میں سچائی' کا نور پیدا ہو جاتا ہے۔ ان کی نگاہ میں تعصب کا ایک شمہ نہیں رہتا۔ ان کی نظر ہر طرف اور ہر گوشے پر یکساں پڑتی ہے۔ دنیا کا تمام اچھا برا ان کے سامنے ہوتا ہے۔ وہ سب کو ایک ہی نور سے دیکھتے اور پہچانتے ہیں۔ انہیں جہاں کہیں حسن نظر آتا ہے' وہ دوڑتے ہیں کہ یہ تو ہمارے لیے ہے۔ انہیں جس طرف خوبی نظر آتی ہے' وہ اس کو اپناتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ یہ ہمارا حق ہے۔ لیکن آپ یاد رکھیے' تاریخ میں ایسی ہستیاں بہت ہی کم ہوا کرتی ہیں۔

مہاتما جی کی ہستی تاریخ عالم کی ان ہی ہستیوں میں سے ایک تھی۔ وہ دنیا کی ان تمام حد بندیوں سے بلند تر تھے اور ان کی نگاہ میں ہر قوم اور ہر وطن' ہر نسل اور ہر

گروہ ایک ہی حیثیت رکھتا تھا اور وہ ہر ایک کی خوبیوں کو اپناتے اور پسند کرتے تھے۔

جہاں تک میری یادداشت کام کرتی ہے' مجھے ان کا تعارف سب سے پہلے 1908ء میں ہوا۔ جب کہ والد مرحوم نے انتقال فرمایا۔ بمبئی' ٹرانسوال وغیرہ میں والد مرحوم نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ اور ان اطراف میں ان کے بہت سے مریدین و معتقدین تھے۔ ان دنوں گاندھی جی ان اطراف کے حالات سے دلچسپی لے رہے تھے اور ٹرانسوال کانگریس کے پروگراموں میں سرگرم عمل تھے۔ اس وقت مجھے ایک ٹیلی گرام ملا۔ جس کے نیچے گاندھی جی کے دستخط تھے۔ انہوں نے اس ٹیلی گرام میں والد مرحوم کی تعزیت کی تھی۔ اسکے بعد 1918ء تک مجھے ان سے خط و کتابت یا زیارت و ملاقات کا موقع نہ ملا۔ 1918ء میں جب میں رانچی جیل میں نظربند تھا' ان دنوں گاندھی جی بہار کے دورے کے لیے آئے اور انہوں نے ایک شخص کے ذریعہ مجھے جیل میں پیغام بھیجا کہ میں بہار آیا ہوا ہوں' اور تم سے ملنا چاہتا ہوں۔ مگر گورنر بہار نے مجھے اس کی اجازت نہیں دی۔ اس کے بعد جب میں رانچی جیل سے رہا ہوا اور ایک جلسہ میں شرکت کے لیے 1920ء کی 20 جنوری کو دہلی آیا' تو حکیم اجمل خان صاحب مرحوم کے مکان پر سب سے پہلے مجھے گاندھی جی سے نیاز حاصل ہوا۔ اس دن سے آج تک جب کہ 1948ء ہے' 28 برس گزر چکے ہیں۔ 28 برس کے یہ دن ہم پر ایسے گزرے ہیں کہ گویا ہم ایک ہی چھت کے نیچے رہے۔

اس عرصے میں بسااوقات ان سے اختلافات بھی ہوئے۔ چنانچہ اس لڑائی کے زمانے میں میرا اور ان کا جو اختلاف ہوا تھا' اس سے آپ بھی واقف ہوں گے۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی میں میری یہ قطعی رائے تھی' جس پر ممبران کی اکثریت کو اتفاق تھا۔ اگر برطانیہ یہ مان لے کہ جنگ کے بعد ہندوستان کو آزادی دے دی جائے گی' تو ہم لڑائی میں شریک ہوسکتے ہیں۔ ان کو اس سے سخت اختلاف تھا' وہ بالکل دوسری جانب جارہے تھے۔ وہ کہتے تھے' ہم ایسی آزادی لینا ہی نہیں چاہتے' جو لڑائی کے سایہ میں ہمکو ملے۔ اس لیے وہ کسی طرح بھی لڑائی میں شرکت کے لیے تیار نہ تھے۔

آپ کو یہ معلوم ہے کہ کانگریس ورکنگ کمیٹی کی تجویز کا ڈرافٹ گاندھی جی ہی

بنایا کرتے تھے۔ چنانچہ اس مرتبہ بھی اپنے اس ریزولیوشن کا ڈرافٹ بنوانے کے لیے میں اور پنڈت نہرو' گاندھی جی کے پاس گئے اور انہوں نے اپنے پورے اختلاف کے باوجود اس تجویز کا ڈرافٹ بنا دیا۔

غرض اس طویل مدت میں بہت سے موقعے آئے' کہ ہم میں اور ان میں اختلاف ہوا اور کشاکش تک نوبت پہنچی۔ انہوں نے اور ہم نے' دونوں ہی نے اپنی اپنی جگہ اسکو محسوس بھی کیا۔ لیکن اس پوری زندگی میں کوئی ایسا وقت نہیں آیا کہ ہمارے دلوں کا رخ پھر گیا ہو۔ ایسے ایسے اختلافوں کے باوجود ان کی عظمت کی جو رسی ہماری گردنوں میں پڑی ہوئی تھی' ہم کبھی اس سے باہر نہ ہو سکے۔

اس موقعے پر آپ سے یہ کہہ دوں کہ میری طبیعت میں ایک طرح کا نقص اور خامی ہے وہ یہ کہ جب تک کسی کی کوئی خصوصیت میرے سامنے نہ آجائے' جو میرے دماغ پر چھا جائے اور میری گردن کو دبا لے' اس وقت تک وہ مجھے اپنے سامنے جھکا نہیں سکتا۔ "میری گردن کی رگیں سخت ہیں۔" میرے سامنے جب کوئی دماغ آتا ہے' تو پہلے میرا ذہن اس کے خلاف ہی جانا چاہتا ہے' یہاں تک کہ وہ میرے ذہن کو اپنی مضبوط گرفت میں لے لے۔ چنانچہ جب میں پہلی دفعہ مہاتما جی سے ملا' اس وقت میں ان کا معتقد نہیں تھا۔ میری آنکھوں پر اعتقاد کی پٹی نہ تھی' جو انسان کی آنکھوں کو بند کر دیا کرتی ہے۔ لیکن اس کے بعد ان کی ہر ہر چیز نے ان کی عظمت کو میرے دل میں راسخ کر دیا۔ اور جو دن گزرا میرا اعتقاد ان کے بارے میں' بڑھتا ہی چلا گیا۔ ہم دو آدمیوں کو ان سے انتہائی قرب تھا اور ہمیں بہت طویل موقع ملا۔ وہ ایک کھلی ہوئی کتاب تھے' جس کا ہر ورق کھلا ہوا' ہر سطر روشن' اور ہر لفظ دھلا ہوا اور ہر حرف چمکتا ہوا تھا۔

آج تمام دنیا میں شاید ان ہی کی زندگی ایسی تھی' جس کا ایک حرف بھی چھپا ہوا نہ تھا۔ یہ انسانیت کی عظمت کے لیے سب سے بڑی کسوٹی ہے اور اس معیار پر اترنے والے تمام تاریخ انسانی میں صرف چند انسان ہوئے ہیں جنہیں آپ اپنی انگلیوں پر گن سکتے ہیں۔

جن کو تمام دنیا کی حد بندیوں نے الجھانے کی کوشش کی' لیکن وہ الجھ نہ سکے۔ تمام بندشوں نے ان کا دامن پکڑنا چاہا' مگر وہ گرفت میں نہ آسکے۔ میرے نزدیک گاندھی جی کی سب سے بڑی عظمت یہی ہے۔

یہ نہ تھا کہ مہاتما جی ہندو نہ تھے۔ وہ بے شک ہندو تھے۔ لیکن انہوں نے ہندو مذہب و دماغ کی ایک نئی تعبیر کی تھی اور ایک نیا زاویہ بنایا تھا' جو تمام حد بندیوں پر چھا گیا تھا اور وہ ایک ایسی جگہ بن گئی کہ نہ وہاں جغرافیہ اور قومیت کی لکیریں چل سکتی ہیں' نہ اور دوسری حد بندیوں کی دیواریں قائم رہ سکتی ہیں۔ یہ وہ بلندی ہے کہ اگر ہمارا دماغ وہاں تک پہنچ سکے تو اس سے بڑی کوئی خوبی نہیں ہے۔

ہندو مذہب کا پرانا دماغ اور نقشہ جو ہمارے سامنے آتا ہے' اس میں بہت زیادہ وسعتیں تھیں' اور جہاں تک میرا مطالعہ ہے' دنیا کے تمام مذاہب میں نظریہ توحید کو جس مذہب نے سب سے زیادہ قریب سے دیکھا ہے' وہ ہندو مذہب ہے۔ میرے پاس اس کے بہت سے تاریخی شواہد و نظائر موجود ہیں۔ لیکن آج ہندو دھرم کی وہ شکل باقی نہیں ہے اور اس کے بہت سے خانے خالی ہو چکے ہیں۔ ہندو مذہب نے ابتدائی دور میں یونانیوں کو وہ درجہ دیا تھا' جو ایک برہمن کا ہوتا ہے۔ صرف اس لئے کہ یونان علم دوست ملک تھا۔ لیکن دوسری جگہ یہ ہے کہ ہندو دماغ گرنے لگا۔ چھوت چھات اور تنگ دماغ پیدا ہوگیا۔ تب ہی سے ہندو دھرم اپنی بلند سطح سے گر گیا۔

گاندھی جی ہندو تھے اور ہندو ہی رہے۔ لیکن انہوں نے ہندو دھرم کی اتنی اونچی جگہ بنائی تھی کہ جب وہ اس بلندی پر سے دیکھتے تھے تو دنیا کے تمام جھگڑے ان کو مٹے ہوئے نظر آتے تھے۔ ان کے سامنے ایک کھلی ہوئی سچائی تھی جو کسی ایک کا ورثہ نہیں ہے' بلکہ سورج اور اس کی شعاعوں کی طرح سب کے لیے ہے۔

پس ہمیں گاندھی جی کی عظمت ان ادنیٰ درجے کی چیزوں میں نہیں ڈھونڈھنی چاہیے' بلکہ پردہ اٹھا کر دیکھنا چاہیے۔ تب حقیقت کا چہرہ صاف نظر آئے گا۔ وہ اتنی بلندی پر تھے کہ دنیا کی کوئی حد بندی ان کا راستہ روک نہیں سکی۔

آج ہم ان کی کوئی بھی یادگار بنائیں' وہ نامکمل ہوگی۔ جب تک کہ وہ ان کی اس

سربلندی کو ظاہر نہ کرے۔ اس لیے مجھے آپ سے یہ کہنا ہے کہ گاندھی جی کی یادگار اس شکل میں ہونی چاہیے۔ جو مہاتما جی کی اس سربلندی کو ظاہر کرے۔ آنے والی نسلوں کو اپنی خاموش زبان سے بتا دے کہ مہاتما جی کا مشن اور مقصد حیات یہ تھا' جو دنیا بھر کے زائرین کو اپنی زبان حال سے گاندھی جی کی عظمت و بلندی کی تاریخ بتا سکے۔

آپ کتنی ہی یادگاریں بنا لیں۔ لیکن وہ بیکار ہیں' جب تک کہ ان کی انگلی اس عالمگیر سچائی کی طرف نہ اٹھے' جو گاندھی جی کے پیش نظر تھی۔

حواشی از مرتب

حواشی

1- انجمن اسلامی، کلکتہ

حوالہ نمبر: 1　سورۂ آل عمران 3 : 26 (یا اللہ، اے سلطنت کے مالک! تو سلطنت دیتا ہے، جسے چاہتا ہے، اور سلطنت چھین لیتا ہے، جس سے چاہتا ہے۔ اور عزت بخشتا ہے، جسے چاہتا ہے، اور ذلیل بنا دیتا ہے، جسے چاہتا ہے، تیرے ہی ہاتھ میں سب خوبی ہے، بیشک تو ہر چیز پر قادر ہے)

حوالہ نمبر: 2　قرآن میں ہے (النحل 16: 98) "جب تو قرآن پڑھے، تو شیطان مردود سے (اپنے) خدا کی پناہ مانگ" اسی لیے تلاوت کے وقت کہا جاتا ہے: اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم (میں مردود شیطان سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں)

حوالہ نمبر: 3　الفاطر 35 : 15 (اے لوگو! تم اللہ کے محتاج ہو اور وہ سب تعریفوں کے لائق بے نیاز ہے۔ اگر وہ چاہے، تو تمہیں مٹا دے اور (تمہاری جگہ) ایک نئی خلقت لے آئے، اور یہ بات اللہ کے لیے کچھ مشکل نہیں)

حوالہ نمبر: 4　نظیری نیشا پوری کا شعر ہے (دیوان نظیری نیشا پوری : 308) مطبوعہ دیوان میں مصرع ثانی یوں ہے: حرفے ز حال خویش بسیما نوشتہ ایم

حوالہ نمبر: 5　مقابلہ کیجئے: عہد نامہ جدید (انجیل) متی 5:11 نیز لوقا 7 : 22

حوالہ نمبر: 6　سورۂ نوح 71 : 16

حوالہ نمبر : 7　یہاں اشارہ ہے تورات کی کتاب استثناء کی مندرجہ ذیل آیات کی طرف:

اور مرد خدا موسیٰ نے جو دعائے خیر دے کر اپنی وفات سے پہلے بنی اسرائیل کو برکت دی، وہ یہ ہے۔ اور اس نے کہا: خداوند سینا سے آیا اور سعیر سے ان پر آشکار ہوا۔ وہ کوہ فاران سے جلوہ گر ہوا اور لاکھوں قدسیوں میں سے آیا۔ اس کے دہنے ہاتھ پر ان کے لیے آتشی شریعت تھی (33 : 201)

حوالہ نمبر: 8　الحجرات 49: 13

حوالہ نمبر : 9　الروم 30: 22 (اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے آسمان اور زمین اور تمہاری مختلف زبانیں اور رنگ پیدا کیے)

حوالہ نمبر: 10　سورۂ المومنون 23 : 52

حوالہ نمبر : 11　بو قیس - مکے کے نواح میں ایک چھوٹی سی پہاڑی ہے۔ اس کا یہ نام یوں پڑا کہ قبیلہ جرہم کا ایک شخص قیس بن شالخ اس پر گیا تھا اور وہ وہیں ہلاک ہوگیا۔

حوالہ نمبر: 12　سورۂ آل عمران 3 : 103

حوالہ نمبر : 13　مسلم (کتاب البر : 66) کے علاوہ یہ حدیث بخاری میں بھی ہے (کتاب الادب : 37) بلکہ مسند احمد بن حنبل میں مجھے ملی ہی نہیں۔ صحیحین میں کچھ خفیف سا لفظی اختلاف ہے۔

حوالہ نمبر : 14　بخاری (کتاب العلوۃ : 88، کتاب الادب : 36، کتاب المظالم : 5)، مسلم (کتاب البر : 65)　صحیحین کے علاوہ یہ حدیث نسائی (کتاب الزکاۃ : 67) ترمذی (کتاب البر: 18) اور مسند احمد بن حنبل کے متعدد مقامات پر بھی ہے۔

حوالہ نمبر: 15　الفتح 48 : 29

حوالہ نمبر : 16 اے (مسلمانو! عبرت پکڑو اور ان لوگوں کے سے نہ ہو جنھوں نے کہا: ہم نے سن لیا' حال آنکہ وہ نہیں سنتے)۔ اس عبارت کا پہلا ٹکڑا فاعتبروا یا ایھا المسلمون) خود مولانا آزاد کا ہے' دوسرا ٹکڑا (ولا تکونوا ..... یسمعون) قرآن سے ہے۔ (الانفال 8 : 12)

حوالہ نمبر : 17 الحاقہ 69 : 31 (اسے پکڑو' پھر اس کے طوق پہنا دو۔ پھر اسے آگ کی بھٹی میں جھونک دو)

حوالہ نمبر: 18 پس جو جواب ان کا' وہی جواب ہمارا۔

حوالہ نمبر : 19 اسکندر اعظم مقدونی۔ ولادت 355 ق م۔ یونان سے ہندوستان تک کا تمام علاقہ اس نے فتح کیا۔ وہ پنجاب میں دریائے بیاس تک پہنچ گیا تھا۔ یہاں سے واپسی پر بابل (عراق) میں کثرت شراب نوشی (یا شاید زہر سے) 323 ق م میں وفات ہوئی۔ صرف 32 سال کی عمر پائی۔ بیشک' دنیا کے عظیم ترین فاتحوں میں سے تھا۔

حوالہ نمبر : 20 ہنی بال۔ قرطاجنہ (شمالی افریقا) کا مشہور جرنیل۔ رومنوں کا جانی دشمن تھا۔ اس نے ہاتھیوں کے ساتھ کوہ الپس کو پار کرکے اٹلی پر حملہ کر دیا اور رومن فوج کو ایک خونریز جنگ میں شکست فاش دی۔ لیکن اسے واپس قرطاجنہ جانا پڑا۔ اور اب رومنوں نے حملہ کیا' جس میں اسے شکست ہوئی اور وہ بھاگ کر شرق اوسط چلا آیا۔ اس نے زہر سے خودکشی کی (182 ق م) غالباً اس وقت 70 سال کی عمر تھی۔

حوالہ نمبر : 21 مرض کی پیش بندی' اس کے لاحق ہو جانے کے بعد علاج سے' بہتر ہے۔

حوالہ نمبر : 22 ویمبری' اس کا اصلی نام ہرمن .بمبرجر تھا' لیکن مشہور آرمن ویمبری کے نام سے ہوا۔ دریائے ڈینیوب (ہنگری) کے وسط میں ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے' شوت' یہ وہیں 19 مارچ 1832ء کو پیدا ہوا۔ اس کی سیاح' مستشرق اور مورخ کی حیثیت سے بہت شہرت ہے'

1905ء تک بوڈاپسٹ یونیورسٹی میں پروفیسر تھا۔ مدتوں قسطنطنیہ میں مقیم رہا۔ اس نے ایران' وسط ایشیا' افغانستان کی سیاحت کی' اور ان ممالک سے متعلق اس کے سفرنامے چھپ چکے ہیں۔ اس کی جرمن ترکی لغات اور ترکی تاتاری لغات آج بھی مستند مانی جاتی ہیں' حال آنکہ انہیں چھپے نوے برس سے اوپر ہو چکے ہیں۔ 15 ستمبر 1913ء کو بوڈاپسٹ (ہنگری) میں انتقال ہوا۔

حوالہ نمبر : 23 وجودک ذنب لایقاس بہ ذنب قائل کا نام معلوم نہیں ہو سکا

حوالہ نمبر : 24 ، انجیل لوقا' 19 : 27- حضرت عیسیٰ کے ٹھیک الفاظ یہ ہیں :

مگر میرے ان دشمنوں کو' جنہوں نے نہیں چاہا تھا کہ میں ان پر بادشاہی کروں' یہاں لاکر میرے سامنے قتل کرو۔

حوالہ نمبر : 25 سورۃ التوبہ 30:9 (یہ ان کے منہ کی باتیں ہیں' ان کی ریس میں جنہوں نے پہلے کفر کا ارتکاب کیا۔ خدا انہیں ہلاک کرے' یہ کہاں پھرے جا رہے ہیں۔)

حوالہ نمبر: 26 سورۃ الاعراف 176:7

حوالہ نمبر: 27 سورۃ آل عمران 103:3

حوالہ نمبر : 28 کمثل ھذا یذوب القلب من کمد ان کان فی قلب اسلام و ایمان نونیہ ابی البقاء کا شعر ہے۔ مصنف ابوالبقا صالح بن شریف الرندی ہیں۔

حوالہ نمبر : 29 سورۃ المائدہ 3:5 (آج میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کی تکمیل کر دی' اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی' اور تمہارے لیے اسلام پسند کیا)

حوالہ نمبر : 30 سورۃ البقرہ 16:2 (یہی وہ لوگ ہیں' جنہوں نے ہدایت

کے بدلے گمراہی خریدی۔ ان کی یہ تجارت سودمند ثابت نہ ہوئی' اور نہ انھیں ہدایت حاصل ہوئی۔

حوالہ نمبر: 31　پورا شعر ہے: السیف اصدق انباء من الکتب فی حدہ الحد بین الحد واللعب اور یہ ابو تمام کے اس قصیدے میں ہے' جو اس نے معتصم باللہ محمد بن ہارون الرشید کی مدح میں کہا تھا۔ (دیوان: 45' محاضرۃ الابرار و مسامرۃ الاخیار 2: 108)

حوالہ نمبر: 32　الحدید 25:57

حوالہ نمبر: 33　عبدۃ بن الطیب کا شعر ہے' جو اس نے قیس بن عاصم المنقری کی وفات (تقریباً 20ھ) پر لکھا تھا۔ (امالی المرتضیٰ' 1 : 114 المستطرف: 76' زہر الاداب' 104:4' البیان والتبیین' 353:2' العقد الفرید' 386:3 وغیرہ)

حوالہ نمبر: 34　اور وہ (شیطان) ان کے دلوں کو جس طرح چاہتا ہے' پھیر دیتا ہے۔

حوالہ نمبر: 35　سورۃ ابراہیم 14 : 3 (جو لوگ دنیا کی زندگی کو آخرت کے مقابلے میں ترجیح دیتے ہیں' اور (لوگوں کو) اللہ کی راہ سے روکتے ہیں اور اس میں کجی کے خواہشمند ہیں' وہ بہت دور تک گمراہ ہوگئے ہیں)

حوالہ نمبر: 36　سورۃ الاحزاب 33 : 57

حوالہ نمبر: 37　سورۃ البقرہ 2 : 14

حوالہ نمبر: 38　سورۃ البقرہ' 2 : 15 (اللہ ان سے ہنسی کرتا ہے اور ان کی سرکشی میں اضافہ کرتا ہے' وہ عقل کے اندھے ہیں)

حوالہ نمبر: 39　سورۃ محمد 47 : 31 (اور ہم تمہارا امتحان لیں گے' حتیٰ کہ ہمیں معلوم ہو جائے کہ تم میں سے کون مجاہد ہے اور کون صبر کرنے والا)

حوالہ نمبر: 40　سورۃ آل عمران 3 : 106-107

حوالہ نمبر: 41 سورۃ فاطر 35 : 15-17

حوالہ نمبر: 42 المائدہ 5 : 54

حوالہ نمبر : 44 الصافات 37 : 103-105۔ آخری آیت کے معنی متن میں نہیں آئے، یہ ہیں: ہم نیکی کرنے والوں کو اس طرح انعام دیتے ہیں۔

2- افتتاح مدرسہ اسلامیہ، کلکتہ

حوالہ نمبر : 1 تحریک خلافت اور ترک موالات کا ایک شاخسانہ یہ بھی تھا کہ سرکاری مدارس کا بائیکاٹ کیا جائے۔ جو طلبہ وہاں سے نکلے، ان کے پڑھنے کا انتظام نئے مدارس قائم کرکے کیا گیا تھا۔ اسی طرح کا ایک مدرسہ جامع مسجد (مسجد ناخدا) کلکتہ میں مولانا آزاد نے اپنی نگرانی میں جاری کیا تھا۔ اس میں بیشتر طلبہ مدرسہ عالیہ، کلکتہ کے تھے، جو مولانا آزاد کی ترغیب پر وہاں سے نکل آئے تھے۔

اس مدرسے کا افتتاح مہاتما گاندھی نے 13 دسمبر 1920ء کو کیا تھا۔ اسی موقع پر مولانا آزاد نے یہ تقریر مہاتما جی کو مخاطب کرکے کی تھی۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے، ذکر آزاد، عبدالرزاق ملیح آبادی: 55-56)

3- خطبہ صدارت مجلس خلافت، آگرہ

حوالہ نمبر: 1 سورۃ الممتحنہ کے اصلی الفاظ یہ ہیں:

لا ینھکم اللہ عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین ولم یخرجوکم من دیارکم ان تبروھم و تقسطوا الیھم ان تحب المقسطین۔

متن میں آخری ٹکڑے کے معنی بیان نہیں ہوئے ہیں۔ یہ ہیں: بیشک اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

حوالہ نمبر : 2 الہلال کا پہلا شمارہ 13 جولائی 1912ء کو نکلا تھا۔ لیکن ہندو مسلم تعاون اور اتحاد پر انہوں نے اور کئی جگہ بھی لکھا ہے۔

حوالہ نمبر : 3 سیرۃ النبویہ لابن ہشام، 2 : 147 (بسم اللہ الرحمٰن

الرحیم) ھذا کتاب من محمد النبی صلی اللہ علیہ وسلم' بین المومنین والمسلمین من قریش و یثرب ومن تبعھم' فلحق بھم' وجاھد معھم انھم امنہ واحدۃ من دون الناس ۔۔۔ الخ)

اس معاہدے کے مکمل ترجمے کے لیے دیکھئے' عہد نبوی میں نظام حکمرانی از محمد حمید اللہ (ص 102 - 111)

حوالہ نمبر : 4	سورۃ العصر 103 : 1-3 (قسم ہے عصر کی کہ انسان یقیناً خسارے میں ہے۔ بجز ان لوگوں کے جو ایمان لائیں' اور نیک کام کریں اور آپس میں ایک دوسرے کو نیکی کی تاکید کرتے رہیں' اور باہم صبرو تحمل پر عمل کریں۔

4- خطبہ اختتامیہ' مجلس خلافت' آگرہ

حوالہ نمبر : 1	مولانا محمد علی' ولادت : رامپور 10 دسمبر 1878ء وفات : لندن' 4 جنوری 1931ء مختصر حالات کے لیے دیکھئے تذکرہ (حواشی) 344 (ساہیہ اکاڈمی ایڈیشن)

حوالہ نمبر : 2	مولانا شوکت علی' ولادت : رامپور 1873ء' وفات : دلی 27 نومبر 1938ء مختصر حالات کے لیے دیکھئے ماخذ سابق الذکر۔

حوالہ نمبر : 3	حسین احمد مدنی۔ 1879ء میں پیدا ہوئے۔ دیوبند میں تعلیم پائی۔ لیکن ابھی اس کی تکمیل نہیں ہوئی تھی کہ اپنے اہل و عیال کے ساتھ ان کے والد 1316ھ (1889ء - 1890ء) میں ہجرت کرکے مکہ چلے گئے۔ سولہ برس تک خاندان حجاز میں مقیم رہا۔ مولانا حسین احمد اگرچہ اس دوران میں کبھی کبھی ہندوستان آئے' لیکن ان کا بیشتر زمانہ مدینہ میں بسر ہوا' اسی لیے ان کے علم کے ساتھ مدنی کی نسبت ملتی ہے۔ 1916ء میں ان کے استاد شیخ الہند مولانا محمودالحسن مکہ پہنچے تو مولانا حسین احمد ان کے ہمنوا ہوگئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ بھی ان کے

ساتھ مالٹا جلا وطن کر دیے گئے۔ 1920ء میں رہائی پر ہندوستان آئے اور تحریک خلافت اور ترک موالات کی سرگرمیوں میں کود پڑے۔ مولانا ابوالکلام نے دسمبر 1920ء میں جو مدرسہ کلکتہ میں جاری کیا تھا' اسکے صدر مدرس مولانا مدنی ہی تھے۔ کلکتے کے بعد وہ سلہٹ گئے' جہاں چھ برس تک حدیث کا درس دیتے رہے۔ 1928ء میں انھیں دارالعلوم دیوبند کا صدر مدرس منتخب کیا گیا۔ وہ یہاں 30 برس رہے۔ جمعہ 6 دسمبر 1957ء (13 جمادی الاول' 1377ھ) کو انتقال ہوا۔ (تذکرہ مشائخ دیوبند)

حوالہ نمبر : 4 ڈاکٹر کچلو - سیف الدین نام تھا۔ 15 جنوری 1886ء کو امرتسر میں پیدا ہوئے۔ یہاں تعلیم کے بعد انگلستان گئے اور کیمبرج یونیورسٹی سے بی اے کی سند لی' پھر بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔ 1912ء میں برلن یونیورسٹی (جرمنی) سے پی ایچ ڈی کی سند لی۔ 1913ء میں ہندوستان واپس آئے' اور قومی تحریک میں شامل ہوگئے۔ پہلی مرتبہ 1919ء میں جلیانوالہ (امرتسر) کے المناک سانحہ سے کچھ بعد گرفتار ہوئے۔ اس کے بعد کئی مرتبہ قید و بند کی سزا ہوئی۔ مجموعی طور پر 14 برس جیل خانے میں کاٹے۔ دسمبر 1929ء میں کانگریس کا جو اجلاس پنڈت جواہرلال نہرو کی صدارت میں لاہور میں ہوا تھا۔ ڈاکٹر کچلو اس کی مجلس استقبالیہ کے صدر تھے۔ انہوں نے مسلم لیگ اور خلافت تحریک میں بھی سرگرم حصہ لیا تھا۔ آخری زمانے میں ان کا رجحان بائیں بازو کی سیاست کی طرف ہوگیا تھا۔ چنانچہ وہ آٹھ سال تک "پیس کونسل" کے صدر رہے۔ وہ پہلے ہندوستانی تھے' جنھیں 1954ء میں "لینن پرائز" ملا۔ بدھ کے دن 9 اکتوبر 1963ء کو نئی دلی میں انتقال ہوا۔ اسی دن جامعہ ملیہ اسلامیہ' جامعہ نگر' نئی دلی کے قبرستان میں سپرد خاک ہوئے۔

حوالہ نمبر : 5 پیر غلام مجدد : مٹیاری' سندھ کے رہنے والے اور وہاں

کے سجادہ نشین تھے۔

حوالہ نمبر : 6 مولانا نثار احمد۔ کانپور کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد مولوی احمد حسن بریلوی مسلک کے یعنی مولانا احمد رضا خان کے مریدوں میں تھے۔ انہوں نے مثنوی مولانا روم کا ایک خاص ایڈیشن چھ جلدوں میں کانپور سے شائع کیا تھا۔

حوالہ نمبر : 7 جگت گورو شنکر اچاریہ۔ ان کا اصلی نام وینکٹ رامن تھا' شاردا پیٹھ کے جگت گورو نے 4 جولائی 1916ء کو انہیں اپنا جانشین مقرر کیا اور 27 فروری 1921ء کو جسدن میں نہیں گدی پر بٹھا کر خود صحت کی بنا پر دست بردار ہو گئے۔ وہ اس مقدمے میں بے گناہ قرار پائے۔

حوالہ نمبر : 8 مولانا احمد سعید دہلوی' دسمبر 1888ء (ربیع الثانی 1306ھ) میں دلی میں پیدا ہوئے۔ خاندان کے کشمیری تھے۔ ان کے والد حافظ نواب مرزا زینت المساجد کے پیش امام تھے' اور مکتب بھی پڑھاتے تھے۔ احمد سعید کے بچپن میں ان کی تعلیم کی طرف کوئی توجہ نہیں ہوئی۔ قرآن تو ضرور حفظ کر لیا تھا' لیکن اس سے آگے کوئی ترقی نہیں کی۔ البتہ مولویوں کے وعظ سنتے سنتے خود تقریر کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ چونکہ طرار اور ذہین تھے' بہت جلد چل نکلے اور تقریریں اور وعظ کرنے لگے۔ 22 برس کی عمر ہوگی کہ 1910ء میں مفتی کفایت اللہ مرحوم کی نظر ان پر پڑی اور انہوں نے اپنی نگرانی میں ان کی تعلیم کا سلسلہ قائم کیا اور چند سال میں فارغ التحصیل کر دیا۔
اب یہ اصحاب علم کی طرح مذہبی مناظروں میں حصہ لینے لگے۔ ان میں مفتی کفایت اللہ مرحوم ان کے معاون ہوا کرتے تھے۔ جب 1919ء میں جمعیتہ العلمائے ہند قائم ہوئی' تو مفتی صاحب اس کے صدر اور یہ ناظم مقرر ہوئے۔ اس سلسلے میں سیاسی تحریک میں حصہ لیا اور قید و بند

تک نوبت پہنچی اور متعدد مرتبہ جیل گئے۔
تقریر کے میدان میں بہت کم لوگ ان کے حریف تھے۔ اسی مہارت اور خطابت کے باعث اصحاب علم نے انہیں "سحبان الہند" کا لقب عطا کیا تھا۔ صاحب تصنیف و تالیف بھی تھے۔ ان کی کتابوں کی فہرست لمبی ہے، لیکن سب سے اہم ترجمہ' قرآن ہے' جو دلی کی صاف ستھری' نکھری زبان کا اچھا نمونہ ہے۔

4 دسمبر 1959ء (3 جمادی الثانی 1379ھ) بروز جمعہ مغرب کے بعد حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال ہوا۔ اگلے دن ہفتے کو جنازہ مہر والی گیا اور اپنے استاد اور دیرینہ مربی مفتی کفایت اللہ مرحوم کے پہلو میں درگاہ حضرت بختیار کاکی کے دروازے کے برابر ظفر منزل کے نیچے دفن ہوئے۔ (مفتی اعظم کی یاد میں : 184-218)

حوالہ نمبر: 9 عبدالعزیز۔ افسوس' ان کے حالات معلوم نہیں ہو سکے۔

حوالہ نمبر : 10 اللہ تعالیٰ کی صفات میں' عزیز' یعنی (زبردست طاقت والا) بھی ہے۔ یہ لفظ بلامبالغہ قرآن میں' بیسیوں جگہ خدا کی اس صفت کے ساتھ آیا ہے۔

حوالہ نمبر : 11 اس حدیث کے الفاظ ہیں افضل الجہاد کلمۃ عدل عند سلطان جائر (او امیر جائر) یہ حدیث صحاح ستہ کے متعدد مجموعوں میں ملتی ہے۔ مثلاً ابوداؤد (کتاب الملاحم : 17) ترمذی (کتاب الفتن : 13) النسائی (کتاب البیعۃ :37)' ابن ماجہ (کتاب الفتن : 30) اس کے علاوہ مسند ابن حنبل کی تیسری اور چوتھی اور پانچویں جلد کے کئی مقامات پر بھی ہے۔

حوالہ نمبر : 11 جلیاں والا باغ : امرتسر میں ایک پرانے وقتوں کا باغ تھا' جہاں لوگ میلے لگاتے اور جلسوں کے لیے جمع ہوتے تھے۔ پہلی عالمی جنگ عظیم (1914-1918) کے بعد پنجاب میں بہت بے چینی پھیل گئی

تھی۔ حکومت وقت نے سختی سے کام لیا۔ سر مائیکل اوڈوائر لیفٹیننٹ گورنر پنجاب نے طاقت کے زور سے لوگوں کو مرعوب اور خاموش کرنا چاہا' متعدد عوامی لیڈر گرفتار کر لیے' گولی چلا دی' جس میں بے گناہ لوگ مارے گئے۔ حکومت کے ان اقدامات کے خلاف احتجاج کے لیے عوام نے بروز اتوار 13 اپریل 1919ء کو جلیاں والا باغ میں جلسہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ جلسہ ہو رہا تھا کہ بریگیڈیر جنرل ڈائر فوج لے کر جلسہ گاہ پر پہنچ گئے۔ انہوں نے لوگوں کو منتشر ہونے کے لیے کہا تک نہیں' بلکہ پہنچتے ہی ہجوم پر گولی چلانے کا حکم دے دیا۔ آج تک معلوم نہیں ہو سکا کہ واقعی کتنے آدمی اس المیے میں ہلاک ہوئے۔ تحقیقاتی کمیٹی کا اندازہ تھا کہ اگر مرنے والوں کی تعداد ایک ہزار قرار دی جائے' تو اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہوگا۔

حوالہ نمبر: 12 سورۃ الفرقان 25 : 69 - ظاہر ہے کہ متن میں اس آیت کا جو ترجمہ دیا گیا ہے۔ وہ تفسیری ہے' لفظی نہیں۔

حوالہ نمبر: 13 والفتنة اکبر من القتل (البقرہ 2 : 217)' والفتنة اشد من القتل (البقرہ 2 : 191 (فتنہ و فساد قتل سے بھی بڑا (جرم) ہے)

حوالہ نمبر: 15 البقرۃ 2 : 179 (اے اصحاب عقل! قصاص میں زندگی کی روح) ہے۔

حوالہ نمبر: 16 النساء 4 : 93

حوالہ نمبر: 17 اسامہ بن زید بن حارث مشہور صحابی ہیں۔ ان کے والد زید بن حارث رسول کریم صلعم کے آزاد کردہ غلام تھے اور انہوں نے خود ان کی تربیت کی تھی۔ اسی لیے اسامہ حضرت رسول اللہ صلعم کو بہت عزیز تھے۔ ان کی ولادت چوتھے سال نبوت (تقریباً 614ء) میں ہوئی۔ ان کے والد زید شام میں البلقاء کے مقام پر مارے گئے' تو حضرت رسول اللہ صلعم نے انہیں ایک فوج کا سپہ سالار بنا کر شام

روانہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس لشکر میں بڑے بڑے اکابر صحابہ ان کی ماتحتی میں تھے' حال آنکہ اس وقت ان کی اپنی عمر 17-18 سال سے متجاوز نہیں تھی۔ لشکر ابھی روانہ نہیں ہوا تھا کہ حضور ﷺ کا وصال ہو گیا اور حضرت ابوبکر خلیفہ بنا دیے گئے۔ بیشتر لوگوں نے مشورہ دیا کہ حالات کو دیکھتے ہوئے مہم ملتوی کر دی جائے' لیکن ان کی مخالفت کے باوجود حضرت ابوبکر نے یہ مہم بھیج دی تھی۔

حضرت عمر نے اپنے زمانے میں ان کا 4000 درہم سالانہ وظیفہ مقرر کیا تھا' جو بدری صحابیوں کو ملتا تھا۔ 54 ہجری میں انتقال کیا اور مدینہ میں دفن ہوئے۔

یہاں جس واقعے کا ذکر ہے' یہ قبیلہ جہینہ کے خلاف مہم میں پیش آیا تھا۔ ہوا یہ کہ حضرت اسامہ نے ایک مخالف کو پکڑ لیا۔ جونہی اسے قتل کرنے کو تلوار اٹھائی' اس نے کہہ دیا لا الہ الا اللہ۔ راوی ابن ابی شیبہ نے اس کا حضرت رسول کریم صلعم سے ذکر کیا' تو آپؐ نے دریافت فرمایا: کیا واقعی اس نے لا الہ الا اللہ کہا تھا اور اس کے باوجود تم نے اسے قتل کر دیا۔ اسامہ نے جواباً" کہا: حضور' اس نے تلوار سے ڈر کر ایسا کہا تھا۔ اس پر حضورؐ نے سوال کیا: تو کیا تم نے اس کا دل چیرا تھا کہ دیکھتے کہ اس نے دل سے کہا تھا یا نہیں اور اس بات کو متاسفاً" دہرایا۔ اسامہ کہتے تھے کہ کاش میں اس دن اسلام لایا ہوتا۔ (صحیح مسلم' کتاب الایمان)

5- خطبہ صدارت جمعیتہ العلماء ہند' لاہور

حوالہ نمبر 1: جمعیتہ العلماء ہند کا یہ تیسرا سالانہ اجلاس تھا' جو لاہور میں 18 نومبر سے 20 نومبر 1921ء تک منعقد ہوا۔ یہ لاہور کے مشہور بریڈلا ہال میں ہوا تھا۔ خطبہ صدارت جو چھپا ہوا موجود تھا' پہلے دن 18 نومبر

1921ء کو پڑھا گیا تھا۔ اس اجلاس کے صدر استقبالیہ مولانا عبدالقادر قصوری تھے۔ اس سے پہلے جمعیۃ العلماء ہند کے دو اجلاس ہو چکے تھے۔ پہلا' امرتسر میں (28-31 دسمبر 1919 و یکم جنوری 1920ء) بصدارت مفتی محمد کفایت اللہ اور دوسرا' دہلی میں بصدارت شیخ الہند مولانا محمود الحسن (28' 29' 30 نومبر 1920ء کو)

حوالہ نمبر: 2 سورۃ الکہف' 18 : 10 (اے ہمارے رب! ہمیں اپنی بخشش عطا کر اور ہمارے لیے ہمارے کام کی درستی مکمل کر دے)

حوالہ نمبر: 3 دیوان کامل خواجہ حافظ شیرازی: 143

حوالہ نمبر: 4 ایضاً : 147- دوسرے شعر کے مصرع اول میں مطبوعہ دیوان میں' قدسیاں' کی جگہ خاکیاں ملتا ہے۔ دیوان کے بعض دوسرے نسخوں میں سرے سے یہ غزل موجود ہی نہیں' ممکن ہے' الحاق ہو۔

حوالہ نمبر: 5 یہ مشہور حدیث صحیح بخاری کے متعدد مقامات پر ہے۔ مثلاً بدرالوحی: 1 عتق: 6' وغیرہ) اس کے علاوہ صحیح مسلم (کتاب الامارہ: 155)' ابوداؤد (کتاب الطلاق : 11)' نسائی' (کتاب الطہارہ : 59' کتاب الطلاق: 24 وغیرہ) اور ابن ماجہ (کتاب الزہد: 26) میں بھی ملتی ہے۔

حوالہ نمبر: 6 یہ حدیث صحیح بخاری میں کئی جگہ آئی ہے مثلاً کتاب الایمان' کتاب العتق' مناقب الانصار وغیرہ۔ اس کے علاوہ یہ مسلم (کتاب الامارہ)' دارمی (کتاب الطلاق) ترمذی (کتاب الفضائل الجہاد)' نسائی (کتاب الایمان) اور مسند حنبل (1 : 43) میں بھی ہے۔

حوالہ نمبر: 7 سورۃ البقرہ 2 : 207 (اور بعض آدمی اللہ کی رضا جوئی کی خاطر اپنے آپ کو بیچ ڈالتا ہے)

حوالہ نمبر: 8 یہ آیت سورۃ الشعرا (26) میں بار بار آئی ہے مثلاً 109' 127' 145' 164' 180- اس کے معنی ہیں: میں اس کے لیے تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا' کیونکہ مجھے معاوضہ جہانوں کا رب دے گا۔

حوالہ نمبر: 9 مسند دارمی: مقدمہ

حوالہ نمبر: 10 سورۃ الاحزاب، 33 : 21 (تمہارے لیے رسول اللہ میں اچھا نمونہ ہے)

حوالہ نمبر: 11 سورۃ ممتحنہ، 60 : 4 (تمہارے لیے اچھا نمونہ ہے، ابراہیم اور ان کے ساتھیوں کا)

حوالہ نمبر: 12 سورۃ فاتحہ، 1 : 6-5 (ہمیں سیدھے راستے پر چلا، راستہ ان لوگوں کا، جن پر تو نے فضل کیا)

حوالہ نمبر: 13 سورۃ النساء 4 : 69 (جن پر اللہ نے انعام کیا نبیوں اور صدیقوں اور شہیدوں اور نیکوکاروں میں سے، اور کیا اچھے رفیق ہیں یہ لوگ)

حوالہ نمبر: 14 سورۃ ہود، 11 : 7، نیز سورۃ الملک : 67 : 2 (تاکہ تمہارا امتحان کرے کہ تم میں سے کون اچھا عمل کرتا ہے)

حوالہ نمبر: 15 سورۃ النور، 24 : 40 (اندھیرے ایک دوسرے کے اوپر)

حوالہ نمبر: 16 سورۃ الجاثیہ، 45 : 24 (انہیں اس کا کچھ علم نہیں ہے، سوائے اس کے کہ وہ اٹکل سے کام لیتے ہیں)

حوالہ نمبر: 17 سورۃ الدخان: 44 : 9 (بلکہ وہ دھوکے میں کھیلتے ہیں)

حوالہ نمبر: 18 سورۃ النجم 53 : 28 (انہیں اس کا کچھ علم نہیں، محض قیاس کی پیروی کرتے ہیں، اور حقیقت کے مقابلے میں قیاس تو کام نہیں دیتا)

حوالہ نمبر: 19 سورۃ محمد، 47 : 14 (بھلا ایک آدمی جو اپنے رب کے بتائے ہوئے) صاف رستے پر چلتا ہے، کیا اس کے برابر ہے، جسے اسکے برے اعمال اچھے معلوم ہونے لگے، اور وہ چلتے ہیں اپنی ہوا و ہوس کے پیچھے)

حوالہ نمبر: 20 سورۃ النحل 16 : 79 (ہر چیز کا کھلا کھلا بیان)

حوالہ نمبر: 21 سورۃ البقرہ 2 : 256 (مضبوط حلقہ' ناقابل شکست)

حوالہ نمبر : 22 سورۃ یوسف' 12 : 108 (یہ ہے میری راہ' میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں) میں صاحب بصیرت ہوں اور وہ بھی جو میری پیروی کرتے ہیں۔

حوالہ نمبر : 23 سورۃ الانعام 6 : 5 نیز رعد' 13 : 17 (کیا اندھا اور دیکھنے والا ایک برابر ہوتے ہیں)

حوالہ نمبر : 24 سورۃ الزمر' 39 : 9 (کیا جو لوگ جانتے ہیں' وہ نہ جاننے والے لوگوں کے برابر ہوتے ہیں)

حوالہ نمبر : 25 گلستاں کے باب پنجم کی آخری (منظوم) حکایت کا شعر ہے' (کلیات سعدی : 102)

حوالہ نمبر : 26 مولانا محمودالحسن شیخ الہند 1268ھ -1851ء میں بریلی میں پیدا ہوئے' جہاں ان ایام میں ان کے والد مولانا ذوالفقار علی بحیثیت انسپکٹر مدارس مقیم تھے۔ تعلیم کے بعد 1289ھ - 1872ء میں اولاً دارالعلوم دیوبند میں معین مدرس مقرر ہوئے اور پچاس برس تک (1339ھ) یہاں پڑھاتے رہے۔ آخری 34 برس یہیں صدر مدرس رہے۔ انہوں نے ملک کی آزادی کے لیے خفیہ طور پر بہت کام کیا تھا۔ اور اسی مقصد کے لیے جمعیۃ الانصار کی تحریک شروع کی تھی۔ اسی کے نتیجے میں ہندوستان کی شمال مغربی سرحد پر انگریزوں کے خلاف محاذ قائم ہوا۔ ان کی ہدایت کے مطابق جن لوگوں نے ہجرت کرکے افغانستان میں سکونت اختیار کی تھی۔ انہوں نے وہاں ایک متوازی حکومت قائم کرلی۔ بیرون ہند اسی تحریک کو تقویت پہنچانے کے لیے انہوں نے 1915ء (1333ھ) میں مکہ کا سفر کیا۔ یہاں انہوں نے دو حج کیے۔ یہ پہلی جنگ عظیم کا زمانہ تھا' اور انگریز کی ان کی مخالفانہ سرگرمیوں پر کڑی نگاہ تھی۔ انہوں نے شریف مکہ پر دباؤ ڈالا اور یہ

دوسرے رفقاء کے ساتھ گرفتار کرلیے گئے۔ یہاں سے پہلے قاہرہ اور پھر جزیرہ مالٹا میں قید رہے۔ یہ قید و بند کا سلسلہ مارچ 1920ء تک چلا۔ رہائی کے بعد جون 1920ء میں وہ بمبئی پہنچے اور اسی سال 20 نومبر 1920ء کو دلی میں انتقال ہوگیا۔ جنازہ دیوبند گیا' جہاں دارالعلوم کے قبرستان میں سپردخاک ہوئے (شیخ الہند' اسیر مالٹا' تذکرہ مشائخ دیوبند)

حوالہ نمبر: 27 شاعر کا نام نہیں معلوم ہوسکا۔

حوالہ نمبر: 28 سورۃ یوسف' 12 : 33 (میرے نزدیک قیدخانہ اس چیز کی بہ نسبت زیادہ محبوب ہے' جس کی طرف وہ مجھے بلاتے ہیں)

حوالہ نمبر: 29 ' سورۃ یوسف' 12 : 54: (یقیناً تم نے آج ہمارے پاس اعتماد کا مقام پایا)

حوالہ نمبر: 30 سورۃ یوسف 12 : 56'21 (اس طرح ہم نے یوسف کو زمین میں صاحب قدرت بنایا)

حوالہ نمبر: 31 سورۃ یوسف 12 : 90 (اللہ نے ہم پر احسان کیا' ہاں جو کوئی' (اللہ سے) ڈرتا ہے اور (مصیبت میں) صبر کرتا ہے' تو یقیناً اللہ نیکی کرنے والوں کا بدلہ ضائع نہیں کرتا)

حوالہ نمبر: 32 سورۃ یوسف 12 : 7 (ہاں' یوسف اور اس کے بھائیوں کے قصے میں دریافت کرنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں)

حوالہ نمبر: 33 سورۃ یوسف 12 : 39 (اے میرے قید خانے کے ساتھیو! (یہ تو بتاؤ کہ) کیا منتشر متعدد معبود بہتر ہیں' یا ایک اکیلا زبردست اللہ؟)

حوالہ نمبر: 34 سورۃ یوسف 12 : 101 (اے رب! تو نے مجھے حکومت دی اور باتوں کا مطلب اور نتیجہ نکالنا سکھایا۔ اے آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے' تو ہی میرا کارساز ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ مجھے اٹھائیو تو اپنی فرمانبرداری کی حالت میں' اور ان کے ساتھ

شامل کیجیو' جو تیرے نیک بندے ہیں)

حوالہ نمبر:35 شاعر کا نام نہیں معلوم ہو سکا

حوالہ نمبر: 36 سورۃ یوسف 12 : 94 (میں اس میں یوسف کی بو پاتا ہوں' بشرطیکہ تم یہ نہ کہو کہ بوڑھا بہک گیا ہے)

حوالہ نمبر: 37 سورۃ یوسف 84:12 (اور اس نے کہا' وائے افسوس یوسف پر) اور غم کے مارے اس کی آنکھیں سفید ہو گئیں' حال آنکہ وہ بہت ضبط کرتا رہا)

حوالہ نمبر:38 شاعر کا نام معلوم نہ ہو سکا

حوالہ نمبر: 39 مثنوی مولانا روم' دفتر اول' 49-50- عنوان "تفسیر ماشاء اللہ کان و مالم یشالم یکن۔"[۳۹] اس سلسلے میں دو باتیں کہنے کی ہیں: اول' یہ دونوں شعر مثنوی میں یکے بعد دیگرے نہیں آئے' بلکہ ان کے درمیان چند شعر ہیں۔ دوسرے' شعر اول کے مصرع ثانی میں "روز و شب" در کی جگہ "ہمچو او با" ہے یعنی "ہمچو او با گریہ و آشوب باش" ہے۔

حوالہ نمبر:40

نوٹ: اس حاشیہ کے تحت مرتب نے کچھ نہیں لکھا۔ (ناشر)

حوالہ نمبر:41 مولانا احمد سعید۔ دیکھئے خطبہ 4' حاشیہ 8

حوالہ نمبر: 42 عباس بن الاحنف کا شعر ہے (دیوان : 96) نیز دیکھئے تذکرہ (حواشی): 371 (حاشیہ 5 متعلقہ ص 62)

حوالہ نمبر :43 حلاج کا شعر ہے (دیوان : 128) مطبوعہ شعر کے مصرع ثانی میں "اھون" کی جگہ "اسھل" ملتا ہے۔

حوالہ نمبر: 44 یہ حدیث متعدد مجامیع میں آئی ہے مثلاً ترمذی (باب الفتن' نیز تفسیر سورۃ المائدہ)' ابن ماجہ (باب الفتن)' مسند حنبل (3-49-491)' ابوداؤد (کتاب الملاحم) ٹھیک الفاظ یہ ہیں: الصابر فیھم علی

وینہ کالقابض علی الجمر۔

حوالہ نمبر:45 شاعر کا نام نہیں معلوم ہوسکا۔

حوالہ نمبر:46 سورۃ یوسف 12 : 83 (شاید اللہ ان سب کو میرے پاس لے آئے' وہی جاننے والا حکمتوں والا ہے)

حوالہ نمبر:47 سورۃ الکھف 10:18 (اے ہمارے رب! ہمیں اپنے پاس سے رحمت بخش' اور ہمارے کام کی ٹھیک سے تکمیل کردے)

حوالہ نمبر:48 سورۃ الکھف 23:18 (میرا رب ان کی تعداد خوب جانتا ہے)

حوالہ نمبر:49 ایضاً : 13 (وہ کئی جوان تھے' جو اپنے رب پر ایمان لائے اور ہم نے انھیں ہدایت میں پختہ کیا)

حوالہ نمبر:50 ایضاً : 14 (انہوں نے کہا : ہمارا رب' آسمانوں اور زمین کا رب' ہم اس کے سوا کسی دوسرے کو معبود کہہ کر نہیں پکاریں گے۔ اگر ہم نے ایسا کہا' تو یہ بے عقلی کی بات ہوگی)

حوالہ نمبر:51 ایضاً : 16 (اب پناہ لو اس غار میں' تمہارا رب تمہارے لیے اپنی رحمت وسیع کردے' اور تمہارے کام میں تمہارے لیے آسانی پیدا کردے)

حوالہ نمبر:52 سورۃ ہود 120:11 (اور ہم تیرے لیے رسولوں کے احوال میں سب باتیں بیان کرتے ہیں تاکہ اس سے تیرا دل مضبوط ہو اور اس میں تیرے پاس مومنوں کے لیے سچائی اور نصیحت اور یاد رکھنے والی باتیں ہیں)

حوالہ نمبر:53 ایضاً 103-102 (اور اس طرح کی ہے گرفت تیرے رب کی' جب وہ ظلم کرتی ہوئی بستیوں کو پکڑتا ہے۔ بیشک' اس کی گرفت سخت دردناک ہے۔ اس میں آخرت کے عذاب سے ڈرنے والے کے لیے نشانی ہے)

حوالہ نمبر :54 سورۃ یوسف 105:12 (اور کئی نشانیاں ہیں آسمانوں اور زمین میں جن سے وہ بے توجہی سے گزر جاتے ہیں)

حوالہ نمبر:55 سورۃ آل عمران 191:3 (تو نے یہ عبث پیدا نہیں کیا)

حوالہ نمبر :56 سورۃ الانعام' 79:6 (میں نے ہر طرف سے منہ موڑ کر اپنا منہ اس کی طرف کرلیا ہے' جس نے آسمان اور زمین بنائے)

حوالہ نمبر :57 سورۃ المومنون 44:23' نیز سورۃ سبا' 19:34 (اور ہم نے ان کی کہانیاں بنا ڈالیں۔)

حوالہ نمبر 58: سورۃ ہود' 101:11 (ان میں سے بعض اب تک کھڑی ہیں' اور بعض تباہ ہو گئیں)

حوالہ نمبر :59 سورۃ یونس 73:10' نیز صافات 73:37 (دیکھو' کیا انجام ہوا ان کا' جنہیں (بداعمالیوں سے) ڈرایا گیا تھا)

حوالہ نمبر :60 سورۃ الاعراف' 84:7 (دیکھو' کیا انجام ہوا نافرمانی کرنے والوں کا)

حوالہ نمبر :61 سورۃ الشعراء' 26 : 158 (یقیناً اس میں نشان ہیں' اور ان میں سے اکثر اسے تسلیم نہیں کرتے)

حوالہ نمبر :62 سورۃ النور 34:24 (اور ہم نے تم پر صاف صاف آیتیں نازل کیں اور ان لوگوں کے حالات بھی' جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں)

حوالہ نمبر :63 سورۃ الحج 45:22-46 (کتنی ہی بستیاں جنہیں ہم نے غارت کردیا' کیونکہ وہ گنہگار تھیں' اب اپنی چھتوں پر گری پڑی ہیں اور کتنے کنوئیں بیکار اور کتنے منقش محل (خالی) ہیں۔ کیا انہوں نے زمین میں چل پھر کر نہیں دیکھا' تاکہ انہیں (مشاہدے سے) سوچنے والے دل یا سننے والے کان ملتے' بعض آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں' بلکہ سینوں میں دل اندھے ہو جاتے ہیں)

حوالہ نمبر :64 سورۃ الاحزاب' 62:33 (یہ تھا قانون اللہ کا ان لوگوں سے

متعلق جو پہلے گزرے اور تو نہیں پائے گا اللہ کا قانون بدلنے والا)

حوالہ نمبر 65: سورۃ الانفال 38:8 (اور اگر وہ اپنے کرتوتوں کا) اعادہ کریں گے' تو اگلوں کا بنا ہوا قانون موجود ہی ہے)

حوالہ نمبر 66: سورۃ فاطر' 43:35 (کیا وہ انتظار کر رہے ہیں' اس قانون کا جو پہلوں پر (نافذ) ہوا۔ (اگر یوں ہے' تو) تو اللہ کے قانون کو بدلنے والا نہیں پائے گا اور نہ اللہ کے قانون کو ٹلنے والا پائے گا)

حوالہ نمبر 67: سورۃ النساء' 26:4 (قانون ان لوگوں کے جو تم سے پہلے گزر چکے)

حوالہ نمبر 68: سورۃ الحدید 21:57 نیز الجمعہ' 4:62 (یہ اللہ کا فضل ہے' جسے چاہتا ہے' دیتا ہے' اور اللہ بڑے فضل والا ہے)

حوالہ نمبر 69: المومنون 81:23 (بلکہ یہ بھی وہی کچھ کہتے ہیں' جیسا ان سے پہلے کے لوگ کہا کرتے تھے)

حوالہ نمبر : 70 سورۃ التوبہ' 33:9' الفتح' 28:48' الصف 9:61 (تاکہ اسے سب دینوں پر غالب کرے)

حوالہ نمبر 71: سورۃ العنکبوت 53:29 (وہ تجھ سے عذاب جلدی مانگتے ہیں اور اگر اس کا وقت مقرر نہ ہوتا' تو ان پر عذاب کب کا آچکا ہوتا)

حوالہ نمبر 72: سورۃ یونس 10:48-49 (اور وہ کہتے ہیں کہ اگر تم سچے ہو' تو یہ عذاب کا وعدہ کب پورا ہوگا؟ (ان سے) کہو کہ میں تو اپنے لیے نہ برائی کا ذمہ وار ہوں' نہ بھلائی کا' ہاں جو اللہ چاہے۔ ہر قوم کے لیے ایک مقررہ وقت ہے' جب ان کا وقت آگیا' پھر وہ اسے نہ ایک گھڑی پیچھے کر سکیں گے' نہ آگے کر سکیں گے)

حوالہ نمبر 73: سورۃ غافر' 78:40 (پس جب اللہ کا حکم نافذ ہوا' تو انصاف سے فیصلہ ہوگیا اور اس وقت جھوٹے نقصان میں رہے)

حوالہ نمبر 74: سورۃ الروم 41:30 (لوگوں کے ہاتھوں خشکی اور تری میں

فساد کا دور دورہ ہو گیا)

حوالہ نمبر 75: سورۃ القصص' 78:28 (کون ہے اس سے طاقت میں زیادہ تر)

حوالہ نمبر 76: مقابلہ کے لیے دیکھیے' انجیل لوقا (58:9) (یسوع نے اس سے کہا کہ لومڑیوں کے بھٹ ہوتے ہیں اور ہوا کے پرندوں کے گھونسلے' مگر ابن آدم کے لیے سر دھرنے کی بھی جگہ نہیں)

حوالہ نمبر 77: عمرو بن الحارث بن عمرو بن مضاض الاصغر کا شعر ہے (السیرۃ لابن ہشام' 82:1' معجم البلدان 186:5' وفیات الاعیان' 301:1' المحاضرات للراغب' 147:1)

حوالہ نمبر 78: یہ شعر نہج البلاغہ میں ہے (55:9) اگرچہ وہاں منکر کی جگہ نکر ہے لیکن معلوم نہیں ہو سکا کہ ہے کس کا

حوالہ نمبر 79: یہ تمام اشعار نوحیہ البقاء کے ہیں' شاعر کا نام ابوالبقاء صالح بن شریف الرندی ہے (نفح الطیب 233:6)

حوالہ نمبر 80: سورۃ الکہف 10:18 (اے ہمارے رب! ہمیں اپنی جناب سے رحمت عطا کر اور ہمارے کام میں ہدایت بخش)

حوالہ نمبر 81: سرسید احمد خان' انیسویں صدی کے ہندوستان کی مایہ ناز شخصیت۔ ولادت: دلی' 6 ذوالحجہ 1232ھ ۔ 17 اکتوبر 1817ء۔ بانی محمڈن اینگلو اورینٹل کالج (حال علی گڑھ مسلم یونیورسٹی)۔ ملک کی تعلیم' سماجی' سیاسی ترقی کی تاریخ ان کے تذکرے کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔ 27 مارچ 1898ء کو علی گڑھ میں انتقال ہوا اور اپنے قائم کردہ کالج (یونیورسٹی) کی مسجد کے پہلو میں دفن ہوئے (حیات جاوید)

حوالہ نمبر 82: سلطان محمود خان (1785-1839ء)' سلطان عبدالحمید اول کے صاحبزادے' یہ اپنے بڑے بھائی مصطفیٰ چہارم کی وفات پر 1808ء میں تخت پر بیٹھے۔ انہوں نے اپنے وزیر اعظم بیراکتر کی ترغیب پر ملک

میں اصلاحات نافذ کرنے کا فیصلہ کیا لیکن فوج (ینی سری) کی مخالفت کے باعث انھیں ملتوی کرنے پر مجبور ہوگئے۔ سیاسی اور فوجی پہلو سے بھی اطمینان نصیب نہ ہوا۔ اولاً یونان سے لڑائی ہوئی' جس کی پشت پر تمام یورپی طاقتیں تھیں۔ یہ ختم ہوئی' تو روس نے حملہ کردیا۔ اس جنگ کا خاتمہ صلح نامہ اورنہ پر ہوا (14 ستمبر 1829ء) جس نے ترکیا کو کم و بیش روس کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنا دیا۔

محمد علی پاشا (مصر) ان کی اصلاحی کوششوں کا سب سے مستعد مخالف تھا اور اسی لیے وہ لوگوں میں بہت ہر دلعزیز تھا۔ سلطان نظام حکومت اور فوج کو مغربی ممالک کے اسلوب پر منظم کرنا چاہتے تھے' یہی محمد علی پاشا نے بھی خود مصر میں کیا تھا۔ لیکن پراپیگنڈے میں بہت طاقت ہے۔ سلطان چونکہ مدۃ العمر جنگوں میں الجھے رہے' اس لیے اپنے منصوبے کو مکمل نہ کرسکے۔ اس کے باوجود انھوں نے 1839ء میں ینی سری کا خاتمہ کردیا۔ جس سے تنظیمات کے لیے راہ صاف ہوگئی۔

یکم جولائی 1839ء کو انتقال ہوا۔

حوالہ نمبر 83: فواد پاشا ترکیا کے مشہور شاعر عزت ملا کے بیٹے تھے۔ جنہیں سیاسی سرگرمیوں کے باعث 1829ء میں جلا وطنی کی سزا ملی تھی۔ ان کا اصلی نام محمد تھا۔ اور یہ 1815ء میں استامبول میں پیدا ہوئے۔ طب اور فرانسیسی زبان کی تعلیم کی تکمیل کے بعد حکومت کی ملازمت میں داخل ہوگئے۔ اور یہاں سے ان کی ترقی اور تجربہ بتدریج بڑھتا رہا۔ تین چار مرتبہ وزیر خارجیہ رہنے کے بعد 22 نومبر 1861ء کو پہلی مرتبہ وزیراعلیٰ مقرر ہوئے' لیکن سلطان عبدالعزیز سے اختلاف کی بنا پر انھیں جنوری 1863ء میں دست بردار ہونا پڑا لیکن جلد ہی سلطان نے انھیں واپس بلا لیا اور جون میں وہ دوبارہ وزیراعلیٰ بنا دیے گئے۔ اب کے وہ اس عہدے پر تین برس تک متمکن رہے۔ اس اثنا میں

انھوں نے ملک و ملت کے لیے بہت اہم خدمات سرانجام دیں۔ چونکہ سلطان عبدالعزیز' مصر کے خدیو اسماعیل کی بیٹی سے شادی کرنا چاہتے تھے' اور فواد اس کے خلاف تھے' اس لیے اس نے انھیں جون 1866ء میں وزارت اعلیٰ کے منصب سے الگ کر دیا۔

فروری 1867ء میں وہ (پانچویں اور آخری مرتبہ) وزیر خارجیہ کی حیثیت سے سلطان عبدالعزیز کے ساتھ پیرس' لندن' ویانا کے سفر پر گئے۔ جہاں ایک طرف اس سے سیاسی فائدے حاصل ہوئے' وہیں اس سفر میں سلطان کو مغرب کی مادی ترقیوں کے دیکھنے کا موقع ملا' یہ سفر ترکیا میں اصلاح و تبدیلی کا پیشہ خیمہ ثابت ہوا۔

فواد پاشا صحت کی خرابی کی وجہ سے نیس (اٹلی) گئے تھے کہ وہیں 12 فروری 1869ء کو بعلوضہ قلب انتقال ہو گیا۔ لاش استانبول آئی' جہاں وہ دفن ہوئے۔ فواد پاشا کو فرانسیسی زبان پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی اور یہی اس زمانے میں (بلکہ بہت قریب کے زمانے تک) بین الاقوامی سیاست کی زبان تھی۔ اس سے انھیں بہت فائدہ ہوا۔ انھوں نے احمد جودت کی شرکت میں ترکی کی پہلی جدید گرامر (قواعد عثمانیہ) کے نام سے لکھی۔ وہ اصلاح کے زبردست حامی تھے' لیکن یہ بھی جانتے تھے کہ جلد بازی ترکیا کے قدامت پرست حلقوں کی مخالفت کا باعث ہو گی' اس لیے انھوں نے بتدریج کام کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کے بعد تنظیمات کے نام سے جو کچھ ہوا' اس کی بنیاد انھی کے ہاتھوں پڑی تھی۔

حوالہ نمبر 84: محمد علی پاشا' مصر کی آزادی اور وہاں کے شاہی خاندان کے بانی' البانیا میں پیدا ہوئے۔ سال ولادت میں اختلاف ہے۔ اگرچہ خود انھوں نے یہ 1769ء لکھا ہے۔ 1798ء میں نپولین کے حملہ مصر کے موقع پر وہ ترکی افواج کے ساتھ مصر پہنچے اور یہاں انھوں نے اپنا

حلقہ اقتدار وسیع کرنے کی داغ بیل ڈالی۔ یہاں اس وقت ممالیک کا دور دورہ تھا۔ محمد علی نے مارچ 1811ء میں ان کے سرداروں کی قلعے میں دعوت کی اور کھانے کے بعد سب کو تہ تیغ کرا دیا۔ اس کے بعد جب وہابیوں نے جزیرہ العرب پر قبضہ کرلیا' تو سلطان نے محمد علی سے سے مدد طلب کی' اور محمد علی کے سب سے بڑے بیٹے ابراہیم پاشا نے ان کا قلع قمع کردیا۔ اس کے بعد محمد علی نے رفتہ رفتہ اپنا اقتدار سوڈان اور مصر کے جنوبی نخلستانوں تک وسیع کرلیا۔ خرطوم کی بنا 1823ء میں پڑی اور سات سال بعد 1830ء میں یہ سوڈان کا دارالخلافہ بنا دیا گیا۔ وہ چاہتے تھے کہ ملک کے نظم و نسق کی مغربی طرز پر اصلاح اور تنظیم ہو' ادھر سلطان کو شبہ تھا کہ محمد علی' شریف مکہ کی مدد اور شہ پر اپنے خلیفۃ المسلمین ہونے کا اعلان کرنا چاہتے ہیں۔ بالآخر جنگ تک نوبت پہنچی' جس کے نتیجے میں سلطان معظم کو محمد علی کو مصر کا موروثی پاشا تسلیم کرنا پڑا۔ (1841ء)۔ محمد علی کی 2 اگست 1849ء کو قاہرہ میں وفات ہوئی' وہیں دفن ہیں۔ وہ مصر جدید کے بانی ہیں۔ ان کے خاندان نے 1952ء تک حکومت کی جب انقلاب ہوا اور ان کے نام لیوا فاروق کو تخت سے معزول کردیا گیا۔

حوالہ نمبر : 85 خیرالدین۔ افسوس' ان کے حالات کہیں سے دستیاب نہیں ہوئے۔

حوالہ نمبر : 86 بیرم تیونسی۔ تیونس کے ایک ایسے خاندان کے چشم و چراغ تھے' جس نے تیرہویں صدی ہجری میں فقہ اور ادب کے میدان میں قابل قدر خدمات انجام دیں۔ ان کا پورا نام محمد بیرم بن مصطفیٰ بن محمد تھا اور وہ محمد بیرم پنجم کے عرف سے مشہور ہیں۔ 1256ھ (1840ء) میں تیونس میں پیدا ہوئے۔ تعلیم یورپ میں پائی اور پھر حکومت کے مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ جب 1298ھ (1882ء) میں فرانس ان کے

وطن پر مسلط ہو گیا' تو وہ ہجرت کر کے اولاً استامبول گئے اور پھر وہاں سے مصر چلے گئے۔ یہاں سے انہوں نے ایک پرچہ الاعلام کے نام سے جاری کیا۔ بعد کو وہ قاہرہ میں قاضی مقرر ہوئے۔ وہ مصر میں برطانوی اقتدار کے سخت مخالفین میں سے تھے۔

وہ متعدد کتابوں کے مصنف ہیں' " صفوة الاعتبار بمستودع الامصار "ان میں سے بہت مشہور ہے' یہ چھپ چکی ہے۔ اس کتاب کا ان کا اپنا خطی نسخہ دار الکتب مصریہ' قاہرہ میں محفوظ ہے۔

حلوان (مصر) میں 1307ھ (1889ء) میں رحلت کی۔

حوالہ نمبر 87: سید جمال الدین اسد آبادی (1838ء-1839-1897ء) حالات کے لیے دیکھیے۔ غبار خاطر (ساہیہ اکاڈیمی اڈیشن) : 315

حوالہ نمبر 88: مدحت پاشا۔ 1822ء میں قسطنطنیہ میں پیدا ہوئے۔ زندگی بہت معمولی ملازمت سے شروع کی' لیکن جو کام بھی ان کے سپرد ہوا' اسے انہوں نے ایسی مستعدی اور عمدگی سے انجام تک پہنچایا کہ 1860ء میں پاشا کے خطاب سے مفتخر ہو کر وزیر مقرر ہو گئے۔ اس کے بعد نیش کی گورنری کے زمانے میں انہوں نے جو اصلاحات وہاں رائج کیں' ان کی کامیابی سے متاثر ہو کر سلطان المعظم نے انہیں فواد پاشا اور علی پاشا کی معیت میں ایسی ہی سکیم پورے ممالک اسلامیہ کے لیے تیار کرنے کا حکم دیا۔ یہی اسکیم بعد کو "احکام ولایات" کے نام سے مشہور ہوئی۔

مدحت پاشا "ینگ ترک" پارٹی کے موید اور مداح تھے' لیکن چاہتے تھے کہ اصلاحات قدم بقدم اور رفتہ رفتہ نافذ ہوں۔ ادھر سلطان عبدالعزیز کسی عنوان اس پر تیار نہیں تھے' جس سے کام بگڑتا چلا گیا۔ آخر کار وزیر اعلیٰ اور وزیر افواج اور مدحت پاشا نے گٹھ جوڑ کر کے سلطان کو مئی 1876ء میں معزول کر دیا اور اس کے کوئی مہینہ بھر بعد وہ موت کے

گھاٹ اتار دیے گئے۔ ان کے جانشین مراد پنجم کا بھی یہی حشر ہوا، اور ان کی جگہ ان کے چھوٹے بھائی عبدالحمید ثانی تخت نشین ہوئے۔ انہوں نے مدحت پاشا کو وزیراعلیٰ کے عہدے پر فائز کر دیا۔ لیکن ان کی نئے سلطان سے نبھ نہ سکی۔

مدحت پاشا کے آخری سال مختلف قسم کے مصائب میں بسر ہوئے، حتیٰ کہ ایک موقع پر انھیں موت تک کی سزا سنا دی گئی۔ جان تو انگریزی حکومت کے بیچ بچاؤ سے بچ گئی، لیکن جلا وطن ہونا پڑا۔ آخری ایام طائف (جزیرۃ العرب) میں گزرے، وہیں 8 مئی 1884ء کو انتقال ہوا۔

حوالہ نمبر 89: اس سے مراد ہے حدیث : بدء الاسلام غریبا وسیعود کما بدء فطوبی للغربا (مسلم، کتاب الایمان: 232، ترمذی، کتاب الایمان: 13، ابن ماجہ، کتاب الفتن 15: وغیرہ)

حوالہ نمبر 90: الہلال کا پہلا شمارہ 13 جولائی 1912ء کو شائع ہوا، اور آخری نومبر 1914ء کو۔ اپنی نشاۃ ثانیہ میں یہ البلاغ کے نام سے 12 نومبر 1915ء کو پھر شروع ہوا۔ اس سلسلے کا آخری پرچہ (مشترکہ نمبر (16-15) 17-24 مارچ 1916ء کا ہے۔ تیسری مرتبہ یہ پھر الہلال کے نام سے جون 1927ء سے دسمبر 1927ء تک چھ مہینے شائع ہوتا رہا۔

حوالہ نمبر 91: یہ کوئی حدیث نہیں ہے، بلکہ قرآنی آیت کنتم خیر امۃ اخرجت للناس (آل عمران، 3:110) سے مستنبط ہے۔

حوالہ نمبر 92: اشارہ ہے سورۃ البینہ (98:7) کی طرف : اولئک ھم خیر البریۃ (وہ لوگ سب خلق سے بہتر ہیں)

حوالہ نمبر 93: یہ قرآن میں دو جگہ ہے : سورۃ البقرہ، 2:143 اور سورۃ الحج، 22:78 (لوگوں کے بتانے والے)

حوالہ نمبر 94: سورۃ النساء (4:135) میں ہے یا ایھا الذ ین امنوا کونوا قوامین بالقسط شھد آء للہ (اے لوگو جو ایمان لائے ہو

انصاف پر قائم رہو اور شہادت (گواہی) دو اللہ کے لیے)

حوالہ نمبر 95: دیکھیے، صحیح مسلم، کتاب صلوٰۃ المسافرین و قصرہا (269) مسلم کے علاوہ یہ حدیث ابن ماجہ (مقدمہ: 16) داری (کتاب الفضائل القرآن: 9) اور مسند حنبل (337:2) میں بھی ملتی ہے۔

حوالہ نمبر 96: دیکھیے، سنن ترمذی، کتاب ثواب المسافرین (14) یہ حدیث داری، کتاب الفضائل القرآن (1) میں بھی ہے۔

حوالہ نمبر 97: سورۃ المائدہ 4:5 (میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کردیا اور یوں تم پر اپنی نعمت تمام کردی)

حوالہ نمبر 98: سورۃ التوبہ 33:9، سورۃ الفتح 28:48، سورۃ الصف 9:61 (تاکہ تمام دینوں پر غالب کرے)

حوالہ نمبر 99: جامع ترمذی، کتاب الایمان، باب ماجاء فی افتراق ہذہ الامۃ

حوالہ نمبر 100: سورۃ الاسراء 5:17 (اور اس وعدے کو تو ہونا ہی تھا)

حوالہ نمبر 101: سورۃ المجادلہ 19:58 (قابو پا لیا ان پر شیطان نے اور بھلا دی انہیں اللہ کی یاد، وہ شیطان کا ٹولہ ہیں اور یاد رکھو کہ شیطان کا ٹولہ ہی گھاٹے میں رہنے والا ہے)

حوالہ نمبر 102: سورۃ التوبہ 102:9 (انہوں نے اچھے اور برے عمل خلط ملط کر دیے۔)

حوالہ نمبر 103: اشارہ ہے سورۃ یوسف (آیت 84) کی طرف: یا اسفی علی یوسف، یعنی وائے افسوس، یوسف پر

حوالہ نمبر 104: رانچی کی چار سالہ نظربندی: 7 اپریل 1916ء تا جنوری 1920ء

حوالہ نمبر 105: الخنساء کا شعر ہے (دیوان: 151) اور بھی کئی جگہ ملتا ہے

حوالہ نمبر 106: سورۃ الزخرف، 71:43 (جسے دل چاہتا ہے اور جس سے

آنکھیں لذت اندوز ہوتی ہیں)

حوالہ نمبر 107: سورۃ یوسف 12-100 (یہ میرے پہلے خواب کی تعبیر ہے، جسے میرے رب نے سچ کر دکھایا)

حوالہ نمبر 108: افسوس، شاعر کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔

حوالہ نمبر 109: دیکھئے اسی خطبے کا حاشیہ (89)

حوالہ نمبر 110: ابوداؤد (کتاب السنہ : 5) ترمذی (کتاب العلم : 16)، ابن ماجہ (مقدمہ 7)۔ اس کے علاوہ یہ سنن داری اور مسند ابن حنبل میں بھی ملتی ہے۔

حوالہ نمبر 111: مشہور حدیث ہے۔ موطا امام مالک (باب النہی عن قول فی القدر) میں رسولہ کی جگہ نبیہ ہے۔ مستدرک حاکم کتاب العلم) میں تمسکم کی جگہ اعتصم ہے۔

حوالہ نمبر 112: افسوس، شاعر کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔

حوالہ نمبر 113: ایضاً

حوالہ نمبر 114: سورۃ الاعراف۔ 42 (شکر ہے اللہ کا جس نے ہمیں اسے قبول کرنے کی ہدایت بخشی اور اگر اللہ ہمیں ہدایت نہیں دیتا، تو ہمیں کبھی ہدایت نہ ملتی)

حوالہ نمبر 115: سورۃ آل عمران 3:18 (اللہ نے شہادت دی کہ اسکے سوائے کوئی معبود نہیں ہے، اور فرشتوں نے اور صاحبان علم نے (بھی یہی کہا ہے کہ) وہی انصاف سے قائم ہے، کوئی اس اقتدار اور حکمت والے کے سوائے معبود نہیں ہے)

حوالہ نمبر 116: سورۃ المائدہ، 5:117 (میں تو (اسی وقت تک) ان پر نگاہ رکھ سکتا تھا، جب تک (خود) ان میں موجود تھا) آخری الفاظ " معلما وداعیا الی الحق " قرآن کے الفاظ نہیں۔ مولانا آزاد نے محض سیاق مکمل کرنے کو اپنی طرف سے لکھے ہیں۔

حوالہ نمبر 117: سورۃ النساء' 41:4 (اور کیا صورت ہوگی' جب ہم ہر ایک امت سے گواہ لائیں گے اور پھر تمہیں ان لوگوں سے متعلق بطور گواہ طلب کریں گے)

حوالہ نمبر 118: سورۃ حم السجدۃ' 53:41 (ہم انہیں اپنے نشان دنیا میں اور خود ان کے نفسوں میں دکھلائیں گے' حتیٰ کہ حق ان پر ٹھیک ظاہر ہو جائے۔)

حوالہ نمبر 119: سورۃ العنکبوت' 43:29 لفظ وتلک' آیت کا ٹکڑا نہیں ہے۔ آیت کے معنی ہیں۔ عقلمندوں کے سوائے کوئی نہیں سمجھتا۔

حوالہ نمبر 120: سورۃ البقرہ' 143:2 (اور یوں ہم نے تمہیں درمیانی امت بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہ بن سکو۔ اور رسول تم پر گواہی دینے والا رہے۔)

حوالہ نمبر 121: سورۃ الاحزاب 46-45:33 (ہم نے تجھے شہید اور خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے' جو (لوگوں کو) خدا کے حکم ہی سے اس کی طرف بلاتا ہے' چمکتے سورج کی طرح)

حوالہ نمبر 122: سورۃ السجدہ 16:32 (وہ اپنے رب کو (عذاب کے) ڈر سے اور (ثواب کے) لالچ میں پکارتے ہیں)

حوالہ نمبر 123: افسوس' شاعر کا نام معلوم نہیں ہو سکا

حوالہ نمبر 124: سعید بن المسیب۔ ابو محمد القرشی المخزومی' حضرت عمر کی خلافت کے دوسرے سال پیدا ہوئے۔ طبقہ تابعین میں ان کا بہت بلند مقام ہے۔ فقہ و حدیث میں' اور زہد و ورع میں ممتاز اقران تھے۔ بالخصوص اپنے خسر بزرگوار حضرت ابوہریرۃ کی احادیث اور قضایائے حضرت عمر کے حافظ شمار ہوتے تھے۔ خود انہوں نے بہت صحابہ کو دیکھا اور ان سے روایت کی اور ان سے بھی بہت لوگوں نے روایت کی۔ وہ امام زہری کے شیوخ میں سے ہیں۔ خود ان کا قول ہے کہ میں نے

چالیس حج کیے۔ اپنی حق گوئی کے باعث عہد بنوامیہ کے معتوبین میں سے تھے' آخر قید و بند تک نوبت پہنچی۔ 94ھ (713ء) میں رحلت کی (الاکمال فی اسماء الرجال' تذکرۃ الحفاظ 1:51-53' طبقات ابن سعد 5:58' وفیات (الاعیان) 1:206' حلیتہ الاولیا 2:161)

حوالہ نمبر 125: حضرت امام مالک بن انس' فقہ مالکی کے بانی۔ دراصل ان کا خاندان حمیری تھا۔ لیکن ان کے جداعلیٰ بنوتیم بن مرو قریش سے مل گئے تھے۔ امام مالک کی ابتدائی تعلیم سے متعلق کوئی تفصیل نہیں ملتی' لیکن یہ یقینی ہے کہ انہوں نے فقہ ربیعہ الرائی سے پڑھی۔ یہ علویوں اور عباسیوں کی کشاکش کا زمانہ تھا۔ محمد بن عبداللہ نے عباسی حکومت کے خلاف خروج کیا' تو امام مالک نے فتویٰ دیا کہ خلیفہ المنصور عباسی کی اطاعت ضروری نہیں ہے۔ لیکن انہوں نے عملاً اس سرکشی میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا۔ شورش فرو ہو جانے کے بعد انہیں سزا دی گئی۔ اسی سزا کے دوران میں ان کے شانے اکھڑ گئے تھے۔
مالک کا کوئی 85 سال کے سن میں 179ھ۔795-796ء میں مدینے میں انتقال ہوا۔ البقیع میں آسودۂ خواب ابدی ہیں۔ ان کی موطا اپنے اختصار کے باوجود حدیث کی معتبر کتابوں میں شمار ہوتی ہیں۔

حوالہ نمبر 126: امام احمد بن حنبل' فقہ' اہل سنت و الجماعت کے چوتھے امام' ربیع الثانی 164ھ دسمبر 780ء میں بغداد میں پیدا ہوئے۔ متعدد اساتذہ عصر سے تعلیم پائی اور اس کے لیے دور دور کے سفر کیے۔ تکمیل کے بعد بغداد میں حدیث کا درس دینے لگے۔ یہ خلیفہ المامون عباسی کا زمانہ تھا۔ اس نے معتزلہ کے اثر کے تحت مسئلہ خلق قرآن اٹھایا اور تمام علماء سے اس کی تصدیق پر اصرار کیا۔ امام احمد نے اس سے انکار کر دیا۔ اس پر قید و بند اور ظلم و ستم کا دور شروع ہو گیا' جو المامون کی وفات کے بعد اس کے جانشینوں' معتصم اور الواثق — کے

عہد تک جاری رہا۔ امام احمد کا انتقال ربیع الاول 241ھ ۔ جولائی 855ء میں ہوا۔ باب الحرب بغداد کے باہر مقابر الشہداء میں دفن ہوئے تھے' لیکن یہ قبرستان دجلہ کے سیلاب میں دریا برد ہوگیا۔ امام احمد کی مسند مشہور مجموعہ احادیث ہے' اس میں تقریباً تیس ہزار حدیثیں ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ اور رسائل بھی ان سے منسوب ہیں۔

حوالہ نمبر 127: معتصم باللہ۔ عباسی خلیفہ' ہارون الرشید کا منجھلا بیٹا' اپنے بڑے بھائی مامون کی وفات پر 38 سال کی عمر میں تخت نشین ہوا۔ (218ھ-833ء)۔ بڑا بہادر اور جنگجو آدمی تھا۔ ترک اسی کے زمانے میں کاروبار سلطنت میں دخیل ہوئے' جس کا نتیجہ بعد کو خطرناک نکلا۔ حال آنکہ معتصم کو علم و فن سے کوئی لگاؤ نہیں تھا اور اس کی دین سے دلچسپی بھی سرسری تھی' لیکن اس نے خلق قرآن کے مسئلے میں مامون کی وصیت پر عمل کیا اور امام احمد بن حنبل پر بہت سختی کی بلکہ اسے اس مسئلے میں بہت غلو ہوگیا تھا۔ حکم دے دیا کہ ابتدا ہی سے طلبہ کو خلق قرآن کی تعلیم دی جائے۔ تقریباً نو برس کی حکمرانی کے بعد 227ھ-841ء میں انتقال ہوا۔

حوالہ نمبر 128: سورۃ الاحقاف' 35:46 (جس طرح اولوالعزم رسولوں نے صبر کیا)

حوالہ نمبر 129: دیوان حافظ : 199

حوالہ نمبر 130: امام ابو حنیفہ' نعمان بن ثابت' اہل سنت والجماعت کے سرخیل' فقہ حنفی کے بانی' ان کے نسب سے متعلق روایات' مختلف ہیں۔ 80ھ-699ء کے قریب پیدا ہوئے۔ انہوں نے حماد ابن ابی سلمان سے فقہ کی تعلیم پائی اور اس کے انتقال (120ھ) کے بعد خود کوفہ میں مرجع خلائق ہوئے۔ فقہ میں ان کے رسوخ کا یہ نتیجہ ہوا کہ خلیفہ منصور عباسی نے انہیں بغداد کی قضاءت پیش کی۔ امام نے اسے

قبول کرنے سے انکار کر دیا' تو اس نے انہیں قید خانے میں ڈال دیا اور طرح طرح کی سختیاں کرنے لگا۔ اسی حالت میں 150ھ-767ء میں انتقال ہوگیا۔ بغداد ہی میں محلہ اعظمیہ میں مزار ہے۔ انہوں نے خود کوئی کتاب مرتب نہیں کی تھی' فقہ حنفی کی بنیاد ان کے دو شاگردوں --- قاضی ابو یوسف اور محمد شیبانی (صاحبین) کی تالیفات پر ہے۔

حوالہ نمبر 131: منصور عباسی۔ ابو جعفر عبداللہ بن محمد' عباسی خاندان کا دوسرا خلیفہ' اپنے بڑے بھائی عبداللہ السفاح کے بعد 41 سال کی عمر میں (136ھ-753ء میں) تخت نشین ہوا۔ اگرچہ عباسی حکومت سفاح کے زمانے ہی میں کافی مضبوط ہو گئی تھی' لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس کا استحکام منصور کے ہاتھوں ہوا' دارالخلافہ بغداد اسی کا بسایا ہوا ہے۔ اس نے اندرونی اور بیرونی سازشوں کا قلع قمع کر دیا' لیکن اندلس کی اموی حکومت بھی عبدالرحمان الداخل نے اسی کے عہد میں قائم کی۔ اس کا 63 سال کی عمر میں 22 سال کی حکمرانی کے بعد 158ھ -774ء میں حج کے سفر میں بیر معونہ کے مقام پر انتقال ہوا۔ منصور کو علوم اور تصنیف و تالیف کا خاص شوق تھا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ اس کے زمانے میں مختلف علوم میں بیش بہا کتابیں لکھی گئیں۔

حوالہ نمبر 132: امام شافعی۔ ابوعبداللہ محمد بن ادریس ' فقہ شافعی کے بانی' قریشی' ہاشمی' حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور سے رشتے دار تھے۔ 150ھ - میں غزہ میں پیدا ہوئے۔ کم سنی میں والد کی وفات کے باعث ابتدائی زمانہ بہت عسرت میں گزرا۔ عربی زبان اور ادب جاہلی انہوں نے بدوؤں سے حاصل کیا اور فقہ و حدیث مسلم الزنجی اور سفیان بن عیینہ سے۔ انہیں موطا امام مالک زبانی یاد تھی۔ بعد کو وہ مدینے میں امام مالک کی خدمت میں بھی کئی سال تک رہے۔ پہلے وہ یمن میں سرکاری ملازم ہوکر گئے تھے' لیکن یہاں انہوں نے علویوں کی خلاف

حکومت سرگرمیوں میں حصہ لیا' تو گرفتار کرکے پابجولاں خلیفہ ہارون الرشید کے سامنے لائے گئے۔ بارے ہارون الرشید نے انھیں معاف کردیا۔ اسکے بعد ان کا زیادہ زمانہ عراق' مصر اور حجاز کے سفروں میں گزرا۔ بالآخر 200ھ -815-816 میں وہ قاہرہ میں مقیم ہوگئے۔ یہیں چار برس بعد سلخ رجب 204ھ۔ 20 جنوری 820ء کو فسطاط (قاہرہ) میں واصل حق ہوئے۔ مدفن المقطم پہاڑی کے دامن میں ایک خاص احاطے میں ہے۔ یزار و یتبرک۔ متعدد کتابیں ان سے یادگار ہیں' لیکن ان کی اصلی تعلیم کتاب الام میں ہے۔ ان کے کئی رسالے جو الگ الگ شائع ہوئے ہیں۔ وہ دراصل اسی کتاب الام کے حصے ہیں۔

حوالہ نمبر 133: شیخ الاسلام احمد ابن تیمیہ۔ ان کے حالات کے لیے دیکھئے تذکرہ (حواشی) 381-382 (ساہیہ اکاڈیمی' ایڈیشن)

حوالہ نمبر 134: شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی' شیخ فاروقی' سرہند میں 971ھ -1564ء میں پیدا ہوئے۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد دارالخلافہ آگرہ آئے۔ یہ اکبری بدعتوں اور اختراعوں کا زمانہ تھا۔ ابوالفضل اور ان کے بڑے بھائی فیضی سے ان کے مراسم پیدا ہوئے' جس نے ان کے خیالات پر گہرا اثر کیا۔ انھوں نے شیعی عقائد کی مخالفت شروع کی' جن کا شاہی دربار میں دور دورہ تھا' وہ خود حضرت خواجہ باقی باللہ کے سلسلہ نقشبندیہ میں مرید تھے۔ ان کی ان مخالفانہ تحریروں سے دربار جہانگیر کے شیعی امراء نے ناراض ہوکر بادشاہ کے کان بھرے' جس پر یہ 1028ھ - 1619ء میں قلعہ گوالیار میں قید کردیے گئے۔ سال بھر بعد نہ صرف جہانگیر نے انھیں آزاد کردیا' بلکہ اپنی فوجوں کے ساتھ رہنے کا حکم دیا۔ 1034ھ - 1624ء میں انتقال ہوا۔ سرہند میں مزار مرجع خواص و عوام ہے۔ ان کے مکتوبات کے مجموعے علوم کا خزانہ ہیں۔ ان کے علاوہ متعدد رسائل مختلف موضوعات پر چھپ چکے ہیں۔

حوالہ نمبر 135: جہانگیر۔ خاندان مغلیہ کا مشہور فرمانروا' 30 اگست 1569ء کو سیکری میں پیدا ہوا اور اپنے والد اکبر کی وفات پر 24 اکتوبر 1605ء کو تخت پر بیٹھا کشمیر سے واپس آرہا تھا کہ بھیمبر کے مقام پر 7 نومبر 1627ء کو وفات پائی۔ مقبرہ لاہور کے قریب شاہدرہ میں ہے۔

حوالہ نمبر 136: یہ مشہور متفق علیہ حدیث بخاری (کتاب الاعتصام بالسنہ نیز کتاب الانبیاء) اور مسلم (کتاب العلم) کے علاوہ تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ ترمذی (کتاب الفتن) اور ابن ماجہ (کتاب الفتن) میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ آخر کے الفاظ کی دوسری مشہور قرات شبر بشبر بھی ہے۔

حوالہ نمبر 137: اشارہ ہے غالباً فمن اتقی الشبہات استبراء کی طرف دیکھئے' بخاری (کتاب الایمان) مسلم (کتاب المساقاۃ و المزارعۃ)۔ اس کے علاوہ یہ حدیث ابوداؤد' ابن ماجہ اور دارمی کے ہاں بھی ہے۔

حوالہ نمبر 138: ابن ماجہ' مقدمہ : 8- اسکے علاوہ دارمی کے مقدمہ (17) میں بھی ہے۔

حوالہ نمبر 139: ابوداؤد (کتاب الملاحم) میں الفاظ ہیں : وما الوھن قال حب الدنیا و کراھیۃ الموت۔ یہ حدیث مسند حنبل (5 : 278) میں بھی ہے۔

حوالہ نمبر 140: دیکھئے اسی خطبے کا حاشیہ (97)

حوالہ نمبر 141: یہ مشہور حدیث ابوداؤد (کتاب الملاحم : 5) کے علاوہ مسند حنبل میں بھی ملتی ہے۔ (2: 88)

حوالہ نمبر 142: ترمذی کے علاوہ یہ حدیث بعض دوسرے مجموعوں میں بھی ملتی ہے۔ مثلاً بخاری (کتاب الجہاد و کتاب الاحکام)' مسلم (کتاب الامارۃ)' ابوداؤد (کتاب الجہاد) وغیرہ۔

حوالہ نمبر 143: خفیف اختلاف الفاظ کے ساتھ یہ حدیث صحیح مسلم

(کتاب الصلوۃ 62) کتاب المساجد : 26) اور مسند ابن حنبل (24:3، 53:5) میں ملتی ہے۔

حوالہ نمبر 144: حدیث مسلم کے الفاظ ہیں : اذا کانوا ثلاثہ فلیومھم احد ھم (کتاب المساجد و مواضع الصلاۃ) اس کے علاوہ یہ مسند ابن حنبل میں بھی ملتی ہے۔ (34:3، 53:5)

حوالہ نمبر 145: سورۃ الزمر، 45:39 (بند ہو جاتا ہے دھڑکتا، ان لوگوں کے دل کا، جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے)

حوالہ نمبر 146: دونوں شعر نظیری کے ہیں (دیوان نظیری نیشا پوری : 187) مطبوعہ دیوان میں شعر اول کے مصرع ثانی میں "رود" کی جگہ "رسد" ہے اور شعر دوم کے مصرع اول میں الفت کی جگہ غیرت اور نظر در کن کی جگہ تماشا کن اور مصرع ثانی میں تن با کی جگہ باتن ملتا ہے۔ دیوان کے نسخہ لاہور (مبارک علی) میں پنہانش کی جگہ پہنایش ملتا ہے۔

حوالہ نمبر 147: ابوالعلا المعری کا شعر ہے (شروح سقط الزند 3 : 1228) دیوان میں بالخیف کی جگہ بالحزن ہے۔

حوالہ نمبر 148: سورۃ النجم 28:53 (اور حق کے مقابلے میں ظن کی کوئی حقیقت نہیں ہے)

حوالہ نمبر 149: سورہ ابراہیم، 20:14، نیز سورہ فاطر، 17:35 (اور یہ بات اللہ کے لیے کیا مشکل ہے)

حوالہ نمبر 150: مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد۔ 1299ھ (1882ء) میں پنہسہ (ضلع پٹنہ، بہار) میں پیدا ہوئے اچھے خاصے خوشحال خاندان کے فرد تھے، لیکن افتاد طبع کے صدقے کبھی جائیداد کی دیکھ بھال نہ کی۔ نجی تعلیم کے بعد مدرسہ اسلامیہ، بہار میں پڑھتے رہے۔ دارالعلوم دیوبند بھی گئے، لیکن چھ مہینے بعد ہی یہاں سے جی اچاٹ ہوگیا۔ کچھ مدت بعد وطن واپس آئے، تو گیا میں مدرسہ انوار العلوم قائم کیا۔ آدمی مجاہد

اور سراسر عملی تھے' سینے میں دل دردمند تھا۔ جمعیت العلماء ہند کے قیام (1919ء) سے پہلے بھی 1917ء میں انجمن علمائے بہار قائم کی' 1921ء میں امارت شرعیہ بہار کی تشکیل کی' جو آج تک سرگرم کار ہے۔ اور اس میں بیت المال' دارالقضاء' دارالافتاء' شعبہ تنظیم و تبلیغ' شعبہ تحفظ المسلمین وغیرہ پوری مستعدی سے کام کر رہے ہیں۔

1930ء میں جمعیت العلماء ہند نے ایک جنگی کونسل بنائی تھی' اس کے روح رواں بھی مولانا محمد سجاد ہی تھے۔ انہوں نے بہار میں ایک نئی انڈی پنڈنٹ پارٹی بنائی تھی' جس نے 1936ء کے انتخاب میں حصہ لیا' کانگرس کے بعد سب سے زیادہ اسی کے امیدوار کامیاب ہوئے تھے اور جب کانگریس نے وزارت بنانے سے انکار کر دیا' تو انڈی پنڈنٹ پارٹی ہی نے وزارت کی تشکیل کی تھی۔

ان کی حب الوطنی اور معاملہ فہمی اور آزادہ روی کے سب قائل تھے۔

18 نومبر 1940ء (17 شوال 1359ھ) کو انتقال کیا۔ پھلواری شریف (پٹنہ) میں دفن ہوئے۔

6- خطبہ صدارت: جمعیتہ العلمائے ہند

حوالہ نمبر 1: یہ ایک طرح سے اس سے پیشتر کے خطبے ہی کا آخری حصہ ہے۔ ہوا یہ کہ مجلس استقبالیہ کے اصرار پر مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنا خطبہ قلمبند کر کے ان کے پاس بھیج دیا' جو چھپ گیا' اور اجلاس میں تقسیم ہوا اور پڑھا گیا۔ لیکن مولانا کی جولانی طبع اس پر قانع نہ رہ سکی۔ مطبوعہ خطبے کے اختتام کے بعد' انہوں نے اس خطبے (6) سے فی البدیہہ حاضرین کو خطاب کیا۔

حوالہ نمبر 2: حسرت موہانی۔ حضرت امام علی موسیٰ رضا کی نسل میں' سید اظہر حسن کے بیٹے' سید فضل الحسن حسرت موہانی' اردو غزل کے

مشہور شاعر' سیاست کے میدان میں بھی کچھ کم ممتاز نہیں تھے۔ 1875ء میں موہان' ضلع اناؤ (یو پی) میں پیدا ہوئے۔ 1903ء میں ایم اے او کالج' علی گڑھ سے بی اے کی سند لی۔ اس کے بعد اردوئے معلی ماہنامہ جاری کیا۔ سیاست سے دلچسپی کالج کے زمانے سے تھی' چنانچہ اس میں ادبی مضامین کے علاوہ سیاسی مضمون بھی شائع ہونے لگے۔ ایسا ہی ایک مضمون حکومت وقت کی نظر میں قابل اعتراض ٹھہرا۔ مقدمہ چلا اور انہیں سزائے قید ہوگئی۔

ساری عمر مجاہدانہ اور درویشانہ گزری۔ مذہب اور تصوف سے بھی بے حد شغف تھا۔ آخری عمر میں کئی سال تک بلا ناغہ متواتر حج کیے' اور بیشتر پاپیادہ۔ ایسا بے غرض اور بے ریا آدمی دیکھنے میں نہیں آیا۔ 13 مئی 1951ء کو اللہ کو پیارے ہوئے۔ انوار باغ' فرنگی محل' لکھنؤ میں اپنے پیر مولانا عبدالوہاب کے پائیں سپرد خاک ہوئے۔

7- اجلاس خصوصی' انڈین نیشنل کانگریس

حوالہ نمبر 1: عصمت انونیو - مشہور ترکی فوجی جرنیل اور سیاستدان' 24 ستمبر 1884ء کو ازمیر (سمرنا) میں پیدا ہوئے۔ پہلی عالمی جنگ (1914-1918) میں شاندار خدمات کے باعث وہ اتاترک مصطفیٰ کمال پاشا کے دست راست بن گئے۔ یونان کے خلاف لڑائی میں فوج کی کمان انہیں کے ہاتھ میں تھی۔ اور انہوں نے 1921ء میں انونیو کے مقام پر انہیں دو مرتبہ شکست فاش دی (اسی لیے بعد کو انہوں نے انونیو کو اپنے نام کا جزو بنا لیا) ترکی کی طرف سے لوزان کے صلح نامے پر انہیں نے دستخط کیے تھے۔ جب خلافت کی تنسیخ کے بعد ترکی جمہوریہ بن گیا' تو وہ اس کے پہلے وزیراعظم مقرر ہوئے (1923ء) لیکن صحت کی خرابی کے باعث انہیں سال بھر بعد مستعفی ہونا پڑا۔ چندے بعد وہ دوبارہ

وزیراعظم بنا دیے گئے (1937-1925) اس کے بعد 1938ء سے 1950ء تک وہ صدر جمہوریہ ترکی رہے۔ 1961ء میں وہ تیسری مرتبہ وزیراعظم بنے اور چار سال تک اس عہدے پر متمکن رہے۔ ان کا 25 دسمبر 1973ء کو انقرہ میں انتقال ہوا اور تین دن بعد اتاترک کے مقبرے میں دفن ہوئے۔

حوالہ نمبر 2: کرزن، جارج نتھانیل، مارکوئیس کرزن آف کڈلیسٹن۔ مشہور انگریز سیاستدان اور ہندوستان کا وائسرائے، 11 جنوری 1859ء کو پیدا ہوا۔ 1886ء میں برطانوی پارلیمنٹ کا رکن چنا گیا۔ 1887ء میں اس نے ایشیائی اور مشرقی ممالک کا طویل سفر کیا۔ اس کی تین مشہور کتابیں اسی سیروسیاحت کا ثمرہ ہیں : ایشیائی روس (1889ء)، ایران (1892ء) مشرق بعید کے مسائل (1894ء) اب وہ وزارت خارجہ میں داخل ہوگیا۔ اس کی قابلیت اور معاملہ فہمی کا یہ ادنیٰ ثبوت ہے کہ 1898ء میں جب اس کی صرف 39 برس کی عمر تھی، وہ ہندوستان کا وائسرائے مقرر ہوا۔ یہاں اس کا دور حکومت کئی لحاظ سے بہت اہم رہا۔ نظام حکومت میں کئی اصلاحات نافذ ہوئیں۔ فرنٹیر کا صوبہ اسی نے بنایا تھا۔ بنگال کی تقسیم (پہلی) بھی اسی کے زمانہ حکومت میں ہوئی تھی۔ (1905ء)۔ سپہ سالار افواج ہند لارڈ کچنر سے اختلاف کے باعث اسے مستعفی ہونا پڑا اور وہ انگلستان واپس چلا گیا۔ (1905ء)۔ پہلی جنگ عظیم (1914ء-1918ء) میں وہ لائڈ جارج کی وزارت میں شامل تھا اور جنگ کے بعد 1919ء میں وزیر خارجہ مقرر ہوا۔ لوزان کے صلح نامے پر انگریزوں کی طرف سے اسی نے دستخط کیے تھے۔ وہ بلاشبہ اپنے زمانے کے قابل ترین اشخاص میں سے تھا۔

20 مارچ 1925ء کو انتقال ہوا۔

حوالہ نمبر 3: ولسن تامس ووڈرو : 28 دسمبر 1856ء کو سٹان ٹن (ریاست

ورجینیا) کے مقام پر پیدا ہوا۔ چندے وکالت کی، لیکن پھر معلمی پیشہ اختیار کرلیا۔ بعد کو سیاست میں داخل ہوگیا۔ 1902ء میں، اور پھر 1916ء میں ڈیمو کریٹک پارٹی کے امیدوار کی حیثیت سے ریاست ہائے متحدہ امریکا کا صدر منتخب ہوا۔ پہلی جنگ عظیم (1914-1918) اسی کی صدارت کے زمانے میں ہوئی تھی۔ اس سے پہلے امریکا ہمیشہ یورپ کے لڑائی جھگڑے سے الگ تھلگ رہا تھا۔ اس جنگ میں امریکا کی شمولیت بہت حد تک ولسن کے ذاتی اثر کا نتیجہ تھی۔ جنگ کے بعد صلح کی گفت و شنید میں اس کا بہت حصہ رہا اور اس کے چودہ نکات اس کی بنیاد قرار پائے۔ پہلی جمعیتہ اقوام (لیگ آف نیشنز) کی تشکیل بھی اسی کی مرہون منت ہے، لیکن بحیثیت مجموعی وہ بہت ناکام رہا۔ کئی کتابیں بھی تصنیف کیں۔ ان میں سے بیشتر قانون کے موضوعات پر ہیں۔ بقیہ میں سے جارج واشنگٹن کی سوانح عمری (1896ء) اور امریکی قوم کی ایک تاریخ (1902ء) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

حوالہ نمبر 4: وہ وعدے یا عہدنامے جو کوئی ملک غیرملکی حکومتوں یا ان کی رعایا کو اپنے ہاں خاص حقوق یا مراعات و اختیارات عطا کرنے کو کرتا ہے۔ خلافت عثمانیہ کے زمانے میں جب ترکی کمزور تھا، اس نے بھی متعدد یورپی ممالک کے ساتھ ایسے معاہدے کرر کھے تھے۔ اتاترک نے برسراقتدار آتے ہی یہ سب منسوخ کردیے تھے۔

حوالہ نمبر 5: مصطفیٰ کمال، اتاترک : 1881ء میں سالونیکا میں پیدا ہوئے۔ 1909ء میں ترکی نوجوانوں نے جو قومی تحریک ملکی اصلاحات کی شروع کی تھی، وہ اس کے سربراہ تھے۔ 1914ء - 1918ء کی عالمی جنگ میں وہ ترکی فوج کے جرنیل تھے۔ جنگ کے خاتمے کے بعد انہوں نے خلافت منسوخ کردی اور ترکی کو جمہوریہ میں تبدیل کردیا، وہ خود اس کے پہلے صدر منتخب ہوئے۔ انہوں نے ملک کے نظم و نسق میں بہت اہم

تبدیلیاں کیں اور اسے عصری تقاضوں اور ضرورتوں کے مطابق منظم کرنے کی کوشش کی۔ وہی موجودہ ترکی کے بانی اور معمار ہیں۔

10 نومبر 1938ء کو انتقال ہوا۔

حوالہ نمبر 6: گاندھی، موہن داس کرم چند (مہاتما) : ولادت : پور بندر، 2 اکتوبر 1869ء وفات : دلی، 30 جنوری 1948ء (ایک قاتل کی گولی کا نشانہ بنے)

حوالہ نمبر 7: عمر خیام : تقریباً 1050 ء میں پیدا ہوئے۔ حقیقت یہ ہے کہ شاعری ان کے دون مرتبہ ہے، اگرچہ آج ان کی شہرت کا ایوان ان کی رباعیات کی بنیاد ہی پر قائم ہے، وہ ہیئت دان اور ماہر ریاضی کی حیثیت سے کچھ کم قابل ذکر نہیں۔ حقیقتاً وہ مغربی ممالک میں ریاضی کے عالم کی شکل میں متعارف تھے۔ جب 1859ء میں فٹ جیرالڈ نے ان کی 75 رباعیوں کا انگریزی ترجمہ شائع کیا۔ اس کے بعد ان کی شہرت رباعی نگار کی حیثیت میں کہیں زیادہ ہوگئی۔

1123ء میں نیشاپور میں انتقال ہوا۔

حوالہ نمبر 8: وکٹر ہیوگو : فرانسیسی شاعر، ناول نگار اور فلسفی، 26 فروری 1802ء کو پیدا ہوا۔ اس کے والد جرنیل جوزف لیوپولڈ ہیوگو، نپولین اعظم کے بھائی جوزف نپولین کے درباریوں میں تھے، جو پہلے ناپولی اور بعد کو اسپین کے حکمران بنے۔ چنانچہ وکٹر بھی بچپن میں ان کے ساتھ اسپین گیا اور دس برس کی عمر تک اس کی تعلیم وہیں ہوئی۔ اس کے بعد حالات کی مجبوری سے خاندان واپس پیرس چلا آیا۔ یہاں اس کی تعلیم پر خاطر خواہ توجہ نہ دی جا سکی۔ بالآخر اسے اسکول بھیجا گیا۔ یہاں اپنی صغر سنی کے باوجود اس نے ایسی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا کہ لوگ دنگ رہ گئے۔ چودہ برس کی عمر میں وہ شعر اور نثر لکھنے لگا۔ اس کی 15 برس کی عمر تھی کہ اس کی ایک نظم پر فرانس کی اکیڈمی نے خوشنودی کا

اظہار کیا' اور دو سال بعد 17 برس کی عمر میں اسے نظم کا اول انعام ملا۔ اس کی بعض کتابیں دنیا کے کلاسیکی ادب میں شمار ہوتی ہیں مثلاً کے مزیرابل' نوٹردام کا کبڑا' ہنسنے ہنسانے والا وغیرہ' اس کی متعدد کتابوں کا اردو ترجمہ ہو چکا ہے۔ 31 مئی 1885ء کو پیرس میں انتقال ہوا۔

حوالہ نمبر 9: ابن خلدون' عبدالرحمٰن : عرب مورخ اور ماہر معاشیات 27 مئی 1332ء کو ٹیونس میں پیدا ہوا۔ اس کا خاندان حضر موت سے ہجرت کر کے اشبیلیہ (اندلس) میں بس گیا تھا۔ شروع میں وہ چندے سلطان فیض کی ملازمت میں رہا۔ لیکن یہاں اس پر خیانت کا الزام لگایا گیا جس پر اسے دو برس قید خانے میں بسر کرنے پڑے۔ رہائی کے بعد وہ غرناطہ چلا گیا۔ اس نے زندگی کے بہت نشیب و فراز دیکھے اور انجام کار قاہرہ میں مستقل سکونت اختیار کر لی' جہاں وہ کئی مرتبہ قاضی القضاۃ کے عہدے پر فائز رہا۔ یہیں اس کا 19 مارچ 1406ء کو انتقال ہو گیا۔
اس کی شہرت کا ایوان مقدمہ پر قائم ہے' جو دراصل اس کی بڑی تصنیف "کتاب العبر" کا دیباچہ ہے۔ مقدمے کا دنیا کی بیشتر زبانوں میں ترجمہ ملتا ہے۔ اس میں اس نے بڑی ژرف نگاہی اور غور و فکر سے قوموں کے عروج و زوال کا فلسفہ بیان کیا ہے' جو تحقیق و فلسفہ' جدید سے بھی اتنا قریب اور صحیح ہے کہ حیرت ہوتی ہے کہ آج سے ساڑھے چھ سو برس پہلے یہ باتیں اس کے دماغ میں کیونکر آئیں۔ جب کہ نتائج اخذ کرنے کے لیے اتنا کم مواد مہیا تھا۔

حوالہ نمبر 10: لی بان' گستاو : مشہور فرانسیسی طبیب اور نفسیات اجتماعی کا ماہر' 7 مئی 1841ء کو پیدا ہوا۔ اس نے زندگی طبیب کی حیثیت سے شروع کی۔ 1884ء میں وہ بدھ مت کے آثار قدیمہ کی تحقیق کے لیے ہندوستان آیا۔ واپسی پر اس نے ایک کتاب لکھی : آثار الہند (فرانسیسی)' جو 1891ء میں شائع ہوئی۔ اسی دوران میں اس نے نفسیات

اجتماعی کا مطالعہ شروع کیا اور اس کے بعد اس موضوع پر متعدد کتابیں تصنیف کیں' جن میں سے بعض کا انگریزی میں بھی ترجمہ ہوا ہے۔ اس کا نظریہ یہ تھا کہ بعض قوموں میں کچھ خصوصیات ایسی ہوتی ہیں کہ وہ لامحالہ ترقی کی دوڑ میں دوسروں سے آگے نکل جاتی اور بالآخر ان پر حکمران بن جاتی ہیں۔ وہ تاریخ اور تمدن کے ارتقاء میں جذبات کی اہمیت کا قائل تھا۔ عام طور پر بعد کے علماء نے اس کے نظریوں کی تردید کی ہے' لیکن اس کی کتابیں' غالباً اپنی جدت کے باعث بہت دن تک فرانس اور یورپ کے دوسرے ممالک میں مقبول رہیں۔

اس کا 13 دسمبر 1931ء کو پیرس کے مضافات کے ایک قصبے میں انتقال ہوا۔

حوالہ نمبر 11: Psychology نفسیات

حوالہ نمبر 12: ہرمن: اس سے غالباً ہرمن رائش ناوی مراد ہے' جو بعض اوقات ہرمن لنگ بھی کہلاتا ہے۔ وہ ایک امیر گھرانے میں 1013ء میں پیدا ہوا۔ وہ اپنے زمانے کا ممتاز عالم اور مورخ تھا۔ تعلیم ختم کرنے کے بعد اس نے دنیا ترک کر دی' اور راہب بن کر "رائش نو" کے راہب خانے میں رہنے لگا۔ اپنے زمانے کے دانشوروں اور عالموں پر اس کا بہت اثر تھا۔ اس نے 24 ستمبر 1054ء کو رحلت کی۔

اس نے کئی مذہبی رسالے لکھے ہیں۔ اس کے علاوہ اسے ریاضی' ہیئت اور موسیقی سے بھی بہت شغف تھا۔ وہ خود گھڑیاں اور دوسرے آلے وغیرہ بنا لیتا تھا۔

اس کی سب سے مشہور کتاب (لاطینی) "1054ء تک کے حالات" ہے (بعد کو اس کے شاگرد برتولڈ نے 1066ء تک کے حالات مرتب کر کے اس میں شامل کر دیے تھے) اس کا ترجمہ مختلف زبانوں میں ہو چکا ہے۔ مولانا آزاد غالباً اسی کتاب کا حوالہ دے رہے ہیں۔

حوالہ نمبر 13: باردولی : یہاں باردولی سے اشارہ ہماری تحریک آزادی کے ایک اہم واقعے کی طرف ہے:

آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس دلی منعقدہ نومبر 1921ء میں یہ قرارداد منظور ہوئی تھی کہ گاندھی جی کی قیادت میں ملک گیر سول نافرمانی کی تحریک چلائی جائے اور اسکا آغاز باردولی سے ہو۔ (جو کہ صوبہ بمبئی میں ضلع سورت کی ایک تحصیل تھی) بعد کو کانگریس کے سالانہ اجلاس احمد آباد (دسمبر 1921ء) نے اس کی توثیق کر دی۔

اس قرارداد کے مطابق اواخر جنوری 1922ء میں اس تحریک کا آغاز ہا۔ بدقسمتی سے جلد ایک افسوسناک واقعہ رونما ہوا' جس سے یہ تحریک واپس لینا پڑی۔

5 فروری (1922ء) کو کانگریس کا ایک جلوس چورا چوری کے مقام پر (جو گورکھپور (یوپی) کے قریب ایک قصبہ ہے) جارہا تھا کہ سامنے سے پولیس کے کچھ افراد آگئے' ان میں 21 سپاہی تھے اور ایک تھانیدار۔ ہجوم نے ان کا پیچھا کیا جس پر پولیس کے لوگوں کو تھانے کی عمارت میں پناہ لینا پڑی۔ بھیڑ نے چوکی کو آگ لگا دی جس میں تمام سپاہی اور تھانیدار جل کر راکھ ہوگئے۔

قدرتاً" گاندھی جی کو کو تشدد کے ان واقعات سے بہت صدمہ ہوا کہ یہ ان کے بنیادی اصولوں کے خلاف تھے۔ اس کے علاوہ انہی دنوں بمبئی اور مدراس میں بھی اسی طرح کے تشدد کے حادثات پیش آچکے تھے۔

اس پر انھوں نے 12 فروری 1922ء کو باردولی میں کانگریس کی مجلس عاملہ کا جلسہ بلایا' جس نے گاندھی جی کی تجویز پر تحریک کے منسوخ کرنے کی قرارداد منظور کرلی۔

کانگریس اور گاندھی جی کے اس اقدام پر لوگوں کو بہت مایوسی ہوئی تھی۔ بعض رہنماؤں نے (مثلاً پنڈت موتی لال نہرو' لالہ لاجپت رائے

وغیرہ) گاندھی جی پر اعتراض کیا تھا کہ اگر کسی جگہ کے لوگوں نے غلطی کی ہے' تو اس کے لیے پورے ملک کو کیوں سزا دی جائے (تاریخ کانگریس (انگریزی)' 1:233-237)

حوالہ نمبر14: نون کواپریشن 'Non Co-operation' ترک موالات

حوالہ نمبر15: کواپریشن Co-operation موالات

حوالہ نمبر16: سول ڈس اوبیڈینس Civil Dis-obedience سول نافرمانی۔

حوالہ نمبر 17: سقراط' مشہور یونانی حکیم اور فلسفی' تقریباً 470 قبل مسیح پیدا ہوا۔ اس نے خود کچھ نہیں لکھا' لیکن اس کے شاگرد رشید افلاطون نے اپنے مکالمات میں سقراط کے فلسفے کو خاصی تفصیل سے بیان کر دیا ہے۔ اگرچہ بعض اصحاب نے شبہ ظاہر کیا ہے کہ یہ افلاطون کے اپنے خیالات اور نظریات ہیں' جو اس نے سقراط سے منسوب کر دیے ہیں۔

399 قبل مسیح اس پر (1) قوم کے نوجوانوں کو گمراہ کرنے اور (2) دیوتاؤں سے بے پروائی برتنے اور (3) مذہبی بدعتوں کے ارتکاب کے الزام میں مقدمہ چلا۔ عدالت نے موت کی سزا دی اور اس نے زہر کا پیالہ پی لیا' حال آنکہ اس کے دوستوں نے اس کے قیدخانے سے فرار کا انتظام کرلیا تھا۔ اس کا جواب تھا: فیصلہ حقائق کے خلاف ہے' لیکن چونکہ یہ ایک جائز اور قانونی عدالت نے دیا ہے' اس لیے اس کی تعمیل لازمی ہے۔

حوالہ نمبر 18: "یروشلم کی صلیب" سے حضرت عیسیٰ مسیح کے واقعہ صلیب کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ انھوں نے صداقت کے ترک کرنے کے مقابلے میں سولی پر لٹکنا قبول کرلیا۔

حوالہ نمبر 19: "مکے کی گلیوں" سے وہ مظالم مراد ہیں' جو رسول اسلام

صلعم کے مخالفوں نے ان پر تیرہ برس کے قیام مکہ میں اس لیے توڑے کہ وہ اپنی دعوت سے دست بردار ہو جائیں۔ انھوں نے سمجھوتہ کرنے سے انکار کر دیا' اور آخرکار انھیں 622ء میں ہجرت کر کے مدینہ جانا پڑا۔

حوالہ نمبر 20: سیویرس : لوسی اس سپٹی میس سیوریس ان کا پورا نام تھا۔ روما کے شہنشاہ تھے۔ انھوں نے ایسی ہوشیاری سے کام لیا کہ لوگوں کو انھیں بادشاہ تسلیم کرنے کے سوائے کوئی چارہ نہ رہا۔ ہوا یہ کہ جب مارچ 193ء میں شہنشاہ پر ٹی ٹیکس کو فوجیوں نے قتل کر دیا' تو جولیانوس نے شہنشاہیت کا خلعت خرید لیا۔ جونہی سیوریس کو اس کی خبر ملی' انھوں نے ٹھان لی کہ وہ جولیانوس کو تخت سے اتار دیں گے۔ اس کے لیے انھوں نے اول اسلبی نوس سے گٹھ جوڑ کیا' جو روما کی برطانی فوجوں کی کمان سنبھالے ہوئے تھے۔ اس کے بعد انھوں نے روما پر چڑھائی کر دی۔ جب روما میں جولیانوس کے ساتھیوں کو سیوریس کی تاخت کی اطلاع ملی' تو انھوں نے جولیانوس کا ساتھ چھوڑ دیا' اور اسے قتل کر دیا۔ اس طرح میدان صاف ہو گیا اور سیوریس فاتحانہ روما میں داخل ہو گئے۔ لیکن جب تک اسلبی نوس زندہ تھا' وہ بلا شرکت غیرے روما کے شہنشاہ نہیں بن سکتے تھے۔ اولاً انھوں نے اسے قتل کرانے کی کوشش کی۔ جب اس میں ناکام رہے تو اس کے خلاف لڑائی چھیڑ دی۔ جس میں نہ صرف اسلبی نوس کو شکست ہوئی' بلکہ وہ میدان میں کام آیا۔ اس کے بعد کوئی مدمقابل نہ رہا۔ اور وہ چین سے حکومت کرنے لگے۔

اس کے بعد انھوں نے ایشیا کا بیشتر علاقہ فتح کر کے اپنی سلطنت میں ملا لیا۔ وہ اسکندریہ میں تھے کہ انھیں برطانیہ میں بغاوت کی خبر پہنچی۔ وہ واپس آئے اور سرکشی کو فرو کر کے انھوں نے جزیرے کے شمال میں

ایک سد تعمیر کرا دی تاکہ کولونی فوجیں آسانی سے حملہ نہ کر سکیں۔ لیکن اب لمبے عرصے تک کثرت کار کے باعث ان کی صحت خراب رہنے لگی۔ بالآخر تقریباً اٹھارہ سال کی حکومت کے بعد 4 فروری 211ء کو ان کا 66 سال کی عمر میں انتقال ہوا۔ ان کا قول تھا کہ میں نے اپنی زندگی میں سب کچھ کیا اور دیکھا' جس کی کسی انسان کو تمنا ہو سکتی ہے' لیکن اس کے باوجود میں بالکل ہیچ ہوں۔

حوالہ نمبر 21: ترتولین : آگسٹین کے بعد عیسائی کلیسا کے بارے میں لکھنے والا سب سے بڑا مصنف۔ تقریباً 150ء میں قرطاجنہ (شمالی افریقہ) میں پیدا ہوا۔ بہت اعلیٰ تعلیم پائی۔ اسے لاطینی اور یونانی — اس زمانے کی علمی زبانیں — دونوں پر ماہرانہ قدرت حاصل تھی۔ آج عیسائیت سے متعلق جو کچھ لاطینی زبان میں ہے' اس کا سلسلہ بہت حد تک اس کی تحریروں میں ملتا ہے۔ اس کی موت تقریباً 222ء میں ہوئی۔

حوالہ نمبر 22: Conflict Between Religion and Science. ڈریپر کی مشہور تصنیف ہے۔ اس کا اردو ترجمہ مولانا ظفر علی خان نے معرکہ مذہب و سائنس کے عنوان سے کیا تھا' یہ چھپ چکا ہے۔

حوالہ نمبر 23: ٹالسٹائی' کاؤنٹ لیونکو لائیوچ : ولادت' یسنا پولیانا 28 اگست (9 ستمبر) 1828ء' وفات' یسنا پولیانا نومبر 1910ء۔ تفصیلی حالات کے لیے دیکھئے غبار خاطر (ساہتیہ اکاڈمی ایڈیشن) = 343-344

حوالہ نمبر 24: Protest = احتجاج

حوالہ نمبر 25: روزویلٹ۔ اس سے امریکا کے صدر تھیوڈور' روز ویلٹ مراد ہیں' جو 27 اکتوبر 1858ء کو نیویارک میں پیدا ہوئے۔ وہ وکالت کا پیشہ اختیار کرنا چاہتے تھے' لیکن اس میں دل نہ لگا' اور سیاسیات میں داخل ہو گئے اور جمہوری (ری پبلکن) پارٹی کے نمائندے کی حیثیت سے نائب صدر چنے گئے۔ اتفاق دیکھئے کہ 6 ستمبر 1901ء کو

صدر میک کنلی گولی کا نشانہ بنے اور اسی دن تھیوڈور روز ویلٹ (26 ویں) صدر کے عہدے پر فائز ہو گئے۔ جب میعاد ختم ہوئی' تو انھیں دوبارہ اس عہدے کے لیے منتخب کیا گیا۔ ان کا عہد مختلف قسم کی اصلاحات کے لیے مشہور ہے۔ انھوں نے بڑے بڑے لکھ پتی اداروں اور افراد کی طاقت اور رسوخ کے انتظامیہ میں کم کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ بین الاقوامی معاملات میں وہ امن پسند تھے۔ چنانچہ 1906ء میں انھیں امن کا نوبل انعام دیا گیا۔ ان کی وجہ سے امریکا کا اقتدار اور عالمی مقام بہت بلند ہوا۔ مارچ 1909ء میں وہ صدارت سے سبکدوش ہوئے۔

کچھ وقفے کے بعد وہ دوبارہ سیاست میں داخل ہوئے۔ لیکن اب کے وہ ووڈرو ولسن کے مقابلے میں ہار گئے۔ پہلی جنگ عظیم میں امریکہ شامل نہیں ہوا تھا۔ روز ویلٹ شروع سے اس کے حق میں تھے۔ بالآخر امریکا 1917ء میں اتحادیوں کی طرف سے جنگ میں داخل ہو گیا۔ جنگ تو اتحادیوں نے جیت لی' لیکن دن رات کی محنت نے روز ویلٹ کی صحت تباہ کر دی تھی۔ ان کا 6 جنوری 1919ء کو انتقال ہوا۔ بلاشبہ وہ آج کے امریکا اور اس کی پالیسیوں کے بنانے والے تھے۔

حوالہ نمبر 26: ہمبرٹ اول' شاہ اطالیہ جو اپنے والد وکٹر عمانوئیل ثانی کی وفات پر جنوری 1878ء میں تخت نشین ہوا۔ 14 مارچ 1844ء کو ٹیورن (اطالیہ) کے مقام پر پیدا ہوا تھا۔ اس کی تعلیم بہت معمولی تھی اور اسے سپاہیانہ زندگی کے علاوہ اور کسی چیز سے قطعاً" کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ کہا جا سکتا ہے کہ اطالیہ میں ملوکیت کے خلاف جو جذبہ پیدا ہوا' اس نے اسی کے عہد میں طاقت پکڑی۔ 29 جولائی 1900ء کو ایک نراجی کے ہاتھوں قتل ہوا۔

حوالہ نمبر 27: واشنگٹن' جارج' ریاستہائے متحدہ امریکا کے پہلے صدر 22

فروری 1732ء (اس وقت 11 فروری تھا) کو پیدا ہوئے۔ شروع میں چندے فوج میں کام کیا۔ لیکن اس میں کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی۔ بالآخر وہ اس ملازمت سے مستعفی ہوگئے' اور اپنے زراعتی فارم پر کام کرنے لگے۔

یہ حالات بہت دن تک قائم نہ رہ سکے۔ 1776ء میں انگلستان کی حکومت سے اختلافات' جنگ' ریاستہائے متحدہ کی تشکیل ---- یہ سب تاریخ کے واقعات ہیں اور ان سب میں واشنگٹن نے جو کردار ادا کیا' وہ بھی کسی سے مخفی نہیں۔ بہرحال جب ملک آزاد ہوا' تو امریکی قوم نے ان کی خدمات کا اعتراف اس طرح کیا کہ انہیں اتفاق رائے سے اپنا پہلا صدر منتخب کیا۔ (1789-1792) پھر جب ان کی میعاد ختم ہوئی' تو وہ اتفاق رائے سے دوبارہ صدر بنا دیے گئے۔ (1792-1797) قوم انہیں اس عہدے پر تیسری مرتبہ بھی فائز کرنا چاہتی تھی' لیکن انہوں نے سختی سے انکار کر دیا۔ کثرت کار سے اب ان کی صحت بہت خراب ہو چکی تھی۔ 14 دسمبر 1799ء کو وفات پائی۔

حوالہ نمبر :28 بیورو کریسی Bureaucracy دفتر شاہی (لال فیتے کی حکومت)

حوالہ نمبر:29 نون وائیلنٹ Non violent بغیر تشدد کے' غیر جارحانہ

حوالہ نمبر :30 کواپریٹر Co-operator تعاون کرنے والا۔ نون کواپریٹر Non-Co-operator عدم تعاون کرنے والا۔

حوالہ نمبر:31 اسپرٹ Spirit روح' ولولہ' جوش و خروش

حوالہ نمبر:32 Positive سلبی' مثبت

حوالہ نمبر:33 Institution (s) ادارہ (ادارے)

حوالہ نمبر :14 Criminal Law Amendment Act ضابطہ فوجداری کا ترمیمی قانون

حوالہ نمبر:35 Defensive Civil Disobedience
اندامی سول نافرمانی۔

حوالہ نمبر:36 Discipline نظم و ضبط

حوالہ نمبر:37 Majority اکثریت' بڑی تعداد

حوالہ نمبر:38 Worker

حوالہ نمبر:39 Volunteer

حوالہ نمبر:40 حضرت مسیح کے الفاظ یہ ہیں:
اگر تم آدمیوں کے قصور معاف کرو گے' تو تمہارا آسمانی باپ بھی تم کو معاف کرے گا اور اگر تم آدمیوں کے قصور معاف نہ کرو گے تو تمہارا باپ بھی تمہارے قصور معاف نہ کرے گا (متی 6:14-15)
دوسری جگہ فرمایا:
تم سن چکے ہو کہ کہا گیا تھا کہ اپنے پڑوسی سے محبت رکھ اور اپنے دشمن سے عداوت۔ لیکن میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ اپنے دشمنوں سے محبت رکھو اور اپنے ستانے والوں کے لیے دعا کرو (متی' 5:43-44)
نیز لیکن میں تم سننے والوں سے کہتا ہوں کہ اپنے دشمنوں سے محبت رکھو۔ جو تم سے عداوت رکھیں' ان کا بھلا کرو' (لوقا 6:27' نیز 6:35)

حوالہ نمبر:41 Movement تحریک

8- آل انڈیا خلافت کانفرنس' کانپور

حوالہ نمبر:1 Reaction رد عمل' رد فعل

حوالہ نمبر:2 مذہب ہر ایک کا الگ ہوتا ہے' لیکن وطن سب کے لیے ہے۔

حوالہ نمبر:3 روسو: یان یاک روسو 18 جون 1712ء کو جینوا (سوئزرلینڈ) میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان معمولی استطاعت کا تھا' اسی لیے ان کی

تعلیم بھی پوری نہ ہو سکی۔ مدتوں وہ موسیقی سے دل بہلاتے رہے اور اس میں انہیں کچھ کامیابی بھی ہوئی۔ اس زمانے میں انہوں نے کچھ تصنیف و تالیف بھی کی۔ وہ محض اتفاق سے اخلاقیات اور علم و فن کے میدان میں داخل ہوئے۔ ایک دن انہوں نے اخبار میں پڑھا کہ اکاڈیمی نے اعلان کیا ہے کہ اس مضمون پر مقالہ لکھا جائے: کیا علم و فن کی ترقی نے ہمارے اخلاق کو تباہ کیا ہے' یا اس کی اصلاح کی ہے؟ روسو نے بھی مقالہ لکھا اور کہا کہ ان سے ہمارے اخلاق تباہ ہوئے ہیں۔ اس پر انہیں اول انعام ملا۔ اس کے بعد انہوں نے اخلاقیات' معاشیات' سیاسیات پر متواتر اور متعدد مقالے لکھے۔ ان کی تین کتابیں بہت مشہور ہوئیں: معاہدہ عمرانی اور اعترافات اور ناول یولی۔ انہوں نے 2 جولائی 1778ء کو رحلت کی۔ وہ اپنے زمانے کے بہترین مفکروں میں شمار ہوتے تھے اور آج وہ عالمی سطح پر صفحہ اول کے مفکر اور مصنف تسلیم کیے جاتے ہیں۔ انقلاب فرانس میں ان کی تحریروں کا بہت ہاتھ رہا۔

حوالہ نمبر 4: والٹیر: ان کا اصلی نام فرانسوا ماری اروئے تھا' والٹیر ان کا قلمی نام تھا۔ 21 نومبر 1694ء کو پیرس میں پیدا ہوئے۔ ان کی شروع میں تمنا تھی کہ ادب میں نام پیدا کریں۔ چنانچہ انہوں نے نظم و نثر میں لکھنا شروع کیا۔ اس میں نہ صرف اپنے والد کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا' بلکہ جن لوگوں کی انہوں نے ہجو لکھی' یا جن کا مذاق اڑایا' وہ بارسوخ اور طاقتور تھے اور اس کی سزا والٹیر کو بھگتنا پڑی۔ پوری زندگی لوگوں سے لڑتے بھڑتے گزری۔ اپنی تمام خامیوں کے باوجود' وہ نہ صرف فرانسیسی کے عظیم مصنف' ڈرامانگار اور ہجو نویس ہیں' بلکہ دنیا کے ادب العالیہ میں ان کا بہت بلند مقام ہے۔ ان کا انقلاب فرانس (1789ء) کے ہراول دستے میں شمار ہوتا ہے۔ 30 مئی 1778ء کو رحلت

کی۔

حوالہ نمبر 5: میرابو : پورا نام آنورے گیبری ایل رکوٹی میرابو تھا۔ 9 مارچ 1749ء کو پیدا ہوئے۔ امیر گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ وہ اتفاق سے ادب اور سیاست کی طرف آ گئے۔ ان کی تعلیم انھیں سپاہی بنانا چاہتی تھی اور شروع میں وہ فوج میں بھرتی بھی ہو گئے تھے۔ لیکن وہاں ان کے بعض اعمال ایسے تھے کہ ان کے اپنے خاندان سے تعلقات بگڑ گئے اور بالآخر انھیں قید خانے کا منہ دیکھنا پڑا۔ یہیں انھوں نے لکھنا شروع کیا اور اس میں بہت نام پیدا کیا۔ جب 1789ء میں فرانس کا مشہور انقلاب ہوا' تو وہ مفکر اور مصنف اور مشیر حکومت کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ انھوں نے جو کچھ بھی لکھا' اس میں بہت کم ان کے ذاتی خیالات ہیں' بیشتر دوسروں سے مستعار لیا ہے۔ لیکن اسے پیش کرنے اور اسے لوگوں میں مقبول کرنے کا سہرا ان کے سر ہے۔ بلاشبہ وہ انقلاب کے بہترین خطیبوں اور سویدوں میں تھے۔ 2 اپریل 1791ء کو انتقال ہوا۔

حوالہ نمبر 6: لافیت : 6 ستمبر 1757ء کو فرانس کے ایک امیر گھرانے میں پیدا ہوئے۔ کم عمری ہی میں فوج میں بھرتی ہو گئے۔ بمشکل 19 برس کے تھے کہ امریکا میں جنگ آزادی چھڑ گئی اور یہ اس میں شامل ہونے کو وہاں چلے گئے۔ واپسی پر پھر فرانسیسی فوج میں شامل ہو گئے۔ انقلاب فرانس میں انھوں نے بھرپور شرکت کی' بلکہ اس وقت وہ نیشنل اسمبلی کے نائب صدر تھے' اور حقوق کا محضر بھی انھوں نے امریکی محضر آزادی کے نمونے پر مرتب کر کے بادشاہ لوئی شانزدہم کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ انقلاب کے بعد جو جھنڈا منظور ہوا' اس کے رنگ اور شکل بھی انھی کی تجویز کردہ تھی۔

لیکن انقلاب کے بعد جو زیادتیاں ہوئیں' وہ اس سے محدود بادشاہی کی

بحالی کے حق میں ہوگئے۔ اس پر رفیقوں نے ان پر غداری کا الزام عاید کر دیا' اور انھیں راہ فرار اختیار کرنا پڑی۔ آخر گرفتار ہوئے اور پانچ سال قید و بند میں رہے۔ آزاد ہوئے تو پھر سیاست میں حصہ لینے لگے۔ اب وہ نپولین کے زیادہ اختیارات کے خلاف ہوگئے۔ لیکن حالات کی گرما گرمی میں ان کی کون سنتا تھا۔ اس لیے کم و بیش عزلت گزیں ہوگئے۔

وہ ہمیشہ عوام کے حقوق اور آزادی کے اور حکومت کے نرم رویے کے حامی اور علمبردار رہے۔ 20 مئی 1834ء کو پیرس میں راہی ملک بقا ہوئے۔

حوالہ نمبر:7 وکٹر ہیوگو۔ دیکھیے اسی کتاب میں خطبہ 7' حاشیہ 8

حوالہ نمبر 8: محمد بن عبدالکریم۔ مشہور ریف (مراکش) لیڈر' جنھوں نے برسوں فرانس اور اسپین کے خلاف جنگ جاری رکھی اور دونوں حکومتوں کا ناطقہ بند کر دیا۔ ایک جھڑپ کے دوران میں عبدالکریم گرفتار ہوگئے اور حکومت نے انھیں جنوبی فرانس کے ایک شہر میں نظر بند کر دیا۔ بعد کو حکومت فرانس نے فیصلہ کیا کہ ان کا فرانس میں رہنا ٹھیک نہیں ہے۔ چنانچہ انھیں جزیرہ ماریشس منتقل کرنے کے لیے جہاز پر سوار کر دیا گیا۔ جب جہاز نہر سویز میں سے گزر رہا تھا' یہ عرشہ جہاز پر سے نہر میں کود گئے اور تیر کر مصر کی سرزمین میں داخل ہوگئے۔ حکومت مصر نے' فرانس کے سارے دباؤ کے باوجود' انھیں حوالے کرنے سے انکار کر دیا اور انھیں اپنے ہاں پناہ دے دی' ان کا وظیفہ مقرر کردیا۔ اس کے بعد وہ اطمینان سے قاہرہ میں رہے۔ وہیں انتقال کیا۔ مراکش کو بالآخر جرنیل ڈی گول نے آزاد کیا' حال آنکہ ان کے مشیر اس کے سخت خلاف تھے۔

حوالہ نمبر 9: دروزی' چھٹے فاطمی خلیفہ' مصر الحاکم بامراللہ (994-1021)

1021ء میں یکایک غائب ہو گئے۔ آج تک پتا نہیں چلا کہ وہ کیا ہوئے۔ بہرحال انھوں نے یہ عجیب دعویٰ کیا تھا کہ مجسم عقل ہونے کے باعث میں فوق الانسان شخصیت کا مالک ہوں۔ اپنے اس دعوے کو تسلیم کرانے کے لیے انھوں نے مختلف اطراف میں داعی بھیجے۔ انھیں میں ایک شخص اسمٰعیل الدرزی تھے' جنھوں نے شام میں تبلیغ کی۔ جن لوگوں نے اس نئی دعوت پر لبیک کہا' وہ دروزی کہلائے۔ لیکن دروزی خود اپنے آپ کو موحدین کہتے ہیں۔ البتہ یہ واقع ہے کہ ان کے معتقدات اسلام اور عیسائیت کی بعض خصوصیات کو یکجا کرکے مرتب کر لیے گئے ہیں۔

دروزیوں کی اکثریت شام کے پہاڑی علاقے حوران میں آباد ہے' اسی لیے ان پہاڑیوں کا نام ہی جبل الدروز پڑ گیا ہے۔ لبنان میں بھی اس فرقے کی خاصی تعداد ہے۔ کچھ لوگ امریکا میں جا بسے ہیں۔ بہرحال مجموعی طور پر یہ جماعت غالباً ڈیڑھ دو لاکھ سے زیادہ نہیں ہوگی۔

یہاں جس واقعے کی طرف اشارہ ہے' یہ پہلی جنگ عظیم (1914-1918) کے بعد کا ہے۔ ورسائی کے صلح نامے کی رو سے شام اور لبنان فرانسیسی انتداب قرار دیے گئے تھے۔ 1924ء میں دروزیوں نے بغاوت کر دی۔ اس پر فرانسیسی فوج نے سخت حملہ کیا اور دمشق اور جبل دروز کی دروزی آبادی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ اگرچہ انھیں فرانسیسی فوجوں نے شکست دے دی کیونکہ مٹھی بھر غیر تربیت یافتہ گروہ کا بھلا ایک جدید متمدن ملک کی منظم' کیل کانٹے سے لیس فوج سے کیا مقابلہ' لیکن دروزیوں نے میدان جنگ میں جس بہادری اور شجاعت کا مظاہرہ کیا تھا' اس سے حکومت فرانس کو معلوم ہو گیا کہ اگر دروزیوں کے مطالبات منظور نہ کیے گئے' تو یہ لوگ چین سے نہیں بیٹھنے دیں گے۔ چنانچہ دروزیوں کو زیادہ حقوق دیے گئے اور ان سے

دوستانہ تعلقات قائم ہوئے۔

حوالہ نمبر10: ریکارڈ Record

حوالہ نمبر11: نائٹ Night رات' شب

نائٹ اسکول' مدرسہ شبینہ۔ وہ مدرسہ جس میں شب کے وقت پڑھائی ہوتی ہے' تاکہ جو لوگ دن بھر اپنے کام کاج میں لگے رہتے ہیں' وہ رات کے وقت تعلیم حاصل کر سکیں۔

حوالہ نمبر 12: سورہ آل عمران' 8:3 (اے ہمارے رب! اب ہمارے دلوں کو دوسری طرف نہ پھیر' بعد اس کے کہ تو نے ہمیں ہدایت کی راہ دکھلا دی اور ہمیں اپنی جناب سے رحمت عطا کر)

9- جمعیت تبلیغ اہل حدیث' کلکتہ

حوالہ نمبر 1: محمد حسن 1249ھ (1833-1834ء) میں امروہہ میں پیدا ہوئے۔ علوم عقلیہ و نقلیہ اساتذہ وقت سے حاصل کیے۔ مولانا فضل حق خیر آبادی اور مفتی صدر الدین آزردہ ان کے استادوں میں ہیں۔ طب کی تعلیم حکیم امام الدین سے حاصل کی۔

تکمیل تعلیم کے بعد اولاً چندے آگرے میں حکومت کی ملازمت کی۔ پھر میو کالج' اجمیر میں عربی اور فارسی پڑھانے میں مقرر ہو گئے۔ لیکن یہاں پرنسپل سے نبھ نہ سکی اور مستعفی ہو کر بطور طبیب مہاراجا لووے پور کے پاس چلے آئے۔ وہاں سے نکلے تو اجمیر میں سکونت اختیار کر لی اور مطب کرنے لگے۔ یہاں وہ 29 برس مقیم رہے تھے۔

ان کا عیسائیت کا مطالعہ بہت گہرا تھا' خاص طور پر کتب سماویہ سے حضرت رسول اسلام صلعم سے متعلق ان کتابوں میں سے پیشگوئیاں دریافت کرنے کا بہت شوق تھا۔ چنانچہ اس پہلو سے تورات اور انجیل کا مطالعہ کر کے متعلقہ آیات جمع کی تھیں۔ قرآن کی تفسیر بھی قلمبند کی

تھی' جو زبان کے اشکال کے باعث مقبول نہ ہو سکی۔

وہ مباحثہ یا مناظرہ نہیں کرتے تھے۔ اگر کوئی سوال لے کر آجاتا تو اسے سمجھا دیتے۔ 74 سال کی عمر میں 19 رمضان 1323ھ (17 نومبر 1905ء) کو رحلت کی (فرنگیوں کا جال: 285)

حوالہ نمبر 2: ڈاکٹر وزیر خان: عظیم آباد پٹنہ کے خاندان افاغنہ کے چشم و چراغ تھے۔ 1832ء میں طب کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کو انگلستان گئے۔ واپسی پر حکومت نے انہیں آگرے میں اسسٹنٹ سرجن مقرر کر دیا۔

دوران قیام انگلستان میں انہوں نے طب کے علاوہ یونانی سیکھی اور عیسائیت کا بھی وسیع مطالعہ کیا۔ چنانچہ ہندوستان آئے' تو اپنے ساتھ بہت سا لٹریچر رد عیسائیت کا بھی لیتے آئے۔ ان دنوں پادری فنڈر صاحب آگرے میں مقیم تھے' اور رد اسلام میں تحلے اور نسخے بہت سرگرم تھے۔ ڈاکٹر وزیر خان آگرے پہنچے' تو انہوں نے ان کا جواب دینا شروع کیا۔ پادری صاحب کا جو مناظرہ 1854ء میں مولوی رحمت اللہ کیرانوی سے ہوا تھا' اس میں ڈاکٹر وزیر خان نے بھی نمایاں حصہ لیا تھا۔ اور مولوی صاحب کی ہر طرح مدد کی' تھی۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ سرگرمیاں حکومت کی نظر میں قابل عتاب ٹھہریں' چنانچہ 1857ء کے ہنگامے میں انہیں بھی باغی قرار دے دیا۔ گرفتاری کا وارنٹ جاری ہوگیا تھا' مگر پیشگی اطلاع مل جانے پر یہ چھپتے چھپاتے دلی چلے آئے اور بہادر شاہ ظفر کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان دنوں یہاں جرنیل بخت خان کرتا دھرتا تھے۔ انہوں نے ڈاکٹر صاحب کو بہادر شاہ ظفر کی منظوری سے اودھ کا صوبیدار مقرر کرا دیا۔ اس تحریک کا جو حشر ہوا' وہ سب کے علم میں ہے۔ شاہی فوجوں کو شکست ہوئی' اور دلی پر انگریزوں کا دوبارہ قبضہ ہوگیا۔

اس کے بعد ڈاکٹر وزیر خان نے راہ فرار اختیار کی اور ایران کے رستے حجاز چلے گئے۔ زندگی کے آخری ایام مکے میں گزرے۔ بالآخر مدینے میں فلت پائی اور جنت البقیع میں دفن ہوئے۔ (فرنگیوں کا جال : 246-243)

حوالہ نمبر 3: فنڈر : ان کا پورا نام کارل گوٹلیب فنڈر تھا۔ وہ 1803ء میں جرمنی کے شہر ویلنگن میں پیدا ہوئے۔ شروع سے انہیں مشنری بننے کا شوق تھا۔ چنانچہ انہوں نے کئی مشرقی زبانوں میں مہارت پیدا کرلی۔ مثلاً ترکی' تاتاری' ارمنی' فارسی وغیرہ 1829ء میں انہوں نے اسلام کے خلاف اپنی کتاب "میزان الحق" جرمن میں لکھی۔ اس کا کئی زبانوں میں ترجمہ ہوا۔ وہ عرصے تک شرق اوسط اور ایران میں عیسائیت کی تبلیغ کرنے کے بعد پہلی مرتبہ 1837ء میں ہندوستان آئے۔ دو تین برس کلکتے میں گزار کر انہوں نے آگرہ کو اپنا مرکز بنایا۔ انہیں ایام میں انہوں نے اردو سیکھی اور اپنی کتاب "میزان الحق" پر نظرثانی کر کے اسے مکمل کیا اور اسے اردو میں بھی منتقل کرایا۔ یہاں آگرے اور اس کے گردونواح میں بہت سرگرم رہے۔ عیسائیت کی تائید میں کتابیں تقسیم کرتے اور وعظ بھی کرتے۔

"میزان الحق" کا پہلا جواب "استفسار" کے عنوان سے مولوی آل حسن نے لکھا تھا۔ فنڈر کی ایک اور کتاب مفتاح الاسرار تھی' اس کا جواب ایک لکھنؤی عالم نے کشف الاستار کے نام سے دیا تھا' اور فنڈر نے جواب الجواب میں وحل الاشکال تصنیف کی۔ اس آخری کتاب کا جواب مولوی موید الدین احمد آبادی نے دیا تھا۔

فنڈر صاحب کا مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی سے مشہور مناظرہ 1854ء میں آگرے میں ہوا تھا' جو کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے۔

1858ء میں فنڈر قسطنطنیہ گئے۔ لیکن ترکی حکومت نے ان کی خلاف

اسلام سرگرمیوں کی بنا پر ان کے اخراج کا حکم صادر کر دیا۔ اس پر وہ بیوی بچوں کے ساتھ انگلستان چلے گئے' جہاں ان کا یکم دسمبر 1865ء کو انتقال ہوا۔ (ایضاً: 97:95)

حوالہ نمبر4: روسو: دیکھئے خطبہ 8 حاشیہ 3

حوالہ نمبر 5: کارل مارکس: پورا نام کارل ہنرخ مارکس تھا۔ 5 مئی 1818ء جرمنی کے ایک یہودی خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کی عمر چھ برس کی ہوگی۔ جب ان کے والد نے عیسائی مذہب اختیار کرلیا۔ تعلیم کے دوران میں وہ مشہور فلسفی ہیگل سے بہت متاثر رہے۔ بہرحال تکمیل کے بعد انہوں نے صحافت کا پیشہ اختیار کیا اور اپنا اخبار جاری کردیا۔ لیکن حکومت ان کے ترقی پسند رجحانات برداشت نہ کرسکی اور پرچہ ضبط ہوگیا۔ اس پر وہ ہجرت کرکے پیرس چلے گئے اور یہاں کے اشتراکی مصنفوں کے حلقے میں بار پا گئے۔ اسی زمانے میں ان کی انگلز سے ملاقات ہوئی' جس نے عمر بھر کی دوستی کی شکل اختیار کرلی۔
ان کا تاریخ اور اشتراکیت کا خاص نظریہ تھا اور انہوں نے اپنی متعدد تحریروں میں اس کی وضاحت کی ہے۔ اشتراکیت کی اساسی کتاب "سرمایہ" انہیں کی تصنیف ہے۔ اس کا پہلا حصہ 1867ء میں شائع ہوا۔ اور باقی دو حصے ان کی وفات کے بعد 1885ء اور 1894ء میں۔ اس کا دنیا کی بیشتر زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ ان کا 14 مارچ 1883ء کو انگلستان میں انتقال ہوا' ہائی گیٹ کے قبرستان میں مدفون ہیں۔

12- عربی نصاب کمیٹی' لکھنؤ

حوالہ نمبر 1: شیخ (محمد) عبدہ۔ مشہور مصری مذہبی اور سیاسی رہنما۔ حالات کے لیے دیکھئے' غبار خاطر: 315

حوالہ نمبر 2: جمال الدین (افغانی) پان اسلام کے زبردست حامی۔ حالات

کے لیے دیکھئے غبار خاطر 315

حوالہ نمبر 3: محمد رشید رضا' شیخ محمد عبدہ کے شاگرد رشید۔ استاد کی جلا وطنی کے بعد ان کے کام کو مصر میں جاری رکھا' اور اس کے لیے مشہور عربی ماہنامہ "المنار" قاہرہ سے جاری کیا۔ انہوں نے اس میں قرآن کی تفسیر بھی بالاقساط چھاپنا شروع کی تھی' جو اب الگ کتابی شکل میں "تفسیر المنار" کے نام سے ملتی ہے۔ 1912ء میں ندوۃ العلماء کے سالانہ اجلاس کی صدارت کے لیے ہندوستان بھی آئے تھے۔ 1936ء میں 71 سال کی عمر میں قاہرہ میں رحلت کی۔

حوالہ نمبر 4: ابوالفضل : حالات کے لیے دیکھئے' غبار خاطر (حواشی) 297 (ساہیہ اکاڈمی ایڈیشن) اور تذکرہ (حواشی) 362-363 (ساہیہ اکاڈمی ایڈیشن)

حوالہ نمبر 5: فیضی : حالات کے لیے دیکھئے : غبار خاطر (حواشی) : 339 (ساہیہ اکاڈمی ایڈیشن) اور تذکرہ (حواشی) 363-364 (ساہیہ اکاڈمی ایڈیشن)

حوالہ نمبر 6: نظام الملک طوسی۔ عہد سلجوقی کے شہرہ آفاق وزیر۔ ان کی کتاب "سیاست نامہ" اپنے فن کی بلند پایہ کلاسیکی تصنیف ہے۔ بغداد کا مشہور مدرسہ نظامیہ انہی نے قائم کیا تھا۔ عمر خیام کی مدد سے انہوں نے رصدگاہ بنائی اور ایرانی تقویم کی اصلاح کی۔ 1092ء میں حسن بن صباح کے ایک پیرو (اسماعیلی) کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ اصفہان میں مدفون ہے۔

حوالہ نمبر 7: اکبر : محمد جلال لدین اکبر شاہ' خاندان مغلیہ کا گل سرسبد۔ ولادت : امرکوٹ' 5 رجب 949ھ-15(25) اکتوبر 1542ء' وفات آگرہ 13 جمادی الثانی 1014ھ — 16 (26) اکتوبر 1605ء سکندرہ میں مدفون ہیں۔

حوالہ نمبر:8 شیر شاہ۔ حالات کے لیے دیکھیے: تذکرہ (حواشی) : 36-361

حوالہ نمبر:9 ٹوڈرمل۔ اصلاً کھتری خاندان کے فرد تھے۔ شیر شاہ سوری کے عہد میں محکمہ مال میں ملازم ہوئے۔ لیکن ان کا اصلی عروج اکبر کے زمانے میں ہوا۔ جب یہ اسکے نو رتنوں میں شامل ہوئے اور ملک کی آبادی کا کام اور کار پردازوں کے عزل و نصب کا اختیار انھیں حاصل ہوا۔ اسی عہد میں کچھ مدت کے لیے بنگال کے گورنر بھی رہے۔ 11 محرم 998ھ (12 دسمبر 1586ء) کو لاہور میں انتقال ہوا۔ (مفتاح التواریخ: 194)

حوالہ نمبر 10: فتح اللہ شیرازی' حالات کے لیے دیکھیے: تذکرہ (حواشی) 469-468 (ساہیہ اکاڈمی ایڈیشن)

13- بین ایشیائی کانفرنس' نئی دلی

حوالہ نمبر:1 آرگنائزیشن Organisation ادارہ' تنظیم

حوالہ نمبر:2 اسٹینڈنگ کمیٹی Standing Committee مستقل کمیٹی

حوالہ نمبر:3 انسٹی ٹیوٹ Institute ادارہ۔

14- مسلمانانِ دلی کا اجتماع' دلی

حوالہ نمبر 1: اس سے مسلم لیگ کے دو قومی نظریے اور مائل آزادی ملک کے پراپیگنڈے کی طرف اشارہ مقصود ہے۔

حوالہ نمبر 2: آیت ہے ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا فلا خوف علیھم ولا ھم یحزنون۔ (احقاف 13:46)

حوالہ نمبر 3: آل عمران' 139:3 (نہ سست ہو اور نہ ملول ہو اور (یاد رکھو) تم ہی غالب رہو گے' اگر تم ماننے والے ہو)

15- مہاتما گاندھی کی یادگار

حوالہ نمبر 1: یعنی تاکہ تم آپس میں پہچانے جاؤ۔ اس سے اشارہ مقصود ہے' آیت قرآنی کی طرف وجعلنا کم شعوبا وقبائل لتعارفوا (الحجرات' 13:49) اور ہم نے تمہارے گروہ اور قبیلے اس لیے بنائے تھے' تاکہ تمہاری آپس میں پہچان ہو۔

کتب ورسائل

ماخذ و حواشی

کتب و رسائل

ماخذ حواشی

(الف) اردو

انجیل مقدس (بشمول عہد نامہ جدید) (انگلستان 1958ء)

تذکرہ: ابوالکلام آزاد (مرتبہ مالک رام) (ساہتیہ اکاڈمی، دلی 1968ء)

تذکرہ مشائخ دیوبند: مفتی عزیز الرحمن (بجنور 1967ء)

حیات جاوید: حالی (علی گڑھ 1922ء)

حیات مالک: سید سلیمان ندوی (اعظم گڑھ 1940ء)

ذکر آزاد: عبدالرزاق ملیح آبادی (کلکتہ 1960ء)

سفرنامہ اسیر مالٹا: حسین احمد مدنی (دیوبند طبع اول)

عہد نبوی میں نظام حکمرانی: محمد حمیداللہ (حیدر آباد بار دوم)

فرنگیوں کا جال: امداد صابری (دلی 1949ء)

مفتی اعظم کی یاد: حفیظ الرحمن واصف (دلی 1386ھ)

یادرفتگاں: سید سلیمان ندوی (کراچی 1955ء)

(ب) فارسی

دیوان کامل خواجہ حافظ شیرازی: حافظ (تہران 1339 شمسی)

دیوان نظیری: مرتبہ مظاہر مصفا (تہران 1340 شمسی)

کلیات سعدی: مرتبہ مظاہر مصفا (تہران 1340 شمسی)

(ج) عربی

الاکمال فی اسماء الرجال: ابن ماکولہ (حیدر آباد 1381ھ)

البیان و التبیین: جاحظ (مرتبہ عبدالسلام محمد ہارون) (قاہرہ 1948 بعد)

تذکرۃ الحفاظ: شمس الدین الذہبی (حیدر آباد 1375ھ)

جامع ترمذی: مرتبہ احمد محمد شاکر (قاہرہ 1937ء)

حلیۃ الاولیا و طبقات الاصفیا: ابو نعیم الاصبہانی (قاہرہ 1351ھ)

دیوان ابی تمام: طبع محی الدین الخیاط (بیروت 1889ء)

دیوان خنساء: طبعہ لوئیس شیخو (بیروت 1896ء)

زہر الآداب: حصری (تحقیق محمد البجاوی) (قاہرہ 1953ء)

سنن ابن ماجہ (قاہرہ 1953)

سنن ابی داؤد: تصحیح حافظ محمد ابراہیم (نو لکشور 1293ھ)

سنن نسائی (دلی 1256ھ)

سیرۃ النبویہ: ابن ہشام (قاہرہ 1355ھ بعد)

شروح سقط الزند: ابوالعلاء المعری (قاہرہ 1946ء بعد)

صحیح بخاری (مطابع الشعب' قاہرہ 1378ھ)

صحیح مسلم (قاہرہ 1379ھ)

طبقات الکبیر: ابن سعد (بیروت 1957ء)

العقد الفرید: ابن عبدربہ (مرتبہ سعید العریان) (قاہرہ 1948ء)
القرآن
کتاب الامالی: شریف المرتضی الموسوی (قاہرہ 1954ء)
(تحقیق محمد ابی الفضل ابراہیم)
محاضرۃ الابرار و مسامرۃ الاخیار (قاہرہ 1906ء)
المستدرک: حاکم نیشاپوری (حیدر آباد 1341ھ)
(دائرۃ المعارف' حیدر آباد)
المسند: احمد بن حنبل (قاہرہ 1947ء بعد)
المسند: داری (کان پور 1293ھ)
المستطرف: الشیخی (قاہرہ 1354ء)
موطا: امام مالک مرتبہ عبدالوحید خان (کراچی 1954ء)
نفح الطیب: المقری (قاہرہ 1302ھ)
وفیات الاعیان: ابن خلکان (قاہرہ 1948ء بعد)
مرتبہ محی الدین عبدالحمید

انگریزی کتب (Bibliography of English Books)

بیشتر مغربی اور مشرقی مشاہیر کے تراجم مندرجہ ذیل کتابوں سے اخذ کیے گئے ہیں اگرچہ اختصار کی خاطر ہر جگہ حوالہ نہیں دیا گیا:

Encyclopedia Islam (both Editions)

انسائیکلو پیڈیا اسلام (دونوں ایڈیشن)

Encyclopedia Americana, 37th Edition, 1968

انسائیکلوپیڈیا امریکانا (37 واں ایڈیشن 1968ء)

Encyclopedia Britanica, 30th Edition, 1962

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (تیسواں ایڈیشن 1962ء)

Chamber's Encyclopedia, 1959

چیمبرز انسائیکلوپیڈیا (1959ء)

Classical Dictionary, Edited by F. Right, London, 1949

کلاسیکل ڈکشنری: ج' لال پری ایر: مرتبہ ف' رائٹ (لندن) 1949ء

History of Congress, Sita Ramia, New Delhi, 1969

ہسٹری آف کانگریس' پٹابی سیتا رامیا (نئی دلی 1969ء)